بہنوں کا اپنا ماہنامہ
شعاع
جنوری 2020

رخسانہ نگار عدنان

شام کی چوڑیاں

کشف اپنے پرانے طرز کے گھر سے شدید بے زار ہے اور وہ اپنی آنی سے ہزار بار کہہ چکی ہے کہ وہ اس گھر سے جان چھڑا لیں لیکن وہ ہر بار اس کی بات ہنس کر ٹال دیتی ہیں۔ کشف گلیوں سے گزرتے خوانچا فروشوں سے بھی سخت بے زار رہتی ہے اور انہیں حسب توفیق بد دعاؤں سے نوازتی رہتی ہے۔

طاہرہ بیگم کا اپنے گھر پر کافی ہولڈ ہے۔ ان کی بہو سونیا اور بیٹا آزر دونوں ہی ان کے فرماں بردار ہیں۔ وہ چاہتی ہیں کہ ان کی پوتی کا رشتہ ان کی مرضی سے طے ہو۔

جبکہ ردا اپنے آفس میں کام کرنے والے جبران سے محبت کرتی ہے اور اسے کہتی ہے کہ وہ اس کا رشتہ لے کر آئے۔

دوسری جانب کشف کا پڑوسی اسے چھیڑتا ہے اور وہ اس کے پاؤں پر اینٹ دے مارتی ہے۔ بعد میں اسی لڑکے کی ماں سے بھی خوب جھگڑا کرتی ہے۔

زینب شاعری کرتی ہے اور ساتھ ہی ایک اسکول میں بھی پڑھاتی ہے وہ اپنا مسودہ حیدر کے پاس لے کر جاتی ہے تاکہ وہ سرفراز سے بات کر کے اسے چھپوا سکیں۔

آفس سے واپسی پر اس کی طبیعت خراب ہو جاتی ہے اور وہیں تیز برستی بارش میں اس کا ایکسیڈنٹ ہو جاتا ہے۔

آڈیٹوریم لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہے جہاں ڈاکٹر موحد تین بڑی بیماریوں کو کنٹرول کرنے کے حوالے سے لیکچر

دے رہے ہیں۔ اور ہال میں تمام لوگ ساکت ہو کر سن رہے ہیں۔

کشف، ناہید کو دیکھ کر اس سے بے اختیار لپٹ جاتی ہے۔ ناہید کو زینب کی فکر ستاتی ہے اور وہ بارش سے بھی خوف زدہ ہیں۔ کشف انہیں کہتی ہے کہ زینب فون نہیں اٹھا رہی۔ ناہید اس سے بتول خالہ سے کیے گئے جھگڑے کے بارے میں پوچھتی ہیں اور اسے سمجھاتی ہیں۔

میر و خزاں کے موسم میں اپنی گاڑی میں موجود ہے اور کسی کی یاد ہے جو اسے گھیرے ہوئی ہے۔ وہ اس سے کہتی ہے کہ وہ اس سے اگر کبھی ناراض ہوئی تو میر و اسے منا لے۔ وہ ان سوچوں میں الجھا چلتا چلا جاتا ہے۔

موحد راستے میں رش دیکھ کر اترتا ہے اور سامنے بے ہوش پڑی زینب کو دیکھ کر اسے ہاسپٹل لے جاتا ہے۔

آذر کو ایک فون کال آتی ہے اور وہ عجلت میں آفس سے باہر نکلتا ہے۔ زینب کے بارے میں کوئی بھی معلومات نہ پا کر کشف شدید پریشان ہو جاتی ہے۔ سہیل اپنے طور پر پتا کروا لیتا ہے اور اسکول بھی چکر لگا آتا ہے۔ لیکن وہ وہاں بھی موجود نہیں ہوتی۔ وہ حیدر کو فون کرتی ہے وہ بھی پریشان ہو جاتا ہے۔ کچھ دیر بعد اس کے فون پر موحد کی کال آتی ہے۔ اور وہ اسے زینب کے بارے میں بتاتا ہے۔

دوسری طرف زینب کو ہوش آتا ہے اور موحد اسے جانا پہچانا لگتا ہے۔ وہ اس کا شکریہ ادا کرتی ہے اور گھر جانے کا کہتی ہے۔ اور موحد سے اس کے باپ کا نام بھی پوچھ لیتی ہے۔ موحد اسے اس کے گھر چھوڑ کر آتا ہے۔ جہاں کشف کے ساتھ بلال بھی موجود ہوتا ہے۔ باتوں کے دوران بتول خالہ آجاتی ہیں اور ماں بیٹی کے کردار پر الزام تراشیاں کرتی بکتی جھکتی بلال کے ڈرانے پر گھر سے نکل جاتی ہیں۔

آذر، ردا کو لے کر گھر پہنچتا ہے جہاں پورا گھر ردا کی غیر حاضری کے باعث پریشان ہے۔ ردا اپنے کمرے میں جاتی ہے جہاں رمشا اس سے بات کرنے کی کوشش کرتی ہے لیکن وہ اسے ڈانٹ کر بھگا دیتی ہے۔ سونیا اس کے کمرے میں آتی ہیں اور اس سے پوچھتی ہے کہ کیا ہوا ہے اور کمرے کا دروازہ بند کر دیتی ہے۔ ردا حیران رہ جاتی ہے۔

میر و دیوار میں کیل ٹھونک رہا ہوتا ہے جب وہ عورت چیختے ہوئے آتی ہے اور اس سے جھگڑتی ہے۔ اس حسین عورت کی طرف میر و شرمندگی سے دیکھتا اس کی بدزبانی سنتا ہے۔ تبھی ان کی بیٹی آتی ہے اور اس کا سرخ لباس دیکھ کر وہ عورت پھر سے چیخنا چلانا اور آخر میں رونا شروع کر دیتی ہے۔

وہ نوجوان لڑکی ماں کی اس حالت سے شدید الرجک ہے اور کہتی ہے کہ اسے پاگل خانے بھیج دیا جائے۔ جبکہ وہ عورت چلاتے چلاتے میر و کے گریبان میں چہرہ چھپا لیتی ہے اور اس سے کہتی ہے کہ وہ اس سے دور نہ جائے۔

دادی، شائستہ کو فون کر کے کہتی ہیں کہ آذر اور سونیا کو اس رشتے پر اعتراض نہیں۔ وہ بیس دن بعد نکاح رخصتی کی تاریخ رکھ لیتی ہیں جبکہ دروازے میں کھڑا آذر یہ سن کر ساکت رہ جاتا ہے۔

آذر اپنی ماں سے کہتا ہے کہ انہیں رشتہ طے کرنے سے پہلے کم از کم ردا کی مرضی ضرور معلوم کرنی چاہیے۔ لیکن وہ بات کو یوں گھماتی ہیں کہ آذر چپ رہ جاتا ہے۔

کشف آنی سے اپنے باپ کے بارے میں پوچھتی ہے۔ وہ اسے ساری تفصیل بتاتی ہے۔ میر منصور باہر گیا اور وہاں جا کر دوسری شادی کر لی۔ کشف ضدی لہجے میں کہتی ہے کہ وہ ان سے ضرور ملے گی۔

سونیا، ردا سے پوچھتی ہے کہ برسات میں کیا ہوا تھا۔ وہ کہتی ہے کہ کچھ نہیں ہوا۔ پھر وہ اسے بتاتی ہے کہ وہ کسی اور کو پسند کرتی ہے اور جبران سے ہی شادی کرے گی۔ سونیا اسے زوردار تھپڑ مارتی ہے۔ سونیا، آذر کو ڈھکے چھپے لفظوں میں بتاتی ہے کہ اس کی بیٹی شادی کے لیے راضی نہیں۔

حیدر، زینب سے ملتا ہے تو وہ اسے کشف کے رویے کے بارے میں بتاتی ہے۔

کشف خیالوں میں گم بس میں بیٹھی رہ جاتی ہے۔ اڈے پر پہنچ کر وہ چونکتی ہے اور گھبرا کر رہائشی علاقے کی طرف آجاتی ہے۔ جہاں حمزہ اسے سونیا کے گھر ڈراپ کر دیتا ہے۔ کشف کی موجودگی سے آذر بے سکون ہوتا ہے۔

میر منصور، ایما کو سمجھانے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ بدتمیزی کرتی ہے جواباً وہ اسے تھپڑ مار دیتا ہے۔ ایما پولیس بلا لیتی

ہے۔گھر پر اس کی ماں ایک پر تکلف ڈنر تیار کر کے اس کا انتظار کرتی ہے۔ایما ماں کو خوشی خوشی بتاتی ہے کہ اس نے باپ کو پولیس کے حوالے کر دیا ہے۔

کشف سونیا سے بھی اپنے باپ کے بارے میں پوچھتی ہے اور اس کے سامنے اس عزم کا اظہار کرتی ہے کہ وہ ضرور امریکہ جائے گی۔

زینب، بتول خالہ سے معافی مانگنے جاتی ہے جہاں وہ اسے کشف کی شادی کا مشورہ دیتی ہیں۔

ڈاکٹر موحد گاؤں میں ہونے والی ایک فوتگی پر جاتے ہیں اور وہاں نہ صرف جنازے میں شریک ہوتے ہیں بلکہ قبر کھودنے میں بھی مدد کرتے ہیں جس پر گاؤں کے لوگ حیران رہ جاتے ہیں۔

سونیا زینب کو فون پر کشف کی وجہ سے بہت سناتی ہیں۔زینب کشف سے اس بارے میں پوچھتی ہے تو وہ کہتی ہے کہ ہاں وہ سونیا کے پاس اپنے باپ کی معلومات لینے گئی تھی۔اسے سونیا کا عجیب رویہ یاد آتا ہے۔

آزر جبران سے ملتا ہے اور اسے بے عزت کرتا ہے، روا غصے سے باہر نکل جاتی ہے۔

کشف کچن میں روا کو دیکھ کر ایک کپ کافی کا کہتی ہے۔باتوں باتوں میں وہ روا سے کہتی ہے کہ وہ اس شادی سے خوش نہیں کیا وہ کسی اور کو پسند کرتی ہے۔روا یہ سن کر چراغ پا ہو جاتی ہے۔سونیا روا کو آ کر تھپڑ مارتی ہے۔اور کہتی ہے کہ اس کی ماں کی وجہ سے آج تم اس گھر میں ہو اور آج ہماری عزت رہ گئی ہے۔

ہاسپٹل سے میر منصور زینب کا ہاتھ پکڑ کر باہر لاتا ہے اور اسے زینی کے نام سے بلاتا ہے۔زینب کہتی ہے کہ اس کا نام زینی نہیں زینب ہے۔وہ کہتا ہے کہ تم جس سے محبت کرتی ہو وہ میں تھا یا کوئی اس کی خاطر میری بات سن لو۔زینب کہتی ہے کہ اس کی زندگی میں کوئی اور کبھی نہیں تھا۔میر منصور اس بات پر یقین نہیں کرتا۔موحد کے پہنچنے پر زرین بہت خوش ہوتی ہے۔زرین کو برے حالوں میں دیکھ کر موحد کو محسوس ہوتا ہے کہ یہ ایما کی وجہ سے اس حال میں ہیں، میں ان کا کچھ نہیں۔

میر منصور کی یہ بات سن کر زینب حیران رہ جاتی ہے کہ زینب نے بے وفائی میں پہل کر کے شادی کر لی۔دونوں ایک دوسرے کو مورد الزام ٹھہراتے ہیں۔منصور یہ سن کر پریشان ہو جاتا ہے کہ تیس سال سے اکیلی رو رہی ہے۔

کشف زینب سے فون پر کہتی ہے کہ وہ اپنے گھر جانا چاہتی ہے زینب منع کر دیتی ہے۔

کشف کی آنکھ ایک ڈراؤنے خواب سے کھلتی ہے۔وہ ہلکی سی چیخ مار کر اٹھتی ہے ٹائم دیکھتی ہے۔ابھی تو بارہ بھی نہیں بجے تھے۔پانی پی کر وہ خالی گلاس لے کر باہر جاتی ہے۔کچن میں اندھیرا ہوتا ہے۔وہ ڈسپنسر سے پانی لینے آگے بڑھتی ہے۔کہ اس کے ہاتھ سے گلاس گر کر ٹوٹ جاتا ہے۔کسی نے اس کو بری طرح اپنے بازوؤں میں لے کر جکڑا ہوا تھا۔اس نے چیخنا چاہا تو کسی نے اس کے منہ کو پوری قوت سے بھینچ دیا۔

کشف پر حملہ کرنے والا کوئی اور نہیں آزر تھا۔سونیا آزر سے پوچھتی ہے۔اس کی چیخ و پکار سن کر رمشا، روا اور طاہرہ بیگم بھی آ جاتے ہیں۔آزر ڈھٹائی سے کہتا ہے کہ میں نے صرف اپنے بیٹے کو اس سے بچانے کی خاطر یہ قدم اٹھایا ہے اسے کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔حمزہ یہ سن لیتا ہے۔وہ یہ برداشت نہیں کر پاتا۔طاہرہ بیگم آزر کی حمایت کرتی ہیں۔

حیدر کشف کو سمجھاتا ہے کہ وہ گھر کے اندر آ جائے۔بلال ثمینہ کو اس کے کمرے میں لے جاتا ہے۔ماں کو کمرے میں چھوڑ کر بلال کشف کو اندر صالحہ کے کمرے میں لے آتا ہے لیکن کشف وہاں رکنے پر تیار نہیں ہوتی صالحہ اسے کہتی ہیں کہ صبح وہ خود اس کے ساتھ اس کے گھر چلیں گی۔

ثمینہ حیدر سے لڑتی ہے کہ اسے طلاق چاہیے۔بلال سمجھاتا ہے تو وہ کہتی کہ بلال اپنے باپ کی حمایت کرتا ہے۔وہ اپنے آپ کو زخمی کر لیتی ہے۔

موحد ایما سے ملنے ہاسپٹل آتا ہے جہاں زریں اسے کہتی ہے کہ وہ منصور کو چھوڑ دے گی بس موحد اس کے پاس آ جائے۔منصور کو یہ سن کر احساس زیاں ہوتا ہے وہ زینب کے پاس جانے کا ارادہ کر لیتا ہے۔کشف صالحہ بیگم کے ساتھ اپنے گھر آ جاتی ہے۔

موحد کے پاکستان واپس جانے کا سن کر زریں بہت دکھی ہوتی ہے۔دیپتی اپنے بچے کے ساتھ جو رات جنگل میں گزارتی ہے اس سے اس میں اتنی ہمت آ جاتی ہے کہ وہ اپنے بچے کے لیے تنہا جینے کا فیصلہ کر لیتی ہے۔زینب اس کی کہانی سے بہت متاثر ہوتی ہے۔

آزر ہاں اور بیوی کے ساتھ رمشا کو بھی لے کر ایئرپورٹ جاتا ہے گھر میں ردا اکیلی ہے۔ اچانک وہاں وہ ایک جانی پہچانی آواز سنتی ہے۔ زینب سے ملنے کے لیے منصور ہوٹل آتا ہے۔ وہیں اس کی ملاقات موحد سے ہوتی ہے۔ وہ اس غیر متوقع صورت حال پر حیرانی سے اسے دیکھتا ہے۔

ردا گھر میں اکیلی ہوتی ہے فرحان آ کر اسے اکساتا ہے کہ وہ اس کے ساتھ بھاگ چلے ردا کے انکار پر اسے غصہ آجاتا ہے اور وہ بدنیتی پر اتر آتا ہے۔ ردا اپنے آپ کو زخمی کر لیتی ہے فرحان بھاگ جاتا ہے۔ حمزہ آ کر اسے ڈاکٹر کے پاس لے جاتا ہے۔

منصور زینب سے ملنے آتا ہے تو وہاں موحد بھی پہنچ جاتا ہے موحد حیران ہوتا ہے کہ زینب سے منصور کا کیا تعلق ہے منصور بتاتا ہے کہ وہ اس کی فرسٹ کزن ہے۔

زینب کا شاپنگ پر جانا تھا منصور اسے اس کے والد کا واسطہ دے کر کہا ہے کہ وہ اس کے ساتھ شاپنگ پر چلے۔ اسے سونیا اور اس کی بیٹیوں کے لیے شاپنگ کرنی تھی۔ منصور اس کے لیے ایک ساڑھی گفٹ لیتا ہے۔ زینب کو ماضی یاد آتا ہے کہ وہ سونیا کی شادی میں اس کے لیے ساڑھی لایا تھا۔ وہ اس کی دی ہوئی ساڑھی ریسپشن پر چھوڑ جاتی ہے۔ منصور حیرت زدہ رہ جاتا ہے۔

بلال کشف سے ملنے آتا ہے کشف اس سے رکھائی سے پیش آتی ہے۔ اس کے یہ پوچھنے پر کہ وہ سونیا کے گھر سے رات میں کیوں آئی کشف ناراض ہو جاتی تھی۔

سونیا ردا کی حالت دیکھ کر پریشان ہے کہ اس کے سسرال والے آ چکے ہیں اور کسی وقت بھی ہوٹل سے گھر ملنے آ سکتے ہیں۔ ردا کہتی ہے کہ وہ چکر آنے پر گر پڑی تھی۔ موحد کے جانے کے بعد زرین منصور سے معافی مانگتی ہے منصور کے نہ ماننے پر کپ توڑ دیتی ہے۔

سونیا آ کر کشف سے معافی مانگتی ہے اور کہتی ہے کہ زینب یا کسی کو پتا نہ چلے۔

زینب پاکستان آ کر حیدر کے ساتھ آتی ہے وہ یہ جان کر حیرت زدہ ہے کہ کشف سونیا کے گھر نہیں بلکہ اپنے گھر میں ہے۔ حیدر یہ جان کر کہ زینب منصور سے کینیڈا میں مل چکی ہے، چونک جاتا ہے۔

سونیا اور آذر نے شائستہ اور سلیمان کی دعوت اپنے گھر میں رکھی تھی جس میں ان کی شادی کی تاریخ مقرر ہونا تھی۔ رمشا ردا کو تیار کرتی ہے۔ ردا رمشا سے محبت کے حوالے سے بات کر رہی ہوتی ہے کہ دروازے میں سلیمان کو کھڑا دیکھ کر شاکڈ رہ جاتی ہے۔

موحد کو زینب ڈنر پر انوائیٹ کرتی ہے۔ کشف کو بہت غصہ آتا ہے۔ وہ ڈنر پر موحد سے بدتمیزی کرتی ہے۔ میر و جیل میں بیٹھا شدید غم میں ہوتا ہے۔ اسے اپنی بیٹی سے اس حرکت کی توقع نہیں ہوتی۔ ردا کو جبران الزام دیتا ہے۔ اور پھر اسے کہتا ہے کہ وہ کل ہر اس صورت اس سے ملاقات کر لے جبران ردا کو ایک انجان جگہ لے جاتا ہے۔

حیدر، زینب کو میر منصور کا کینیڈا کا ایڈریس دینا بھول جاتا ہے۔ رمشا، کشف کے آنے پر بہت خوش ہوتی ہے۔ طاہرہ بیگم ان سے اجازت لیے بغیر کشف کے وہاں آنے کا بہت زیادہ برا مناتی ہیں۔ کشف کو لگتا ہے کہ وہ مر جائے گی۔ وہ سونیا سے وہاں سے جانے کی ضد کرتی ہے۔

میر منصور کے گھر فون آتا ہے کہ ایمان بلڈنگ سے گر کر انتہائی زخمی حالت میں اسپتال میں ہے۔ زینب کی وہاں بہت پذیرائی ہوئی ہے۔

موحد کو ایمانے کے زخمی ہونے کا پتا چلتا ہے۔ وہ پریشان ہوتا ہے۔ منصور اور زرین میں کھٹ پٹ ہو جاتی ہے۔ منصور کو اپنی ماں کی بات یاد آتی ہے کہ انہوں نے زینب کی شادی کر دی ہے۔

طاہرہ بیگم سونیا کو سخت سست سناتی ہیں۔ آزر کو بھی کشف کا وہاں رہنا پسند نہیں آتا۔

کشف گھبرا کر موحد کے پاس جاتی ہے وہ اپنی پریشانی میں الجھا ہوتا ہے۔ کشف کو ناگوار گزرتا ہے۔ زینب فون پر کشف کو ڈانٹتی ہے کہ وہ بغیر بتائے سونیا کے گھر سے کیوں نکل آئی۔ زینب کے ساتھ آئے ایک شاعر کو دل کا دورہ پڑتا ہے اور سب کے ساتھ زینب بھی انہیں دیکھنے اسپتال جاتی ہے۔ جہاں اس کا سامنا میر منصور سے ہوتا ہے۔ وہ دونوں حیران رہ جاتے ہیں۔

عائشہ کی خالہ کا بیٹا ذوہیب گھر والوں کو سرپرائز دینے کے لیے ایک ہفتے پہلے آجاتا ہے۔
ظفر صدیقی صاحب کو وفاقی وزیر بچل شاہ پولیس کے اعلا افسر کے ہمراہ اپنے گھر بلا کر انہیں مقدمے کو ختم کرنے کا کہتا ہے۔ پولیس افسر کرم الٰہی بھی انہیں سمجھاتا ہے کہ جان محمد اب بیان ولی شاہ کے حق میں دے گا۔ بچل شاہ ایک لفافے میں بلینک چیک دیتا ہے کہ اپنی مرضی کا اماؤنٹ بھر لیں۔ مائی یہ جان کر حیرت زدہ رہ جاتا ہے کہ ظفر صاحب نے قصاص کے پیسے لے لیے۔
ترنم کی عدت ختم ہو جاتی ہے۔ ماں اسے کہتی ہے کہ وہ کچھ ہار سنگھار کر لے۔ ترنم اپنے بیٹے کی بسم اللہ کرنے کے لیے کہتی ہے۔
جمال فون سن کر زرد پڑ جاتا ہے۔ وہ نائلہ سے کہتا ہے کہ اپنا پرس اٹھاؤ اور چلو۔ وہ نائلہ کو خوب پیدل گھماتا پھراتا آگے بڑھتا ہے وہ کسی گھبراہٹ کا شکار تھا۔ ایک جگہ جا کر وہ موٹر سائیکل کی پاس رکتا ہے اور اس پر بیٹھے ایک عجیب وغریب حلیے والے لڑکے کو کہتا ہے کہ نائلہ کو محفوظ جگہ پہنچا دے۔ وہ اسے انتہائی نچلے متوسط علاقے کے ایک گھر میں لے آتا ہے اور وہاں ایک عورت آ کر پوچھتی ہے کہ تم کون ہو۔
طلال کے پاس اس کے باپ کا فون آتا ہے کہ وہ ظفر صدیقی والے کیس سے دور رہے کیونکہ ان کے مفادات اس سے وابستہ ہیں۔ جھنڈے والی گاڑی کا خواب طلال کو اس کیس سے دور کر دیتا ہے۔
پریا طلال کی دیوانگی سے تنگ آ جاتی ہے۔ طلال اسے کہتا ہے کہ جو چیز اس کی ہوتی ہے وہ کسی اور کے قابل نہیں رہتی۔ وہ اس کے چہرے پر تیزاب ڈالنے کی دھمکی دیتا ہے۔ نائلہ کو پتا چلتا ہے کہ وہ جمال کا گھر ہے، راکٹ اس کا بھائی اور وہ لڑکی اس کی بھابھی ہے۔
چنبیلی طلال سے لڑ کر اپنا سامان پیک کرتی ہے۔ طلال اسے مارتا ہے اور دھمکی دیتا ہے کہ باہر نہ جانا۔ چنبیلی انتہائی بری حالت میں کوٹھے پر پہنچتی ہے۔ سب اس کی حالت دیکھ کر پریشان ہو جاتے ہیں۔
اچانک چنبیلی کی چیخوں سے پورا گھر لرز جاتا ہے۔
حمزہ ردا کے نکاح والے دن کشف سے ملنے جاتا ہے۔ کشف اسے دیکھ کر حیران رہ جاتی ہے وہ اس سے معافی مانگتا ہے۔ اور بتاتا ہے کہ وہ باہر جا رہا ہے۔ کشف اسے معاف کر دے۔
منصور زرین سے کہتا ہے کہ وہ پاکستان اس لیے جا رہا ہے کہ وہ اپنا گھر بیچ کر اس کا قرض اتارے۔ لیکن زرین اس کی بات پر یقین نہیں کرتی کہ تم وہاں جا کر ہمارے رشتے سے مکر سکتے ہو۔ جس پر منصور اسے بتاتا ہے کہ زرین کے والد نے اس کی خوشامد کر کے اسے زرین سے شادی پر مجبور کیا تھا۔
ردا سلیمان کو پا کر محسوس کرتی ہے کہ یہ اس کی ماں باپ کی فرمانبرداری کا انعام ہے۔
کشف، فائقہ کے ساتھ ورکشاپ اٹینڈ کرنے آتی ہے تو اس کی ملاقات وہاں موحد سے ہوتی ہے۔ موحد اسے نظر انداز کر دیتا ہے۔ لیکن اس کی وجہ سے کھانے پینے کا انتظام اچھے سے کروا دیتا ہے۔ کشف کو بہت محسوس ہوتا ہے۔ لیکن بعد میں وہ اس کی وضاحت کر دیتا ہے۔
زینب کشف کی وجہ سے پریشان ہے۔ وہ حیدر کے آفس جاتی ہے۔ وہاں اس سے کشف کے رشتے کی بات کرتی ہے وہ بلال کی بات کرتا ہے۔ وہاں ثمینہ آ جاتی ہے اور ان دونوں کو خوب ذلیل کرتی ہے۔ حیدر ثمینہ کو لے جاتا ہے۔ زینب وہاں سن بیٹھی رہ جاتی ہے چوکیدار آ کے اسے جانے کا کہتا ہے۔
کشف، ڈاکٹر موحد سے ملتی ہے اور کہتی ہے کہ اگر آپ مجھے اچھا سمجھتے ہیں تو میری ماں سے میرا ہاتھ مانگیں اور مجھ سے شادی کر لیں۔
فرحان، سلیمان کے ہوٹل پہنچ جاتا ہے اور اس سے کہتا ہے کہ وہ ردا کا بوائے فرینڈ اور سابقہ محبوب ہے۔

سولہویں قسط

کشف ساکت سی موحد کو دیکھتے ہوئے عجیب سے پچھتاوے میں گھر گئی۔ اپنی ہی بے قدری کرنے کا اس کا کبھی بھی ایسا ارادہ نہیں رہا تھا تو پھر اس نے یہ فضول بات منہ سے کیوں نکالی۔

اسے اب خود پر رونا آنے لگا تھا۔

''میں جانتی تھی، یہ بات ممکن نہیں آپ کے لیے..... اور میں نے بھی یوں ہی..... سوری۔ میرے منہ سے یہ بے تکی بات نکل گئی ورنہ میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اٹس امپاسبل۔'' وہ انگلیاں چٹخاتی، مضطرب لہجے میں موحد کی طرف دیکھے بغیر باہر سڑک کے کنارے چھوٹی سی بلی کو درخت کی آڑ میں چھپتے دیکھ رہی تھی۔ شاید اس کمزور بلی کو بھی کسی پناہ، کسی آڑ کی تلاش تھی۔

اس کی آنکھوں میں نمی سی چھلکنے لگی۔

''ہاں۔ یہ ممکن نہیں۔'' کافی توقف سے موحد کی سرد آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی تھی۔

وہ گردن موڑ کر دیکھنا نہیں چاہتی تھی بلکہ اسی لمحے گاڑی سے اتر کر چلے جانا چاہتی تھی مگر وہ تو جیسے کسی پتھر کی طرح بے جان ہو گئی تھی۔

''میں تمہاری ماما کے پاس جا سکتا ہوں پروپوزل لے کر اور انہیں کنوینس بھی کر سکتا ہوں لیکن اس کا نتیجہ..... مجھے ہنڈریڈ اینڈ ٹین پرسنٹ معلوم ہے کہ وہ ''نہیں'' میں ہوگا۔'' وہ اپنے مخصوص اعتماد بھرے لہجے میں اس ازلی دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ اب کے گردن گھما کر کشف کو باقاعدہ دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

کشف پوری کی پوری گھوم گئی تھی اس کی طرف۔

''کیا مطلب؟'' نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے ہونٹوں سے پھسلا تھا۔

''میں لو ایٹ فرسٹ سائٹ کو اس دنیا کی سب سے احمقانہ ٹرم سمجھتا ہوں بلکہ میرے نزدیک یہ کسی احمق کی ایجاد کردہ بات ہے۔ اس کا حقیقت سے دور و نزدیک کا کوئی تعلق نہیں۔'' وہ جانے کیا بول رہا تھا، کشف کو واقعی سمجھ میں نہیں آیا۔

''لیکن کشف! میں غلط تھا۔ میں سو فیصد غلط تھا۔ میرا اندازہ، میرا خیال سب خام تھا۔ پہلی نظر میں محبت کا اس دنیا میں نا صرف وجود ہے بلکہ اس وقت میرے نزدیک سب سے بڑی حقیقت ہی یہ ہے کہ.....'' وہ پل بھر کو رکا تھا۔

''جب تمہیں پہلی بار دیکھنے پر میں خود کو بھول گیا تھا اور میں نے اس خیال کو وہم جانا اور یہ وہم مجھے بار بار ہوا۔'' وہ گہرا سانس لے کر ایک دم سے چپ ہو گیا۔

آگے کیا بولنا ہے شاید وہ یہ سوچ رہا ہو لیکن کشف کے سینے میں اس کے دل کی دھڑکنوں نے جو دھک دھک مچا رکھی تھی، وہ پریشان تھی۔

وہ خود میں سمٹ گئی۔

''سوری۔ میں شاید اپنے دل کی یہ حالت ابھی بھی تم پر ظاہر نہیں کرتا، اگر تم یہ سب نہیں کہتیں۔'' وہ اس کی گمبھیر چپ کو شاید اس کی خفگی سمجھا تھا۔

فوراً وضاحت کرتے ہوئے بولا۔

''پلیز!'' اس کے لب خفیف سے ہلے تھے۔

''ابھی کچھ مت کہو۔ابھی میری بات پوری نہیں ہوئی۔''اس نے ذرا سا ہاتھ اٹھا کر اسے مدھم آواز میں ٹوکا تھا۔

''مجھے محبت، چاہت، پسندیدگی یہ سب جذبات بہت عامیانہ سے لگتے تھے۔اس لیے اتنے سالوں میں مجھے نہ کوئی لڑکی اچھی لگی اس نظر سے، نہ کبھی میں نے ایسا سوچا.....مگر تم میں کچھ تھا کشف! بے پناہ تھکن اور مصروفیت کے باوجود میں رات کا بڑا حصہ جاگتے تمہیں سوچتے ہوئے گزارنے لگا تھا۔''

اور کشف کو لگا کوئی ٹائم بم ہے اس کی ساتھ والی سیٹ پر پڑا جو کسی بھی لمحے ایک دھماکے سے پھٹ جائے گا اور اس کی پوری ہستی کے پرخچے اڑا دے گا۔

''یہ ڈاکٹر موحد کس قدر گہرا آدمی ہے، حد ہے بھئی۔''اسے خوف، غصہ، وحشت جانے کیا کیا کچھ محسوس ہو رہا تھا مگر زبان جیسے گنگ ہو چکی تھی اور لفظ گونگے۔

''میں نے کئی بار سوچا تم سے بات کروں، تمہیں کوئی اشارہ ہی دے دوں لیکن اصل مسئلہ خود میں تھا اپنے لیے۔اپنے رستے کی سب سے بڑی رکاوٹ میں خود تھا۔میں خود کو اس جذباتیت دکھانے پر دن رات ذلیل کیا کرتا تھا کہ میں اتنا کمزور کیسے پڑ سکتا ہوں۔ایک معمولی سی لڑکی کے لیے۔''

''اف اس شخص کو اظہار محبت میں بھی اپنی ایگو کتنی عزیز ہے۔''کشف کھول کر رہ گئی۔

''سوری، مجھے معلوم ہے ''معمولی لڑکی'' تمہیں اچھا نہیں لگا لیکن میں کیا کرتا، میں خود اپنے ہاتھوں مجبور تھا۔''

''وہ عجیب ہی باتیں کر رہا تھا اپنے جیسی۔''

وہ کڑھ کر رہ گئی۔

''پتا نہیں تمہارے دل میں میرے لیے کیا تھا، لیکن تم جب بھی میرے سامنے آتیں، میں تمہیں نظر انداز کرنے کی پرزور کوشش کرتا اور ہر بار اس کوشش میں جیسے چت گر جاتا اور آج تم نے یہ بات کر کے میرے اندر کی گھٹن کو باہر آنے کا رستہ دکھا دیا۔''

''میرا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا صرف آنی کی وجہ سے۔''اب بھی نہ بولتی تو شاید وہ ساری زندگی خود اپنے آپ کو منہ دکھانے کے لائق نہ رہتی۔

''آنی کی وجہ سے میں بھی یہ سب کہنے پر مجبور ہوا ہوں۔''موحد کی بات کشف کو چونکا گئی۔

''کیا مطلب انہوں نے آپ سے کہا؟''وہ پریشان ہو گئی۔

''نہیں مگر میں ان کے سامنے یہ پروپوزل لے کر جاؤں گا تو وہ انکار کر دیں گی.....فوراً نہیں کچھ دنوں بعد۔''موحد کی بات اسے اور الجھا گئی۔

''میں ابھی بھی آپ کی بات کا مطلب نہیں سمجھی۔''وہ جھلا گئی۔

''تمہارے فادر میرے اسٹیپ فادر ہیں اور وہ شخص اس دنیا میں اگر کسی سے نفرت کرتا ہے کشف تو وہ میں ہوں۔وہ مجھ سے شدید نفرت کرتے ہیں تو اپنی بیٹی کے لیے مجھے کیسے منتخب کر سکتے ہیں۔''اور کشف کو لگا وہ ٹائم بم بلاسٹ ہو گیا ہے۔

☆☆☆

ردا بہت خوش تھی، بہت زیادہ خوش۔

سونیا کو ردا پر بے اختیار پیار آیا۔

وہ رمشا اور دادی کے ساتھ نکاح کی تصویریں اور ویڈیو دیکھ رہی تھی۔
آزر ایک طرف بیٹھا کسی حساب کتاب میں غرق تھا۔
اس کے کہنے پر سونیا چائے لینے گئی تھی۔ ردا کی بے اختیار ہنسی پر اس کے قدم لاؤنج کے دروازے میں ہی ٹھٹک گئے تھے۔
آزر نے بھی پین ہاتھ سے رکھ کر پہلے ردا کو اور پھر سونیا کو دیکھا تھا۔
اس کی آنکھوں میں اپنے فیصلے کی کامیابی کی چمک تھی، ایک فاتحانہ احساس۔ سونیا نظریں چرا کر آگے بڑھ کر سب کو چائے دینے لگی۔
"ردا! حمزہ کو بھی بلا لو، روم میں ہے اپنے۔" اسے چائے دیتے ہوئے سونیا کو حمزہ کی کمی محسوس ہوئی تھی اور یہ بات بھی تھی کہ حمزہ آج کل ردا کی کوئی بات نہیں ٹالتا تھا۔
"میں نے کہا تھا مما! وہ کسی ضروری کام سے باہر گیا ہے تھوڑی دیر کے لیے۔" ردا نے سلیمان کی خوب صورت تصویر سے نظریں چراتے ہوئے آہستگی سے کہا۔
"میں فارغ ہولوں شادی کے ہنگاموں سے تو اس کے ضروری کام تو میں دیکھ ہی لوں گا۔" آزر کی پدرانہ غیرت ہرٹ ہوئی تھی، وہیں سے سب کو سناتے کو اونچی آواز میں بولا تھا۔
"بھئی، ہم نے تو اولاد کی ایسی خودسری دیکھی نہ سنی۔" طاہرہ بیگم کیوں پیچھے رہتیں بیٹے کا ساتھ دینے سے۔
"بلکہ اس دن تو شائستہ بھی مجھ سے پوچھنے لگی۔ خالہ کوئی ناراضی ہے حمزہ بیٹے کی گھر میں۔ سچ میں فوری طور پر تو مجھ سے کوئی بہانہ بھی نہیں بن سکا۔"
"ماں بیٹے کی ڈراما کرنے کی تو خوب عادت ہے۔" سونیا چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے دل میں کلسی۔
"آج کل طاہرہ بیگم یا آزر سے نہیں الجھنا۔" سونیا نے ردا کی رخصتی تک دل میں طے کر لیا تھا، سو اپنا خون جلاتی خاموشی سے چائے پیتی رہی۔
"ہاں تو نظر آتا ہے ناں اس کا بگڑا ہوا رویہ، لوگ اندھے تو نہیں ہیں۔ اتنا دماغ خراب ہوا ہے اس کا کہ موقع کی نزاکت کا بھی احساس نہیں ہے اس کو۔" آزر کو پھر سے خوب گرجنے کا موقع مل گیا تھا۔
"پاپا! آپ بھی تو اس کو بلاتے نہیں، خود سے ٹھیک طرح سے بات نہیں کرتے جبکہ آپ کو معلوم ہے کہ وہ

ناراض ہے۔'' ردا نے بڑے اعتماد سے باپ کو شرمندہ کیا تھا۔
شاید سلیمان کے ساتھ کے احساس نے اسے یہ اعتبار بخشا تھا یا حمزہ کی تکلیف نے اسے اتنا جرأت مند بنا دیا تھا۔
ایک لمحے کو تو آزر بھی ٹھٹکا تھا ردا کی بات پر۔
''تو کیا کروں، باپ ہوں میں اس کا، منتیں کروں، ہاتھ جوڑ کر معافی مانگوں اس سے۔'' ہار ماننا تو آزر نے کبھی سیکھا ہی نہیں تھا۔
''ہاں تو باپ کا بھی کوئی درجہ ہے، کوئی مقام ہے اسے نہیں پتا۔'' طاہرہ بیگم فوراً چہک کر بولیں۔
''اور اگر باپ کو ہی اپنے درجے، اپنے مقام کا احساس نہیں ہو تو پھر اولاد کیا کرے گی دادو منہ چھپا کر ہی پھرے گی ناں۔''
حمزہ جانے کس وقت باہر سے آیا تھا اور کیا کچھ سن کر یوں تنفر بھرے لہجے میں اونچی آواز میں بولا تھا کہ سب سن لیں۔
آزر تو لمحہ بھر کو سناٹے میں رہ گیا۔
''کیا کیا ہے میں نے، قتل کیا ہے کسی کو جو تم جیسے نافرمان کو منہ چھپانا پڑ رہا ہے۔'' وہ تقریباً اپنی جگہ سے اچھل کر اس کی طرف جھپٹا تھا۔
''یہ زیادہ اچھا ہوتا آپ کسی کو قتل کر دیتے۔'' وہ ذرا بھی باپ کے غصہ سے خائف نہیں ہوا تھا۔ ان ہی قدموں پر جم کر دروازے سے کندھے ٹکائے کھڑا رہا تھا۔ اس کی نظروں میں عجیب سرد سا جماؤ تھا۔
آزر کو نظریں چرانی پڑ گئیں۔
''سن رہی ہو تم اس کی بکواس۔ یہ تربیت کی ہے نا تم نے اس کی۔''
طاہرہ کو سب سے آسان شکار سونیا نظر آئی تھی سو اس پر جھپٹیں۔
''سوری دادو! مما کی تربیت پر سوال اٹھانے سے پہلے اپنی تربیت پر بھی نظر کر لیں تو شاید آپ کا بوجھ کچھ ہلکا ہو جائے جو ہر انسان ساتھ لے کر جاتا ہے۔'' اتنی تلخی، اتنا کڑواہٹ حمزہ میں کہاں سے آیا، اس کی بات پر سونیا تو ششدر سی بیٹھی رہ گئی۔
وہ تو بڑا ابالی سا، ہر چیز کو مذاق میں لینے والا، ہنسنے کھیلنے والا لڑکا تھا۔
یہ حمزہ تو خود ماں ہو کر سونیا کی پہچان میں نہیں آ رہا تھا۔
''سن رہے ہو تم اس کی بکواس۔'' طاہرہ کے تو سر سے لگی جا کر۔
''یعنی میرے گناہوں کا بوجھ اتنا ہے، یہ کہا اس نے۔'' وہ غصے میں کف اڑانے لگیں۔ کانپتی ہوئی اٹھ کر آگے بڑھی تھیں۔
''دادو..... دادو پلیز۔ آپ بیٹھ جائیں۔ یہ حمزہ یوں ہی فضول میں بولتا رہتا ہے۔'' ردا، دادی کی حالت دیکھ کر گھبرا سی گئی۔ انہیں دونوں ہاتھوں سے سنبھالنے لگی۔
''شرم کرو حمزہ!'' رمشا بھی دادی کی حالت دیکھ کر اونچی آواز میں بولی۔
''اس گھر میں ''شرم'' والا لفظ سینسرڈ ہے بہنا! یہاں کسی کو نہیں آتی۔ یہاں ہر رشتہ، ہر احساس بے شرم ہے۔''
حمزہ واقعی ہر حد کو پھلانگتا جا رہا تھا۔
''میں تمہارا منہ توڑ دوں گا۔ نکل جاؤ میرے گھر سے ابھی اور اسی وقت۔'' آزر کی برداشت کی حد بھی بس

یہیں تک تھی۔
"آپ کا گھر آپ کو مبارک ہو اور معاف کیجیے گا والد صاحب! یہ گھر بھی آپ کے لیے ہوگا۔ میرے لیے تو اس سے اچھی باہر کی سڑک ہے۔ جتنا کوئی اس سڑک پر غیر محفوظ ہوگا' اس سے زیادہ سنگ مرمر کے بنے اس پتھر کے گھر میں۔ مجھے یہاں رہنا بھی نہیں۔" وہ بغیر کسی ڈر خوف کے کہہ کر، بغیر رکے واپس مڑ گیا۔
"حمزہ..... حمزہ رکو....." سونیا کے ہاتھوں کے توتے اڑ گئے۔
"شادی میں چند دن ہیں، نیا تماشا کھڑا ہو جائے گا۔ آزر! روک اس ناحلف کو۔" طاہرہ بیگم اپنا صدمہ بھول کر چلائیں۔
آزر نے ایک قدم حمزہ کے پیچھے بڑھایا پھر سر جھٹک کر اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔
"اماں جان جو تماشا لگنا ہے ایک ہی بار لگ جائے، میں اس نافرمان کی منتیں کروں گا نہ اسے روکوں گا۔" وہ زور سے آگے پڑی فائل میز پر پٹخ کر بولا۔
اتنا تو آزر کی بھی سمجھ میں آ گیا تھا کہ حمزہ کو منہ لگانے کا مطلب رہی سہی عزت بھی رولنے کے برابر تھا سو خاموشی بہتر تھی۔
رمشا ماں اور بھائی کے پیچھے گئی تھی۔ ردا گم صم سی طاہرہ بیگم کے ساتھ لگی بالکل چپ تھی۔

☆☆☆

"کوئی بھی مناسب سا رشتہ ہو، لڑکا برسر روزگار ہو، فیملی مختصر ہو۔ تمہیں کشف کے مزاج کا تو پتا ہے، لڑکا متحمل مزاج اور برداشت والا ہو۔"
زینب اپنی کولیگ فرح سے اسٹاف روم میں بیٹھی کہہ رہی تھی۔
دونوں کا پیریڈ فری تھا۔
فرح کی بہن اچھی فیملیز میں رشتے کروانے کا کام فی سبیل اللہ کرتی تھی۔ اس کا کوئی میرج بیورو نہیں تھا مگر اس نے جتنے بھی رشتے کروائے، وہ سب بہت کامیاب گئے تھے، اس بات کی گواہ زینب بھی تھی۔
"یار! تحمل اور برداشت کا پتا تو اصل میں شادی کے بعد ہی چلتا ہے۔"
فرح نے آخری ٹیسٹ چیک کر کے باقیوں کے ساتھ رکھتے ہوئے بنڈل بنایا اور ایک طرف رکھ دیا۔
"پھر بھی اچھے گھر کی ماں باپ کی تربیت ہو تو صاف پتا چل جاتا ہے۔" زینب کچھ کمزور سے لہجے میں بولی۔
"پہلے بھی تم نے کہا تھا، مجھے یاد ہے۔ کشف کے رشتے کے لیے پھر دوبارہ یاد نہیں کرایا تو میں سمجھی....." فرح بولتے ہوئے چپ سی ہو گئی۔
"کیا سمجھیں؟" زینب اس کی بات پر چونکی۔
"وہ تمہارے کزن آتے تھے ناں، ایک بار تم نے ذکر بھی کیا تھا کہ ان کا کوئی بیٹا ہے اور تمہیں بہت پسند بھی ہے تو میں سمجھی، شاید وہاں بات سیٹ ہو گئی ہے۔" فرح نے رک رک کر وضاحت کی۔ زینب سر جھکا کر خاموش رہ گئی۔
اس کے دل میں تو یہی تھا مگر دل کی خواہش ضروری تو نہیں مقدر میں بھی لکھی ہو۔
"نہیں..... ایسا کچھ نہیں۔" اس نے سر جھٹک کر خیالات کو مزید سر اٹھانے سے روکا۔
"مجھے کشف کے سمسٹر کے اینڈ ہونے کا انتظار تھا۔ اب تو بس کچھ وقت ہے تو اس دوران اگر کہیں بات بن جائے تو سلسلہ شروع ہونے میں بھی تو کچھ ٹائم لگتا ہے تو پلیز تم آج ہی اپنی آپا سے بات کرو۔ بس تین چار ماہ

میں ہو جائے تو بہت اچھا ہوگا۔'' زینب نے کھل کر کہا۔
''تین چار ماہ۔'' فرح نے دہرایا۔ ''ہونے کو تو جھٹ پٹ بھی ہو جاتا ہے اور اگر کچھ دیر بھی ہو تو میں نے اور آپا نے یہی دیکھا ہے کہ اس کا نتیجہ بڑا اچھا، خوش گوار نکلتا ہے۔ میں آج ہی آپا سے جا کر بات کرتی ہوں، ان شاء اللہ اچھا ہی ہوگا کشف کے لیے۔'' فرح نے امید بھرے لہجے میں کہا۔
''تمہارے پاس کشف کی تصویر تو ہے نا یا میں کچھ اس کی فریش پکس فارورڈ کر دوں تمہیں۔'' زینب کو اٹھتے ہوئے خیال آیا۔
''ہاں، یہ ٹھیک ہے۔ تم بھیج دینا، میرے پاس تو دو تین ہیں وہ بھی پرانی۔'' فرح بھی بیگ اٹھا کر ٹیسٹوں کا بنڈل سنبھالتے ہوئے بولی۔
اگلے پیریڈ کی گھنٹی بج چکی تھی۔
''ویسے اگر تم پچھلے ہفتے بات کرتیں ناں تو قسم سے ایک بہت ہی زبردست رشتہ تھا آپا کے پاس۔ اکلوتا لڑکا ایک ہی بہن، شادی شدہ وہ بھی امریکا میں۔ ماں نہیں تھی ان کی اور باپ زیادہ تر بیٹی کے پاس امریکا میں رہتے تھے۔ ایسا رشتہ تو کوئی بھی نہیں چھوڑتا۔ ہاتھوں ہاتھ ہو گیا سب کچھ۔'' فرح ساتھ چلتے ہوئے بتانے لگی۔
''ظاہر ہے، وہ میری کشف کے لیے نہیں تھا جو اس کے نصیب میں ہوگا اسے کوئی اور لے جا نہیں سکے گا' تم دیکھنا۔'' زینب نے ہنس کر کہا۔
فرح نے بھی مسکرا کر گردن ہلا دی تھی۔

☆☆☆

''واٹ ڈو یو مین؟'' سلیمان کے ماتھے پر بے شمار بل پڑے تھے۔
وہ سخت ناگوار نظروں سے سامنے کھڑے بوٹے قد کے فرحان کو دیکھ رہا تھا۔
''سوری شاید میں غلط ٹرم استعمال کر گیا۔'' وہ سلیمان کے انداز پر فوراً سنبھلا تھا۔
''ایکس کولیگ..... ایکس.....'' وہ رک گیا۔ ''فرینڈ'' اس کے لہجے میں معنی خیزی تھی۔ مصنوعی انداز میں سر کھجانے لگا۔
''اب دوست کے لیے اور کیا لفظ استعمال کروں میں۔'' اس کی معصومیت میں بہت کچھ تھا۔
سلیمان ہونٹ سختی سے بھینچے اسے گھورے جا رہا تھا۔
''اگر ہم بیٹھ کر بات کر لیں۔'' فرحان نے پھر دوستانہ انداز میں پیشکش کی۔
''اس کی ضرورت نہیں مسٹر! آپ کو جو کہنا ہے۔ آپ یہیں مجھ سے کہہ سکتے ہیں۔'' انتہائی سرد لہجے میں جواب ملا۔
''ایز یو لائک۔'' اس نے بے نیازی سے کندھے اچکائے۔
''اب اگر میری بات سن کر آپ اشتعال میں آ گئے۔ آواز اونچی ہو گئی آپ کی۔ میں تو بات کر کے چلا جاؤں گا۔ آپ کو یہاں رکنا ہے شاید تو آپ کے لیے کچھ مسئلہ نہ ہو جائے۔ میں تو آپ کی سہولت کے لیے کہہ رہا تھا۔'' وہ تقریباً کمرے کے اندر ہی کھڑا تھا تو یقیناً کوئی ایسی بات ضرور ہوگی جو اسے مزید ''تنہائی'' چاہیے تھی۔
سلیمان نے سرد انداز میں ذرا پیچھے ہٹ کر اسے ایک طرف پڑے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔
کمرہ نہ صرف پر آسائش تھا بلکہ ایک شاہانہ ٹھاٹھ باٹھ کے عادی شخص کے ذوق کا بھی پتا دے رہا تھا۔
''میں زیادہ وقت نہیں لوں گا۔'' وہ سلیمان کے رویے پر قدرے محتاط لہجے میں بولا۔
''زیادہ وقت میرے پاس ہے بھی نہیں۔'' سلیمان نے اس رکھائی سے کہہ کر سرسری نظر سے کلائی پر بندھی

''ایک شخص سوتیلے بیٹے سے کیوں نفرت نہیں کرے گا؟'' اس نے جواب میں الٹا سوال کیا۔
''میں نہیں سمجھی۔'' وہ واقعی نہیں سمجھی تھی۔
موحد ہونٹ بھینچے جیسے خود کو کچھ بولنے سے روک رہا ہو۔
وہ رخ پھیرے باہر کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔
''میری زندگی کا وہ تکلیف دہ ترین حصہ جسے میں مرنے کے بعد بھی دہرانا نہیں چاہتا۔'' اس کی آواز میں بہت سی کرچیاں تھیں، بہت ٹوٹ پھوٹ تھی شاید وہ اپنے آنسو بھی روک رہا تھا۔
''ڈاکٹر موحد!'' وہ بہت ہولے سے اس کا ہاتھ چھو کر جیسے ڈرتے ڈرتے بولی تھی۔
اس نے گردن گھما کر سرخ آنکھوں کے ساتھ کشف کو دیکھا۔
وہ ڈر گئی۔ ایک دم سے وہ بدلا بدلا نظر آ رہا تھا۔
''پلیز، میں جانتی ہوں۔ یہ سب کچھ کہنا آپ کے لیے بہت تکلیف دہ ہے اور نا قابل بیان بھی لیکن میں جاننا چاہتی ہوں، یہ میرا حق ہے۔'' آخر میں وہ کچھ زور دے کر بولی تھی۔
''حق تو چھینا جاتا ہے، مانگا نہیں جاتا۔ میرے باپ کی بھی یہی غلطی تھی مگر جب انسان جنون اور پاگل پن میں اندھا ہو رہا ہو تو وہ کسی کے حق کو دیکھتا ہے، نہ تسلیم کرتا ہے۔ اس شخص نے بھی وہی کیا جو اس کے پاگل پن نے اسے سمجھایا۔'' وہ بہت غم زدہ تھا۔ کشف کا دل اس کی حالت پر بہت دکھی ہونے لگا تھا۔
''کیا سمجھایا؟'' وہ ڈرتے ڈرتے بولی۔
''کیوں نہ میں اس شخص کو ناپسند کروں۔ وہ..... وہ مجھ سے نفرت کرنے، جس نے میرے اپنے جنون میں، میرے باپ کو قتل کیا ہو۔''
وہ جیسے دیوانگی میں چیخا تھا۔
اور کشف تو پتھر بنی بے یقینی سے اسے دیکھتی جا رہی تھی۔
گاڑی میں ایک دم سے گہرا سناٹا چھا گیا تھا۔
''غلط..... جھوٹ..... بکواس..... میں کیسے مان سکتی ہوں۔ میرے بابا.....'' بہت دیر بعد اس کا ردعمل شدید انداز میں ظاہر ہو رہا تھا۔
''اور میرا ہنستا کھیلتا، جیتا جاگتا باپ جو اس لمحے مجھ سے ہنسی مذاق کر رہا تھا۔ مجھے اپنے ساتھ لپٹا رہا تھا، اس ظالم منصور نے میرے بابا کو ہمیشہ کے لیے مجھ سے جدا کر دیا۔ میں کیسے بھول جاؤں۔''
کشف کو وہ اپنے حواسوں میں نہیں لگ رہا تھا۔
جنون اور وحشت سی اس کی آنکھوں اور چہرے سے ٹپک رہی تھی۔ وہ کچھ بھی کر سکتا تھا۔
وہ اپنی جگہ پر سمٹ کر رہ گئی۔
''میں نہیں مان سکتی۔'' وہ بڑبڑائی تھی شاید۔
اور جواب میں اس نے اندھا دھند گاڑی بھگانا شروع کر دی۔ وہ واقعی اپنے حواس میں نہیں تھا۔ وہ گاڑی اڑا رہا تھا۔ کشف نے خوف سے آنکھیں بند کر لیں۔

☆☆☆

''حمزہ! تم ہوش میں تو ہو ناں۔'' سونیا ایک دم سے بھڑک اٹھی۔
وہ حمزہ کو منانے کے لیے اس کے پیچھے ہی چلی آئی تھی۔
وہ اپنے غصے اور ضد میں اس حد تک بھی جا سکتا ہے، سونیا کو اندازہ نہیں تھا۔

''کیوں..... کیوں نہیں مما؟'' وہ ذرا بھی شرمندہ نہیں تھا۔
''یہاں کسی کی عزت..... کردار آپ کے نزدیک کوئی وقعت نہیں رکھتا۔'' وہ سوال پر سوال کرتا جا رہا تھا۔
سونیا کو یہ امید نہیں تھی کہ اس کے اندر ایسا لاوا ابل رہا ہے ورنہ اسے اس وقت نہیں چھیڑتی۔
''حمزہ! ہوش میں رہ کر بات کرو۔'' اس نے بمشکل خود پر اپنے ابلتے طیش پر قابو پاتے ہوئے قدرنرمی سے کہا تھا۔
''جس ذلت کے گڑھے میں پاپا نے مجھے اور کشف کو گرایا ہے، کیا اس کے بعد بھی آپ مجھ سے ہوش کی توقع رکھ سکتی ہیں۔''
وہ دوبدو ہو کر کہے جا رہا تھا۔
''اس وقت تم صرف اپنی بات کرو، تم اپنے باپ کے ساتھ اپنا رویہ، اپنی بات چیت کس طرح بہتر کر سکتے ہو۔'' سونیا زور دے کر بولی۔
حمزہ نے دکھ سے ماں کو دیکھا۔
''آپ اتنی خود غرض ہو سکتی ہیں ماما! میں اندر تک دکھی ہو چکا ہوں، ٹوٹ رہا ہوں۔ آپ دونوں کی اصل شکل دیکھ کر۔ اگر اپنے لیے ہر غلط بات ٹھیک ہو سکتی ہے آپ کے نزدیک تو پھر اپنی اولاد سے آپ کس نیکی، کس اچھائی کی توقع کر سکتی ہیں۔'' وہ ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہہ رہا تھا۔
سونیا لمحہ بھر کو نظریں چرا کر رہ گئی۔
بہر حال اس وقت اسے حمزہ کی ساری بکواس کو شربت کی طرح اپنے حلق سے اتارنا تھا، یہ ضرورت تھی۔
''حمزہ بیٹا! یہ سب کچھ تم لوگوں کے لیے.....'' اس نے لہجے میں مٹھاس سمو کر کہا۔
''فار گاڈ سیک... اسٹاپ اٹ مام.....!'' وہ سرخ چہرے کے ساتھ طیش میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔
''بند کریں یہ میلو ڈرامہ کہ آپ لوگ ہمارے کندھے استعمال کر کے اپنی اس کمینگی کو حق بجانب ثابت کر سکتے ہیں خود کو۔ جسٹی فائی کر سکتے ہیں۔'' وہ غصے میں مٹھیاں بھینچ رہا تھا۔
اور پہلی بار سونیا کو اندازہ ہوا، وہ جو یہ سب کچھ ایزی لے رہی تھی، یہ سب اتنا آسان اور نظر انداز کرنے والا نہیں ہے۔ معاملہ اس کی سوچ سے زیادہ بگڑ چکا تھا۔
''تم آخر چاہتے کیا ہو؟'' وہ زچ ہو کر بولی۔
''بتا چکا ہوں۔'' وہ ماتھے پر آنکھیں ٹکائے مکمل رکھائی سے بولا۔
''کچھ شرم کرو حمزہ! کچھ باپ کا لحاظ ہے تمہاری نظر میں۔'' وہ پھر سے تپ گئی۔
''انہوں نے کچھ لحاظ رکھا، اپنی عمر، اپنے سفید بالوں کا یا کشف کی معصومیت کا یا میرا تو پھر میں کیوں رکھوں۔ وہ مجھ سے نہ سہی، کشف سے معافی مانگیں گے تو ہی.....''
وہ کہتے ہوئے مڑا اور پیچھے کھڑے آزر نے ایک زناٹے دار تھپڑ اس کے منہ پر مارا تھا۔ حمزہ اس تھپڑ کی شدت سے لڑکھڑا کر رہ گیا۔
سونیا ششدر سی دروازے میں کھڑے آزر کو دیکھتی رہ گئی۔
☆☆☆
''خدا کے لیے..... اللہ کے واسطے.....'' وہ آنکھوں پر ہاتھ رکھے وحشت بھرے انداز میں چیخی تھی۔
اسے خود بھی نہیں پتا تھا، وہ گاڑی کو اس خوف ناک رفتار سے اڑاتا کس طرف لے کر جا رہا ہے۔
کشف کی چیخ پر بے اختیار اس کے پاؤں بریک پر جا کر لگے تھے۔ ایک دم سے کار میں جامد سناٹا چھا گیا

تھا۔

کشف نے ڈرتے ڈرتے ہاتھ چہرے سے ہٹائے تھے۔ سامنے نیم پختہ سڑک پر تیز پیلی دھوپ میں سوائے تیکھی چبھنے والی روشنی اور گہری خاموشی کے کچھ بھی نہیں تھا۔

''سوری!'' موحد کی آواز کسی گہرے کنویں سے آئی تھی۔

کشف نے اسے گھور کر دیکھا، دل میں تو بہت کچھ تھا جو اگل دینے کو جی چاہ رہا تھا۔ لیکن وہ ابھی چند لمحے پہلے اس شخص کی ''بے اختیاری'' کا بڑا خوف ناک مظاہرہ دیکھ چکی تھی۔

''آج سے پہلے میں واقعی آپ کو بہت معقول انسان سمجھتی تھی۔''

وہ یہ کہنے سے خود کو باز نہیں رکھ سکی اور یہ اس کے حساب میں بہت کم تھا۔ اس کے مقابلے میں جو اس پر بیتی تھی تھوڑی دیر پہلے۔

''مگر اس سب کے باوجود اس شخص نے ماضی میں میرے ساتھ جو کچھ بھی کیا..... کشف میں تمہارے ساتھ ایک نئی زندگی شروع کرنا چاہتا ہوں۔''

کشف کو اندازہ نہیں تھا، وہ ابھی بھی ایسی بات کر سکتا ہے۔

''آپ کو لگتا ہے، میری ایسی سوچ ہوگی۔'' وہ جتائے بغیر نہیں رہ سکی۔

''تمہاری ماما اور اس شخص کے درمیان ماضی میں جو بھی رنجش رہی ہو، مگر یہ بھی فیکٹ ہے کہ آنی اس شخص کے سحر میں ابھی بھی گرفتار ہیں، میں ان دونوں کو جس طرح ایک دوسرے کے کلوز دیکھ چکا ہوں۔''

وہ سانس لینے کے لیے کشف کے تاثرات دیکھنے کو رکا تھا۔

''وہ وہاں ملے تھے اور اب ان کے درمیان پہلے والی سرد جنگ نہیں ہے اور جیسے ہی میں تمہارا ہاتھ مانگنے جاؤں گا، تمہاری آنی فوراً تمہارے سوکالڈ فادر سے رابطہ کریں گی اور وہ میری شخصیت میں اتنے کیڑے نکالے گا کہ آنی تو کیا شاید تم بھی میری شکل دیکھنا گوارا نہ کرو۔''

آج کا دن کشف کی زندگی کا سب سے عجیب ترین دن تھا۔

اس نے آج سے پہلے ایسا کچھ نہیں سوچا تھا کہ اس کا باپ ایک کرمنل شخص بھی ہو سکتا ہے اور منصور کا نام تک نہ لینے والی زینب آج بھی اس کے ''اثر'' میں ہے۔

''آپ کیا چاہتے ہیں؟'' اسے سمجھ میں نہیں آئی، وہ کیا سوال کرے۔

''یہ صرف تمہاری زندگی کا فیصلہ ہوتا تو مجھے اتنا مسئلہ نہیں ہوتا کشف! یہ ہماری زندگی کا معاملہ ہے، میری اور تمہاری۔'' وہ جس اپنائیت اور توجہ سے یہ بات کر رہا تھا، کشف کو لگا وہ دونوں صدیوں تک ساتھ رہنے کے پیمان باندھ چکے ہیں۔

''آپ مجھ سے کیا توقع کر رہے ہیں۔''

''تم صرف میرا ساتھ دو۔'' وہ بے ساختہ بولا تھا۔

''میں آپ کے ساتھ تو.....'' اس کے ہونٹوں سے بے اختیار پھسلا اور جملہ نامکمل ہوتے ہوئے بھی پورا تھا کہ موحد کی آنکھوں میں اس کے لیے خاص تشکر بھرے احساسات لودینے لگے تھے۔

''میں اتنی جلدی تو فیصلہ نہیں کر سکتی ناں!'' دوسرے لمحے وہ اپنی ہی نفی کرتے ہوئے کچھ جھلائی تھی۔

''مگر اس فیصلے میں ذرا بھی دیر ہوئی تو پھر ہمیشہ کے لیے دیر ہو جائے گی۔'' موحد نے اسے ممکنہ خطرے کا احساس دلایا۔

''میں سمجھی نہیں۔'' وہ واقعی نہیں سمجھی تھی۔

"منصور احمد چند ہی دنوں میں پاکستان آ رہا ہے۔" اس نے آج کے دن کا دوسرا بڑا دھماکا کیا تھا۔
کشف کا منہ کھلا رہ گیا۔
"جھوٹ بول رہے ہیں۔" اس کے منہ سے فقط یہی نکل سکا۔
"کم از کم تم سے میں اب کبھی جھوٹ نہیں بول سکتا۔" اس کے لہجے میں کیا نہیں تھا۔ مان، احساس، بھرم، چاہت۔
کشف گم صم سی اسے دیکھتی رہ گئی۔
"تمہارے پاس فیصلہ کرنے کے لیے صرف آج کی رات ہے، فقط چوبیس گھنٹے۔"
موحد نے اس کے کان میں سرگوشی کی تھی۔
اور کشف سن ہو کر رہ گئی تھی۔

☆☆☆

زریں الماری سے اپنے اور ایمان کے کپڑے نکال نکال کر بیڈ پر ڈھیر کرتی جا رہی تھی۔
ایمان باہر ٹیرس میں کرسی پر بیٹھی تھی۔
وہ آج کافی بہتر تھی۔ اسے شام میں چیک اپ کے لیے جانا تھا۔
"کیا سارا گھر اٹھا کر لے جاؤ گی؟" منصور گھر کے اندر داخل ہوا۔ زریں کو یوں الماریاں خالی کرتے دیکھ کر ہاتھ میں پکڑے شاپنگ بیگ باہر کی میز پر تقریباً پھینکتے ہوئے جل کر کہا۔
"ظاہر ہے تم نے وہاں جا کر اپنا گھر بیچنا ہے، پراپرٹی سیل کرنے میں دن نہیں مہینے لگ جاتے ہیں، پھر تمہاری فیملی کی اتنی کلوز شادی اور وہاں کا ماحول بھی ہمارے لیے اجنبی ہے تو کپڑے ہر طرح کے ہونے چاہئیں ہمارے پاس۔ جانے کتنا وقت لگ جائے۔"
زریں نے اس کی خوب ساری 'تسلی' کرا دی، ساری تفصیل سُن کر منصور کا موڈ بگڑ چکا تھا۔
وہ اب کوئی بھی جواب دیے بغیر کچن میں جا کر اپنے لیے کافی بنانے لگا تھا۔ اس نے شاید آج صبح سے کچن میں جھانک کر بھی نہیں دیکھا تھا، سارا کچن جھوٹے برتنوں سے بھرا بکھرا ہوا تھا۔
"منصور! کافی بنانے لگے ہو تو پلیز میرے لیے بھی ایک کپ بنا لینا، صبح سے کام کر کر کے اتنی تھکن ہو رہی ہے۔"
اس نے وہیں سے ہانک لگائی۔
اور منصور کا جی چاہا، پین اٹھا کر زریں کے سر میں کھینچ کر مارے بلکہ اس لومڑی جیسی مکار عورت کو مار ہی ڈالے۔
چولہے پر پانی کم کھول رہا تھا، منصور کا خون اس سے زیادہ۔
"آج کھانا بھی تمہیں بنانا پڑے گا۔ شام میں جمال انکل آ رہے ہیں، ناصر کے ساتھ اسٹورز کا سارا انتظام میں فی الحال ان دونوں کو ہینڈ اوور کر کے جا رہی ہوں۔ تمہاری بات ہوئی انکل جمال سے فون پر۔" وہ منصور کے خراب موڈ کا شاید مزہ لیتے ہوئے خواہ مخواہ فرینڈلی ہو رہی تھی، جیسے ان دونوں کے درمیان شان دار مثالی ازدواجی تعلقات ہیں۔
"نہیں....." بہت ضبط سے منصور نے جواب دیا تھا۔
"چلو تم بھی مل لینا ان سے اور ذرا طریقے سے بات بھی کر لینا تمہیں زیادہ پتا ہے، ان باتوں کا۔" کسی خیال رکھنے والی وفادار بیوی کا رول نبھا رہی تھی کمینی۔ جیسے میں ہی اس کا سب کچھ ہوں اور اتنے سالوں سے

معمولی سے قرضے کے پیپرز کیسے سینے سے لگا کر بیٹھی تھی صرف اس دن کے انتظار میں۔"
منصور کے دل میں غصہ، نفرت، بیزاری بڑھتی جارہی تھی، وہ اب اس عورت کو برداشت نہیں کر پا رہا تھا۔

☆☆☆

"ادھر دیکھو، سامنے آئینے میں۔" وہ جو اپنا کوٹ ہینگ کر کے مڑنے لگا تھا۔ ثمینہ نے ایک دم سے اسے بازو سے پکڑ کر اپنے ساتھ آئینے کے سامنے کھڑا کر دیا تھا۔
"بتاؤ، کیا کمی ہے مجھ میں۔" اس کی آنکھوں میں وحشت آئینے کے عکس میں بھی نمایاں تھی۔
حیدر نے ہونٹ جیسے سی رکھے تھے، شاید وہ اسے کوئی جواب نہیں دینا چاہتا تھا۔
"تم سے گڈلکنگ ہوں، اسمارٹ ہوں، کم عمر ہوں اور لوگ کہتے ہیں میں جو بھی لباس پہن لوں، اس لباس کی شان میری خوب صورتی کی وجہ سے بڑھ جاتی ہے۔" اس کے لہجے میں غرور ہی غرور تھا۔
"ٹھیک کہتے ہیں لوگ۔" حیدر کے لہجے میں زمانے بھر کی تھکن تھی۔
"اور پھر بھی..... پھر بھی تم اس عام سی شکل کی آوارہ زینب کے پیچھے پاگل....." وہ واقعی جلن اور حسد میں پاگل ہو چکی تھی۔
حیدر کا ہاتھ اس پر اٹھنے لگا جسے اس نے فضا میں ہی روک لیا۔
"مارو..... مارو..... مجھے..... رک کیوں گئے..... اور بھی جتنا غصہ، نفرت، بیزاری اس حرافہ نے تمہارے دل میں میرے لیے بھر دی دی..... نکال دو....."
وہ اس سے زیادہ چیخی تھی، جتنا تھپڑ مارنے پر چیخی۔
"کیا دن رات کا ہنگامہ مچا رکھا ہے آپ دونوں نے، اس گھر میں۔ اس گھر سے تو اچھا ہے میں یہ گھر ہی چھوڑ کر چلا جاؤں، جس میں ایک لمحہ بھی سکون کا نصیب نہیں۔" بلال ابھی گھر میں داخل ہوا تھا اور ثمینہ کی چیخی آواز نے اس کی فرسٹریشن بڑھا دی تھی۔
"ہاں تو پوچھو اپنے اس عمر رسیدہ ٹھرکی باپ سے، جس کا دل اس عمر میں بھی اس زینب سے نہیں بھرتا۔"
ثمینہ کو اب نہ کسی کا لحاظ تھا نہ ڈر، خوف، نہ جوان بیٹے کی شرم یا کچھ چھپانے، بھرم کی تمنا۔
"ماما خدا کے لیے۔" بلال نے زور دینے والے انداز میں اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیئے تھے۔
"میرے آگے نہیں، اپنے اس باپ کے آگے جوڑو ہاتھ۔ اس سے پوچھو، یہ کیا چاہتا ہے۔ اس عمر میں اسے اپنے دفتر کے بند کمرے میں بٹھا بٹھا کر کیا منصوبے بنا رہا ہے عیاشی کے۔" ثمینہ کے لہجے میں نفرت ہی نفرت تھی۔
"اپنی زبان کو کنٹرول کرو۔" حیدر کا ضبط چیخ گیا۔
"میں زبان کنٹرول کروں، تمہارا تو نفس، دل، دماغ کچھ بھی تو قابو میں نہیں۔" وہ دو بدو چلائی۔ لڑاکا عورتوں کی طرح ہاتھ فضا میں لہرا رہی تھی۔ بلال چہرے پر بے چارگی لیے پلکیں جھپکائے بغیر دیکھتا جا رہا تھا۔
ان دونوں کے مزاج تو آگ اور پانی جیسے تھے، کبھی مل تو سکتے نہیں تھے لیکن وہ باقی کی زندگی کم سے کم ایک دوسرے کو مخاطب کیے بغیر اگر کسی طرح گزار سکیں تو شاید اس گھر کے در و دیوار اس بھیانک چیخ و پکار سے محفوظ ہو سکیں۔
"تم چاہتی کیا ہو؟" حیدر کے لہجے میں زمانے بھر کی بے بسی تھی، بلال باپ کی بے چارگی پر دل مسوس کر رہ گیا۔
"تم مجھے چھوڑنا چاہتے ہو، اس زینب کو اپنانے کے لیے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"
ثمینہ کتنے صلح جو انداز میں اتنی بڑی بات کہہ رہی تھی۔
"مگر میرے بیٹے کی قسمت کا فیصلہ تم اس آوارہ عورت کی بدچلن بیٹی کے ساتھ نہیں جوڑو گے۔" وہ بازو

سے بلال کو پکڑ کر پورے استحقاق سے اعلان کر رہی تھی۔
اور حیدر کی کنپٹیاں اس کی شر انگیز بکواس پر پھڑ پھڑانے لگیں۔ وہ ضبط کی انتہا پر تھا۔
"ماما!" بلال خود ششدر رہ گیا۔ اس سارے قصے میں اس کا ذکر کہاں سے آ گیا۔
"آپ اپنے لیے جو بھی کہیں مگر زینب آنٹی اور کشف کے لیے....." وہ غصے میں کانپتی آواز میں بولنے لگا۔
"نا کہیں ہیں دونوں..... زہریلی ناگنیں جنہوں نے میری زندگی ڈسی۔ میرے گھر کا چین سکون بھی زہر آلود کر دیا اور یہ تمہارا بے شرم باپ اس زینب کو اپنے دفتر کے بند کمرے میں بٹھا کر تمہارا رشتہ اس کی لوفر بیٹی کے ساتھ جوڑ رہا تھا جو میں مر کر بھی نہیں ہونے دوں گی۔"
زور سے کچھ گرنے کی آواز آئی تھی۔
ثمینہ کا پاگل پن ٹھٹکا تھا۔
تینوں ایک ساتھ مڑے تھے۔
دروازے میں کشف کھڑی تھی، جس کے ہاتھ سے چابیوں کا گچھا نیچے گرا تھا۔ اس کی آنکھوں میں دنیا بھر کی وحشت تھی۔
بلال آتے ہوئے جو دروازہ ثمینہ کے چیخنے کی وجہ سے کھلا چھوڑ کر آ گیا تھا شاید اسی لیے کشف اندر آ گئی۔
"کشف تم..... آؤ....." بلال نے سوکھے ہونٹوں پر بمشکل زبان پھیر کر تین الفاظ بولے تھے۔
"ثمینہ آنٹی! آپ کو مرنے کی ضرورت نہیں۔ آپ کو اپنی یہ منافقت بھری دوہری زندگی مبارک ہو، جس میں آپ اپنے تعلقات کھلے عام سڑکوں پر لوگوں کو دکھاتی پھرتی ہیں اور غیر مردوں کی بانہوں میں بانہیں ڈالے سرعام گھومنے پھرنے میں نہ تو آپ کو کوئی شرم ہے، نہ آپ پر سوسائٹی، معاشرے کی کوئی حد لگتی ہے کیونکہ آپ کے سر پر اس بے زبان، گونگے، مصلحت پسند شوہر کا سایہ ہے جسے صرف رات گزارنے کے لیے اس سرائے میں آنا ہوتا ہے اور آپ کا یہ مرد بیٹا جسے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ اس کی ماں کتنی غلط عورت ہے۔ بس اس کا گھر میں رہنا اور دنیا دکھانے کو 'ماں' کا رشتہ نبھانے کو موجود رہنا چاہیے۔"
تیز تیز بولتی اس کی سانس پھولتی جا رہی تھی۔
"تم اپنی بکواس....." ثمینہ غرائی۔
"میری بکواس ابھی ختم نہیں ہوئی اور یاد رکھیے گا، جو گندے الزام آپ نے مجھ پر اور میری پاک باز ماں پر لگائے ہیں، ہم تو شاید کبھی آپ کو معاف کر دیں مگر قدرت اور وقت آپ کو کبھی معاف نہیں کرے گا۔" اس کے گلے میں کچھ پھنسنے لگا تھا۔
"اور آخری بات..... آج کے بعد حیدر انکل آپ مجھ سے، آنی سے کبھی کوئی رابطہ نہیں رکھیں گے اور آپ کیا اس رشتے سے انکار کریں گی، میں خود آپ کے بیٹے کو یہاں کھڑے کھڑے علی اعلان ہر تعلق، ہر رشتے سے ریجیکٹ کرتی ہوں۔ مجھے دنیا کے ہر احساس سے بڑھ کر عزت پیاری ہے اپنی اور اپنی ماں کی اور معاف کیجیے گا ثمینہ آنٹی! آپ جیسی عورتیں جو روز اپنے شوہر کی غیرت، اس کی عزت کا جنازہ نکالتی ہوں، ان کو اس عزت کا مطلب بھی نہیں معلوم۔" ثمینہ کا چہرہ غصے میں لال ہوتا جا رہا تھا۔
کشف نے ایک نفرت بھری نظر تینوں پر ڈالی اور اندھا دھند وہاں سے بھاگتی ہوئی چلی گئی۔
اسے یاد نہیں رہا کہ وہ صالحہ کی الماری کی چابیاں وہیں گرا آئی ہے جو اس نے صبح اسے آتے ہوئے دی تھیں کہ اس کا کچھ ضروری سامان اور کپڑے وغیرہ الماری سے نکال کر لے آئے۔
وہ یہی کرنے کے لیے آئی تھی اور اپنی زندگی کی سب سے ڈراؤنی شکل دیکھ کر بھاگ آئی تھی۔

وہ بس اسٹاپ چھوڑ کر پیدل ہی تقریباً بھاگتے ہوئے چلتی جارہی تھی۔ سورج تقریباً ڈوب چکا تھا۔ نیم اندھیرا، نیم روشنی اسے کچھ بھی ڈھنگ سے سجھائی نہیں دے رہا تھا۔

بار بار دھند کی چادر آنکھوں کے سامنے تن رہی تھی۔

وہ آنکھیں رگڑتی بس ایک ہی سمت میں چلتی جارہی تھی۔

☆☆☆

کمرے میں گھپ اندھیرا تھا۔

اور دروازہ نیم کھلا تھا۔

''سلیمان..... بیٹا! تم کہاں ہو؟'' شائستہ دروازے کے پاس رک کر کچھ پریشانی سے بولیں۔

جواب میں خاموشی پر انہوں نے آگے بڑھ کر کمرے کی لائٹ آن کی۔ دودھیا روشنی سارے میں پھیل گئی تھی۔

سلیمان اس اندھیرے میں کھڑکی کے پاس پڑی کرسی پر آنکھیں بند کیے، گردن کرسی سے لگائے بالکل ساکت بیٹھا تھا۔

وہ لمحہ بھر کچھ سمجھ نہیں پائیں۔

''سلیمان کیا ہوا ہے؟ تم اس طرح اندھیرا کر کے کیوں بیٹھے ہو۔ میری جان؟'' وہ کچھ ڈرتی ڈرتی اس کے قریب آئی تھیں۔

سلیمان نے کوئی جواب دیے بغیر آنکھیں کھول کر ماں کو دیکھا تھا۔

لال بوٹی جیسی آنکھیں.....

شائستہ کچھ گھبرا سی گئیں۔

''تم ٹھیک ہو ناں؟'' آہستہ سے کہہ کر انہوں نے سلیمان کی پیشانی کو یخ ہاتھوں سے چھوا، جو آگ کی طرح تپ رہی تھی۔

''میرے خدا تمہیں تو تیز بخار ہے اور تم نے مجھے بتایا بھی نہیں کال کر کے۔''

وہ ایک دم سے گھبرا گئیں۔

''ٹھیک ہوں میں۔'' سلیمان کو اپنی آواز بھی اجنبی سی لگی۔

''بالکل بھی ٹھیک نہیں ہو۔ اٹھو فوراً..... میں تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے کر چلتی ہوں۔''

وہ فون میں کوئی نمبر تلاشنے لگیں۔

''ماما! میں بالکل ٹھیک ہوں، یوں ہی سر میں درد تھا۔ کوئی پین کلر لوں گا تو ٹھیک ہو جاؤں گا۔''

وہ نرمی سے ماں کا ہاتھ پکڑ کر بولا۔

''کیسے ٹھیک ہو جاؤ گے۔ بہت زیادہ ٹمپریچر لگ رہا ہے۔ ڈاکٹر کو چیک کروانا ضروری ہے۔'' وہ نرمی سے پھر اس کی گردن، ماتھا چھو کر فکر مندی سے کہنے لگیں۔

''آئی ایم فائن مام! بلیوی۔'' وہ کچھ چڑ گیا۔

وہ اسے جیسے غور سے دیکھنے لگیں۔

''تم ردا کی طرف بھی نہیں گئے۔ سونیا بھابھی کی کال بھی آئی تھی۔ وہ لوگ تمہارا ویٹ کر رہے تھے۔ تم نے شاید ردا کے ساتھ جانا بھی تھا کسی خریداری کے لیے۔ تمہیں فون نہیں آیا۔''

وہ اس کے قریب بیٹھ گئیں جیسے اس کے تاثرات پڑھنے کی کوشش کر رہی ہو۔

''آیا تھا، میں نے منع کر دیا۔ دل نہیں چاہ رہا تھا۔''

وہ ماں کی تیز نظروں سے خائف ہو کر ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔

☆☆☆

ردا نے دو بار کال کی مگر سلیمان نے نہ تو کال ریسیو کی نہ اسے جواباً فون کیا۔

جانے کیوں دل بڑے بڑے سانس پاس کر رہا تھا۔ اس وقت اسے شدت سے خواہش ہو رہی تھی سلیمان اس سے بات کرے۔ بھلے فارمل ہی سہی مگر ایک بار ردا اس کی آواز سن لے۔ وہ پریشان سی فون رکھ کر بیٹھ گئی۔

اس وقت رمشا چائے کے دو مگ لے کر آ گئی۔

"ہو گئی بات سلیمان بھائی سے؟" اس نے شوخی سے جیسے چھیڑا۔

"نہیں، وہ شاید کہیں بزی ہیں۔ کال ریسیو نہیں کر رہے۔" ردا نے سرسری لہجے میں کہتے ہوئے مگ ہونٹوں سے لگایا۔

"تو دوبارہ کر لو آپی!" رمشا مسکرا کر بولی۔

"نہیں اچھا نہیں لگتا، وہ دیکھیں گے تو خود ہی کر لیں گے۔"

"کم آن آپی! نکاح ہو چکا ہے یار آپ دونوں کا، اب کیسی فارمیلٹی آپ تو دھونس، زبردستی بھی کر سکتی ہو، اب تو بیویوں والی۔" وہ پھر سے اسے اکسانے لگی۔

"یہی تو بات ہے، اب نکاح ہو گیا ہے تو زیادہ محتاط ہونے کی ضرورت ہے۔" ردا سنجیدگی سے بولی۔

"خدا کے لیے آپی اب تو اپنے اس فلسفیانہ موڈ سے باہر آ جاؤ۔" رمشا چڑ کر رہ گئی۔

"تمہاری کشف سے بات ہوئی؟" ردا موضوع بدلنے کو بولی۔

رمشا ایک دم سے چپ کر گئی۔

"نہیں۔" وہ دھیرے سے بولی۔

"اور سچ پوچھو تو میری ہمت بھی نہیں ہوئی اس سے بات کرنے کی یا اسے کال کرنے کی۔" رمشا آہ بھر کر بولی۔

"میں نے اسے فون کیا تھا نکاح سے پہلے۔" ردا ہولے سے بولی۔

"پھر بات ہوئی تمہاری کیا کہہ رہی تھی؟" رمشا بے چینی سے بولی۔

ردا افسوس بھرے انداز میں نفی میں سر ہلایا۔

"اس نے کال ہی ریسیو نہیں کی تو بات کیا ہوتی اور رمشا میرے خیال میں وہ اپنی جگہ درست ہے۔" ردا اداس تھی۔

"اس لیے تو میں نے کال نہیں کی..... کتنے پلان بنائے تھے ہم دونوں نے کس طرح شادی کے سارے فنکشنز انجوائے کریں گے۔ وہ اتنی اچھی مہندی لگاتی ہے۔ یہ میری دوست نے ذرا بھی اچھی نہیں لگائی ہے نا۔" وہ اپنے مہندی کے بیل بوٹوں سے سجے ہاتھ ردا کے سامنے پھیلاتے ہوئے بولی مہندی کا ڈیزائن واقعی اچھا نہیں تھا۔

"نہیں، اچھی ہے۔" وہ اس کا دل رکھنے کو بولی۔

"ویسے آپی یار! تم بہت لکی ہو۔ سلیمان بھائی بہت شان دار ہیں۔ تم دونوں کا کپل ایک دم پرفیکٹ ہے۔ سچ جتنی شاندار تصویریں اور وڈیو بنی ہے، دیکھنے میں تم دونوں اس سے بھی پیارے لگ رہے تھے۔ میرا دل چاہ رہا ہے میں جا کر یہ سب کچھ کشف کو دکھاؤں مگر۔" وہ چپ ہو گئی۔

"نہیں رہنے دو۔" ردا کہہ کر کسی سوچ میں گم چائے کے گھونٹ بھرنے لگی۔

☆☆☆

''کشف کیا ہو گیا ہے، کیوں اس طرح آتے ہی کمرے میں پڑ گئی ہو؟ کھانا بھی نہیں کھا رہیں تم۔''
زینب تیز تیز بولتی کمرے میں آ کر لائٹ جلاتے ہوئے اونچی آواز میں بولی تھی۔
کشف نے جلدی سے اپنا چہرہ اور آنکھیں صاف کیں۔
''کیوں مجھے ہر وقت تنگ کرنے لگی ہو، کب سے بیٹھی ہوں میں تمہارے انتظار میں کھانے کے لیے اور تم آتے ہی کمرے میں گھس گئی ہو، طبیعت تو ٹھیک ہے نا تمہاری۔''
وہ اس کے ساتھ لگ کر بیٹھتے ہوئے ہاتھ بڑھا کر اس کی پیشانی چومنے لگی۔
وہ ایک دم سے تڑپ کر اٹھی تھی۔
''کیوں جاتی ہیں آپ حیدر انکل سے ملنے ان کے آفس میں۔ ایسی کون سی بات ہے جو فون پر یا یہاں گھر میں نہیں ہو سکتی آپ کی ان کے ساتھ۔'' وہ ہسٹریائی انداز میں چیخی تھی۔
اور زینب تو اس کا سوال سن کر ہی سناٹے میں آ گئی۔ حیدر کے آفس میں جو کچھ ہوا تھا کشف کو کہیں سے پتا چل گیا ہے کیا؟ وہ حقیقتاً پریشان ہو گئی تھی۔
''کیا کہہ رہی ہو تم۔ معلوم ہے تمہیں؟'' وہ نظریں چرا کر کچھ گڑبڑا کر بولی تھی۔
''بس دعا کریں۔ میں وہ نہ کہوں جو وہاں ہوا تھا اور جسے شاید آپ سن بھی نہ سکیں۔''
کشف کی اگلی بات پچھلی سے بھی زیادہ دل دہلا دینے والی تھی۔
''کشف!'' اس کے صرف ہونٹ ہلے تھے۔
''کیا تعلق ہے آپ کا حیدر انکل سے؟'' وہ زناٹے سے بولی تھی اور زینب کا ہاتھ اس پہ اٹھتے اٹھتے رکا تھا۔
''کیا بول رہی ہو تم؟ ہوش میں ہو۔'' وہ تلخی سے فقط یہی کہہ سکی۔
''کاش یہ سب میں اس وقت زبان پر لے آتی جب میرے دل دماغ میں یہ سوال بننے شروع ہوئے تھے۔'' وہ ماں کے بے بس چہرے پر نظریں جما کر بولی۔
''کشف! مجھے بتاؤ کس نے کیا کہا ہے تم سے۔'' وہ حوصلہ کر کے سیدھی ہو کر اس کی طرف مڑی۔
''حوصلہ ہے آپ میں اتنا، یہ سب سننے کا پھر تو میں آپ کو داد دوں گی جو آپ نے ثمینہ آنٹی کی وہ ساری غلیظ بکواس سن کر بھی چہرے پر ذرا سا ملال ظاہر نہیں ہونے دیا۔'' وہ جیسے تاک کر نشانے لگا رہی تھی۔
''تم ثمینہ کے پاس گئی تھیں؟'' وہ اپنی جگہ سے ہل کر رہ گئی۔
''مجھے اس عورت کے منہ لگنے کا شوق نہیں مگر وہ جو کچھ ہم دونوں کے متعلق کہہ رہی تھی۔ کاش وہ سب سننے سے پہلے میں زمین میں دفن ہو جاتی مگر اب میں سوچ رہی ہوں کہ وہ کچھ ایسی غلط بھی تو نہیں۔''
کشف کی نظریں زینب پہ جمی تھیں۔
''کشف تم نے اس کی باتوں پر یقین کر لیا۔''
زینب کے لہجے میں بے یقینی تھی۔
''بے یقینی کی کوئی وجہ بھی تو نہیں تھی۔'' کشف یک دم بھرے ہوئے لہجے میں بولی تھی۔
''اس بات کا تو مجھے پہلے سے بھی یقین تھا آنی! کہ ہم جیسی عورتیں جن کے سر پر کسی مرد کا سائبان نہیں ہوتا۔ کسی مرد کی غیرت کا جنہیں سہارا نہیں ہوتا ان کے بارے میں معاشرے کی زبان بہت کھلی ہوتی ہے اسے کچھ بھی کہہ دینے کا حق حاصل ہوتا ہے۔'' وہ بہت دکھی سی ہو کر بول رہی تھی۔
اور زینب کا جی چاہا وہ اپنی اس معصوم محروم بیٹی کو اپنے سینے میں چھپا کر اس دنیا سے کہیں دور بہت دور لے جائے۔

''ایسا نہیں ہے میری بیٹی! ہمارا کردار، ہماری پاکیزگی اور ہماری مضبوطی معاشرے کی ان کھلی اور گندی زبان کا جواب ہے۔'' وہ اسے حوصلہ دینے کو اپنے ساتھ لگا کر بولی تھی۔

''وہی تو نہیں ہے ہمارے پاس نہ پاکیزگی نہ کردار کی مضبوطی۔'' وہ سخت خود ترسی کے عالم میں تھی۔

''کشف! ہوش میں ہو تم، ہمارا خدا جانتا ہے گواہ ہے۔'' وہ جذباتی ہونے لگی۔

''خدا جانتا ہے، دنیا تو نہیں اور خدا کبھی گواہی دینے زمین پر نہیں اترے گا نا۔'' وہ بہکے ہوئے انداز میں بول رہی تھی۔

زینب کو اس کی ذہنی حالت پہ شبہ سا ہوا۔

''کفر کے کلمے مت نکالو منہ سے..... اس عورت کی وجہ سے۔'' زینب اسے سختی سے ٹوکنے لگی۔

''اس عورت کی وجہ سے نہیں، اس مرد کی وجہ سے ہم دونوں اس معاشرتی عتاب کا نشانہ بن رہی ہیں آنی! جو ہمیں بے سہارا چھوڑ کر چلا گیا۔'' وہ تنفر سے بولی۔

زینب نے چونک کر اسے دیکھا اور ہونٹ بھینچ لیے۔

''اچھا کھانے سے کیا لڑائی ہے؟'' کچھ دیر کی خاموشی کے بعد زینب کو لگا، وہ اپنے جذباتی پن پر کچھ قابو پا چکی ہے تو نرمی سے بولی۔

''آپ وہاں بابا سے ملیں اور مجھ سے جھوٹ بولتی رہیں۔'' وہ جیسے پھٹ پڑنے والے انداز میں چیخی تھی۔

''کشف! ایسا نہیں ہے میں تمہیں کیسے سمجھاؤں۔'' زینب بے بسی سے بولی تھی۔ کشف شکایت بھرے انداز میں اسے دیکھتی رہی۔

''کیا چھپانا چاہتی ہیں مجھ سے اور کب تک، میں کوئی چھوٹی بچی نہیں ہوں۔ اگر وہ آپ سے مل سکتے ہیں تو مجھ سے کیوں نہیں۔'' وہ تیز لہجے میں بولی۔

''کاش میں تمہیں سمجھا سکتی، یہ سب جس طرح سے ہو رہا ہے اسے ہونے دو میں تو تمہارے ساتھ ہوں ناں۔''

''صرف اس لیے کہ ان کو ایک سیف کارنر ملا ہے کسی کو پتا نہ چلے کہ وہ ایک بے وفا شخص ہی نہیں ایک قاتل بھی ہیں اور آپ ان کے جرم پر پردہ ڈال رہی ہیں۔'' زینب کا منہ کھلا رہ گیا۔

☆☆☆

میرے راستے میں شجر کوئی نہ تھا
سائے تھے ہمراہ اور بشر کوئی نہ تھا
ریت کے ذروں کی طرح اڑتے پھرتے ہیں
میرے قبیلے کے لوگوں کا شہر کوئی نہ تھا
یونہی بات بڑھانے کو وہ مجھ سے الجھ پڑا
ورنہ محبت سا مسئلہ تو زیر نظر کوئی نہ تھا
دریا شہروں کی حد تک امڈ آئے ہیں
اور لہروں کا ہمسفر کوئی نہ تھا!

نیند آج بھی اس کی آنکھوں سے کوسوں نہیں میلوں دور تھی! اور اس وقت اسے نیند کی کوئی تمنا بھی نہیں تھی وہ بہت ساری سوچوں میں الجھا ہوا تھا۔

کسی بھی سوچ کا سرا ہاتھ نہیں آ رہا تھا۔

''مجھے یہ سب کچھ کشف سے نہیں کہنا چاہیے تھا۔'' بار بار ان سوچوں کے دھاگوں میں سب سے الجھا ہوا

گرہ لگا یہ دھاگا اسے الجھانے لگتا۔
''اب بھی اگر اس سے یہ بات نہیں کرتا تو شاید سب کچھ ختم ہو جاتا۔''
''ختم تو یوں بھی ہو جائے گا جب وہ کل میرے پرپوزل کو ٹھکرا دے گی۔'' کسی نے اس کے اندر سے چلا کر کہا تھا۔
جی چاہ رہا تھا کشف کو کال کر کے جاننے کی کوشش تو کرے، وہ اس وقت کیا سوچ رہی ہے۔ وہ اسے قبول کرنے جا رہی ہے یا چھوڑنے؟ لیکن دوبارہ فون ہاتھ میں لے کر رکھ دیا۔
''نہیں مجھے ابھی اس کی سوچوں پر اثر انداز نہیں ہونا اسے جو بھی فیصلہ کرنا ہوگا اسے خود کرنا چاہیے۔'' آخر میں اس نے فون اٹھا کر ریک پر رکھا اور خود کو سمجھا لیا۔
اسی وقت فون بجنے لگا، وہ ٹھٹک گیا۔
کیا وہ بھی میری طرح الجھ رہی ہے۔'' وہ فون ہاتھ میں لیتے ہوئے سوچنے لگا۔
زریں کی کال تھی، وہ چونک گیا۔
''موحد! میں تمہیں سرپرائز دینا چاہ رہی تھی ابھی یہ بات تمہیں بتانا نہیں چاہتی تھی میں بالکل بھی۔''
زریں کے جوش بھرے لہجے پر موحد بے اختیار ٹھٹکا تھا۔
''آپ یہاں آ رہی ہیں پاکستان۔'' اس نے خدشے بھرے دل کے ساتھ بے ساختہ ہی پوچھا تھا۔
''موحد! میرا بیٹا میری جان تم نے کیسے یہ بات بوجھ لی، منصور نے کال کی تھی تمہیں۔ اس نے بتایا ہوگا اس میں ہی صبر نہیں ہے۔'' وہ جوش میں بولتے ہوئے بھول چکی تھی کہ منصور اور موحد میں ایسا کوئی تعلق نہیں کہ وہ اس طرح کی باتیں ایک دوسرے سے کر سکیں۔
''کب آ رہے ہیں آپ لوگ۔'' موحد نے ٹھنڈا سانس لے کر بجھے دل سے پوچھا۔
''اور اب کشف کا جواب ہر صورت میں ہاں ہونا چاہیے۔'' وہ زریں کی کوئی بات نہیں سن رہا تھا۔ اس کی سوئی اس ایک بات پہ اٹک گئی تھی۔
''اگر کشف کو یہ پتا چل گیا تو نہیں، نہیں ابھی اسے یہ بات نہیں معلوم ہونا چاہیے۔''
وہ جلدی جلدی کشف کو قائل کرنے کی ترکیب سوچنے لگا۔

☆☆☆

''کشف! کون ہے جو تمہارے دماغ میں ایسی فضول خرافات بھرتا ہے جو تمہارے جی میں آتا ہے تم بغیر سوچے سمجھے بولتی جاتی ہو۔''
زینب سکتے سے نکلتے ہی بھڑک اٹھی تھی۔
''آپ یہ جانتی ہیں ناں کہ انہوں نے ڈاکٹر موحد کے والد کو قتل کیا تھا۔'' وہ بغیر پلکیں جھپکائے پورے اعتماد سے کہہ رہی تھی۔
یہ انکشاف زینب کے لیے اور بھی خوف ناک تھا۔
''یہ..... یہ کیا کہہ رہی ہو کشف! خدا جانتا ہے مجھے یہ نہیں معلوم ہا لکل بھی۔'' زینب بہت زیادہ پریشان ہو گئی تھی۔
''تمہیں یہ سب موحد نے بتایا ہے؟'' اسے پہلا خیال یہی آیا تھا۔
''وہ جیل میں بھی رہے تھے۔ معلوم ہے نا آپ کو؟'' وہ اسی تند لہجے میں جتاتے ہوئے کہہ رہی تھی۔
اور زینب تو جیسے سارے سوال جواب بھول گئی تھی۔

''مجھے کچھ عرصے جیل میں رہنا پڑا اس لیگل تھا میں، ہاں تو اس لیے کسی سے بھی کانٹیکٹ نہیں کر سکا تھا۔''
زینب کے کانوں میں منصور کی آواز گونج رہی تھی۔
''تو اس کی وجہ یہ تھی، میرے خدایا میں نے کس غفلت میں ساری عمر گزار دی۔'' زینب کو خود پر رونا بھی آ رہا تھا اور غصہ بھی۔
''آپ کو کچھ سمجھ میں آئے یا نہیں مجھے ایک بات اچھی طرح سے سمجھ میں آ گئی ہے کہ اس معاشرے میں باعزت زندگی گزارنے کے لیے عورت کے ماتھے پہ کسی مرد کی ملکیت کا لیبل ہونا ضروری ہے تو ہی وہ یہاں اپنی مرضی سے سانس لے سکتی ہے۔ ورنہ یہ سوسائٹی اسے ایک گالی بنا دیتی ہے۔'' وہ تیز تیز بولتی زینب کو جتاتی نظروں سے دیکھتی اٹھ کر باہر نکل گئی تھی۔
اور زینب عقل کی اندھی کوڑھ مغز نکلی تھی ساری عمر گنوا کر بھی اسے یہ بات سمجھ میں نہیں آئی تھی۔
وہ تو محبت پر اندھے اعتقاد کے ہاتھوں ماری گئی۔
''سب دھوکا دے سکتے ہیں آپ کو محبت آپ کو دھوکا نہیں دے سکتی وہ وقتی مصلحتوں کا شکار ہو کر بے وفا کہلا سکتی ہے مگر دھوکا نہیں دے سکتی۔'' کئی سال بعد اس کا دل قدرے گھڑی اس رٹی رٹائی تھیوری پر خود کو تھپکیاں دے رہا ہے۔
اور دھوکا تو اس نے پہلے بھی دیا تھا زریں سے شادی کر کے، مگر یہ سب قتل ڈاکٹر موحد کے والد کا۔'' وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔
''مگر یہ موحد کی خود سے گھڑی کہانی بھی تو ہو سکتی ہے جو اس نے کشف کو سنائی ہو۔'' وہ بے چین سی اٹھ کر باہر نکل گئی۔

☆☆☆

ردا بغیر اطلاع دیے اپنے سامنے کھڑے سلیمان کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔
اس نے ذرا جھک کر کندھوں پر پڑا دوپٹہ ہاتھ سے اٹھا کر سر پر لینا چاہا سلیمان یک ٹک اس کو دیکھتا جا رہا تھا۔
اس نے ردا کا دوپٹہ ہاتھ سے پرے سرکا کر اس کا گردن کے زخم کی طرف معنی خیز انداز میں اشارہ کیا تھا۔
''وہ بتایا تھا نا میں گر گئی تھی تو۔'' وہ جھجک کر پھر سے زخم کو ڈھانپتے ہوئے آہستگی سے وضاحت دینے لگی۔
''اس روز یہ زخم لگا تھا نا تمہاری گردن پر جب فرحان تم سے ملنے آیا تھا اور تم گھر میں اکیلی تھیں۔ فرحان تمہاری ایکس محبت ایم آئی رائٹ۔'' اور ردا سفید پڑتے چہرے کے ساتھ اس کو دیکھتی چلی گئی۔

☆☆☆

دونوں ریسٹورنٹ کی میز پر آمنے سامنے بیٹھے تھے کشف کا چہرہ بے تاثر تھا۔ وہ اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو آپس میں جکڑے اپنے ذہنی اضطراب کو بظاہر چھپانے میں کامیاب لگ رہی تھی۔
موحد دلچسپ نگاہوں سے اس کی کیفیت کا شاید حظ اٹھا رہا تھا۔ اگرچہ اس کے دل میں بھی بے چینی کے بھنور بل کھا رہے تھے دونوں ہی شاید کسی ایک سے پہلے بولنے کے منتظر تھے۔
کشف میں نے رات بہت مشکل سے کاٹی ہے، میری زندگی کی ایک مشکل ترین رات اور اب مزید انتظار نہیں ہوتا تم نے کیا فیصلہ کیا ہے میرے پروپوزل کے بارے میں؟''
وہ بے چینی سے بولا۔ کشف کا چہرہ ابھی بھی بے تاثر تھا۔

☆☆

خاندان بھر کی نوجوان پارٹی ہر سال بھرپور جوش وخروش سے ''ہیپی نیو ایئر'' منانے کی عادی تھی۔ دسمبر کی آخری شام وہ سب کسی ایک کزن کے گھر جمع ہو جاتے۔ خوب ہنگامہ کیا جاتا۔ ایک دوسرے کو کارڈز اور تحائف دے کر دوش کیا جاتا۔ غبارے پھوڑے جاتے اور رات بھر کچن میں انہی ہی ایجاد کردہ رنگ برنگی ڈشز بنائی جاتیں۔ کچھ مارکیٹ سے آرڈر کیا جاتا۔ اچھی خاصی موج مستی کے بعد صبح ہوتے ہی تھک ہار کر بے سدھ سو جاتے۔ دادی جان چیختی رہ جاتیں۔

''ارے کم بختوں! جہاں اتنا غل غپاڑہ کیا ہے۔ وہاں اپنے رب کے حضور بھی دو نفل شکرانے کے پڑھ لو جس نے سارا سال اتنی نعمتوں اور صحت وتندرستی سے نوازا ہے۔'' مگر سب کے سب کان لپیٹے سوئے رہتے۔

☆☆☆

خاندان کے تعلیم یافتہ اور روشن خیال بڑوں کو بھی بچوں کی اس سرگرمی پر کوئی خاص اعتراض نہ تھا۔ وہ آج کل کے نازک حالات اور نوجوان نسل کی

حُمیرا شفیع

ہیپی نیو ایئر

نفسیات سے کسی نہ کسی حد تک آگاہ تھے۔ ان کا نقطہ نظر یہ تھا کہ اگر بچوں کے جوش وخروش اور جذبات کی نکاسی کے لیے کوئی مثبت راہ فراہم کر دی جائے تو وہ منفی مشغلوں میں مبتلا ہونے سے محفوظ رہتے ہیں۔ بجائے اس کے کہ وہ سڑکوں پر ون ویلنگ کرتے پھریں۔ ہوائی فائرنگ کریں یا پھر موٹر سائیکل پر ایک دوسرے کو ٹکریں مارتے ہوئے اسپتال یا پھر جیل جائیں۔ اس سے ہزار درجے بہتر تھا کہ وہ گھر پر ہی تھوڑا بہت گلا کر لیں۔ کم از کم وہ گھر کی چار دیواری میں ان کے سامنے تو ہوں گے۔

☆☆☆

دسمبر کا آخری ہفتہ چل رہا تھا۔ اس بار قرعہ فال ارشد کے گھر کا نکلا تھا۔ اس لیے آج تقریباً تمام نوجوان کزنز کا ٹولہ وہاں جمع تھا۔ ڈرائنگ روم سے بھانت بھانت کی آوازیں آرہی تھیں ہر کوئی سال نو کو نئے انداز سے خوش آمدید کہنے کے لیے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کر رہا تھا۔ اس بار سب سے زیادہ جوش زیبی اور

وقار تھے۔ زیبی پچھلے سال ڈینگی بخار کا شکار ہو کر بستر پر پڑی تھی۔ اس لیے پارٹی میں شرکت سے محروم رہ گئی تھی۔ اور وقار انٹری ٹیسٹ کی تیاری میں جتا ہوا تھا۔ اور اب جبکہ اس کا میڈیکل کالج میں داخلہ ہو چکا تھا۔ اس لیے وہ بھی بھرپور طریقے سے اپنے کزنز کے ساتھ انجوائے کرنے کے موڈ میں تھا۔

سب اپنی اپنی رائے دے رہے تھے۔ کوئی کسی کی نہیں سن رہا تھا۔ عالیہ خاموشی سے ایک کونے میں بیٹھی کارڈز لکھ رہی تھی۔ وہ فائن آرٹس کی طالبہ تھی۔ اس کی لکھائی اور ڈرائنگ دونوں کمال کی تھیں۔ اس لیے کارڈز تیار کرنے کا شعبہ اس کا تھا۔ وہ کارڈز لکھنے کے ساتھ ساتھ مختلف اسٹون، موتیوں اور ربن سے ان کو سجا بھی رہی تھی۔ اس لیے راشد نے ایک بڑا گلو کا ڈبہ لا کر رکھ دیا تھا۔

جب وہ تھوڑا تھک گئی تو اس نے اپنی پوزیشن تبدیل کی۔ بے دھیانی میں اس کے گھیر دار فراک کا پچھلا حصہ گلو کے ڈبے پر آ گرا۔ اس کے ڈھکن پر جمی ساری گلو پھیلی ہوئی تھی۔ اس لیے فراک کا وہ حصہ اس کے ساتھ چپک گیا۔ وہ کسی کام سے کھڑی ہوئی تو کچھ وزنی سا محسوس ہونے پر جب اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو بے ساختہ منہ سے چیخ نکل گئی۔ فراک کے پچھلے کونے سے گلو کا وہ ڈبہ جھول رہا تھا۔ باقی تمام لوگ ہنسنے لگے۔ اس نے ڈبا کو فراک سے الگ کرنے کی بہتیری کوشش کی مگر بے سود، وہ بری طرح سے چپکا ہوا تھا۔

"قینچی لے کر کاٹ ڈالو۔" کسی نے مشورہ دیا۔

"ہائے نہیں..... میرا نیا فراک ہے۔ مما بہت ناراض ہوں گی۔" وہ روہانسی ہو گئی۔

"تائی اماں کی مساج مشین پڑی ہو گی۔ ایسا کرتے ہیں اس سے اس حصے کو حرارت پہنچاتے ہیں۔ گرمی سے گلو پگھل جائے گی اور فراک چھوڑ دے گی۔"

ایک انجینئر کزن نے نادر مشورہ دیا۔ راشد فوراً اسٹور روم میں چلا گیا جہاں اماں الماری میں مساج مشین رکھتی تھی۔ اگرچہ ان کے انتقال کو تین سال ہو گئے تھے مگر ان کی تمام چیزیں حفاظت سے اس الماری میں محفوظ کر دی گئی تھیں۔ اس نے الماری کھولی اور مشین ڈھونڈنے کے لیے ادھر ادھر ہاتھ مارے۔ اسی الٹ پلٹ کے دوران اوپری شیلف سے ایک براؤن کلر کی فائل نیچے آ گری اور اس میں موجود کچھ کاغذ اور نیلے رنگ کے لفافے نکل کر فرش پر گر پڑے۔ ایک لفافے پر تو ایڈریس تک درج تھا۔ شاید پوسٹ ہونے سے رہ گیا تھا۔

اماں کی لکھائی دیکھ کر اس کے دل میں ایک ہوک سی اٹھی۔ آنکھوں کے گوشے نم ہو گئے۔ مگر فی الحال ہنگامی صورت حال تھی۔ زیادہ جذباتی ہونے کا وقت نہیں تھا اس نے جلدی سے فائل میں تمام کاغذات رکھے۔ اسے احتیاط سے دوبارہ الماری میں ڈالا۔ مساج مشین ڈھونڈی اور واپس ڈرائنگ روم چلا آیا۔

زیبی نے مساج مشین کا سوئچ آن کیا اور پھر آہستگی سے فراک کے چپکے ہوئے کونے پر پھیرنے لگی۔ طریقہ کارگر ثابت ہوا۔ گلو گرم ہو کر پگھل گئی اور فراک آرام سے بغیر کسی نقصان کے چھٹ گئی۔

☆☆☆

رات گئے جب ہنگامہ سرد پڑا اور راشد سونے کے لیے اپنے بیڈ روم میں آیا تو اس کی ذہنی رو بھٹک کر پھر اسی براؤن فائل کی طرف چلی گئی۔ وہ اسٹور روم میں آیا۔ الماری کھول کر فائل نکالی اور پھر بیڈ پر بیٹھ کر دیکھنے لگا۔ فائل میں اماں کے ہاتھوں سے لکھے کچھ ادھورے خطوط اور ڈاک کے نیلے لفافے موجود تھے۔ ان سب سے اسے ماں کے وجود کی مانوس سی خوشبو آ رہی تھی۔

ٹیلی فون، موبائل، نیٹ، فیس بک، واٹس اپ کی دنیا سے کوسوں دور وہ خط و کتاب کی شیدائی تھیں۔ ان کے پلنگ کے پاس دھری گرے رنگ کی میز پر ہر وقت کاغذ قلم اور ڈاک کے نیلے لفافے بکھرے رہتے۔ آتے جاتے اگر کبھی اس کی نظر پڑ جاتی تو وہ بے اختیار ہنس دیتا۔

"اماں جان! دنیا چاند پر پلاٹ خرید نے جا رہی ہے اور آپ ہیں کہ اب تک خطوط کی دنیا میں

جی رہی ہیں۔"

"اور خط بھی کہاں لکھے جاتے ہیں جہاں سے جواب آنے کی بھی توقع نہیں ہوتی۔" چھوٹی فاہا اگر وہاں موجود ہوتی تو ضرور تبصرہ کرتی۔

"ارے بچو! چند ایک ہی تو بوڑھی جانیں رہ گئی ہیں میرے میکے میں..... چھوٹے ماموں..... منجھلی خالہ..... بڑی ممانی اور چھوٹی آپا کی ساس....."

وہ سب بھی تو خط کا جواب لکھنے لکھانے کے لیے تم جیسوں کے محتاج ہیں۔ اگر کوئی پوتا پوتی مہربانی کردے تو جواب بھی آ ہی جاتا ہے۔"

وہ چشمہ صاف کرتے ہوئے تفصیل سے سمجھاتیں۔

"اسی لیے تو کہہ رہے ہیں اماں جانی! کہ فون کرلیا کریں۔ آج کل ہر کمپنی کی طرف سے فری کال کی آفر آتی رہتی ہے۔"

فاہا مزید اصرار کرتی تو وہ دھیما سا مسکراتیں اور پھر اداسی سے گویا ہوتیں۔

"بیٹا! کیا بتاؤں..... چھوٹے ماموں کو تو ہمہ وقت کان کا انفیکشن رہتا ہے۔ ڈاکٹر نے فون سننے سے منع کر رکھا ہے۔

منجھلی خالہ ویسے ہی دمہ کی مریضہ ہیں جو زیادہ لمبی بات نہیں کر پاتیں۔ تھوڑی دیر بعد تو سانس پھول جاتا ہے۔ چھوٹی آپا کی ساس دور اُفتادہ سوات کے ایک گاؤں میں رہتی ہیں۔ وہاں تو سگنلز کا ہی اتنا مسئلہ رہتا ہے۔ آواز کٹ کٹ کر آتی ہے، سمجھ میں ہی نہیں آتا کہ کیا کہہ رہی ہیں۔ ہاں بڑی ممانی سے کبھی کبھار بات چیت ہوتی رہتی ہے۔"

دراصل اماں جان کا تعلق رحیم یار خان کے پاس ایک قصبہ نما شہر کوٹ سبزل سے تھا۔ پہلے ان کا سارا میکہ وہیں رہائش پذیر تھا۔ پھر دونوں ماموں یعنی اماں کے بھائی بیرون ملک چلے گئے۔ وہ خود بیاہ کر لاہور آ گئیں۔ نانا، نانی کا انتقال ہو گیا۔ آنا جانا بھی کم ہوتے ہوتے بالکل ختم ہو گیا۔ مگر اماں جان ابھی تک خط و کتابت کے ذریعے ان رشتے داروں سے جڑی ہوئی تھیں جو ابھی تک وہیں رہتے تھے۔

ان کے ادھورے خطوط سے راشد کو بخوبی اندازہ ہو رہا تھا کہ اس کی اماں کتنی حساس تھیں۔ وہ دلی طور پر اپنے میکے سے جڑی تھیں۔ اگرچہ گھریلو مجبوریوں کی وجہ سے وہ وہاں جا تو نہیں پاتی تھیں مگر خط و کتابت کے ذریعے وہاں رہنے والے غریب اور بیمار رشتہ داروں سے رابطے میں رہتی تھیں۔ ان کی فکر اور تشویش کا دائرہ صرف کوٹ سبزل تک محدود نہ تھا۔ وہ سوات کے ایک گاؤں میں رہنے والی چھوٹی آپا کی ساس کی بھی خطوط کے ذریعے خبر گیری کرتی رہتی تھیں۔ ان کے نام کا بھی ایک ادھورا خط فائل میں موجود تھا۔ غالباً وہ اپنی بیماری کی وجہ سے مکمل نہ کر پائی تھیں۔ ایک مکمل خط بھی موجود تھا۔ جس کو ڈاک کے نیلے لفافے میں ڈال کر ایڈریس تک لکھا جا چکا تھا مگر پوسٹ کروانے کی مہلت نہ مل سکی تھی۔ وہ خط انہوں نے اپنے چھوٹے ماموں کے نام لکھا تھا۔

راشد نے لفافہ چاک کیا خط نکالا اور پڑھنے لگا۔ لکھا تھا

پیارے ماموں جان!

السلام علیکم۔

معذرت خواہ ہوں کہ اس دفعہ خط لکھنے میں کافی تاخیر ہو گئی۔ دراصل انجائنا کا درد بہت بے چین کیے رکھتا ہے۔ آج کچھ طبیعت بحال محسوس ہو رہی ہے تو کاغذ قلم سنبھال کر بیٹھی ہوں۔ ہمت کر کے ایک ایک چھٹی منجھلی خالہ اور بڑی ممانی کے نام بھی لکھ رکھی ہے۔ سننے میں آیا تھا کہ آپ کے ہاں چند روز تک بارشوں کا سلسلہ شروع ہونے کا امکان ہے۔ سردی کی شدت میں بھی اچانک اضافہ ہو جائے گا۔ آپ چھوٹی بہو سے کہہ کر ابھی سے اپنے بھاری لحاف میں ڈورے ڈلوا کر رکھ لیں۔ بچوں کو مصروفیت میں کہاں جلدی خیال آتا ہے۔ خود ہی یاد دہانی کروانی پڑتی ہے۔ پچھلے دنوں جو ڈراپس میں نے آپ کو پارسل کیے تھے۔ وہ باقاعدگی سے کان میں ڈالیں تاکہ انفیکشن بڑھنے نہ پائے۔ فکر نہ کریں۔ ختم ہونے پر

اور بھجوادوں گی۔ آپ کے دونوں چھوٹے نواسے تو بے حد پیارے ہیں۔ راشد نے واٹس ایپ پر تصویر دکھائی تھی۔ ہر سال دسمبر کی چھٹیوں میں آپ کے ہاں آنے کا ارادہ کرتی ہوں مگر پھر کبھی کسی وجہ سے اور کبھی کسی وجہ سے پروگرام ملتوی کرنا پڑتا ہے۔ اس سال اگر صحت نے اجازت دی تو ضرور آؤں گی۔ آپ دعا کیجیے گا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ایمان اور صحت کی اعلا حالتوں میں رکھے۔ خدا حافظ آپ کی بھانجی۔

صادقہ خاتون

خط ختم کرتے ہی راشد کا سارا چہرہ آنسوؤں سے تر ہو چکا تھا۔ ندامت اور شرمندگی حد سے زیادہ تھی۔ اماں گاہے بگاہے اسے تمام رشتے داروں کے احوال سے مطلع بھی رکھتی تھیں۔ پھر بھی ماں کے مرنے کے بعد اس نے ان سے کوئی رابطہ رکھنے کی موہوم سی کوشش بھی نہ کی تھی۔ چند مہینے پہلے اسے چھوٹی خالہ کی سوات میں رہنے والی سیاس کی پہلے شدید علالت اور پھر فوتگی کی اطلاع بھی ملی تھی مگر اس نے کوئی نوٹس نہیں لیا تھا۔

کوٹ سبزل میں اماں کے ماموں، خالہ اور ممانی تو حیات تھے مگر اس نے ان کی کوئی خبر گیری کرنے کی ضرورت نہ سمجھی تھی۔ اماں اتنی کمزور، ناتواں اور بیمار ہو کر بھی خط و کتابت کے ذریعے ہی سہی ان سے جڑی ہوئی تو تھیں اور وہ اتنا جوان، صحت مند ہو کر بھی جان بوجھ کر غافل رہا۔

☆☆☆

"نیوایئر" میں اب فقط تین دن ہی باقی رہ گئے تھے۔ تمام تیاریاں مکمل تھیں۔ نئے لباس سل کر آ چکے تھے۔ عالیہ ڈھیروں کارڈز تیار کر چکی تھی۔ کھانے کا مینیو سیٹ کر لیا گیا تھا۔ ایسے میں راشد کی طرف سے ایک ہنگامی اجلاس طلب کیا گیا۔ جب سب جمع ہو گئے تو راشد نے "نیوایئر" منانے کی ایک نئی اور انوکھی تجویز پیش کی۔ اس کے زریں خیالات سن کر پوری محفل سناٹے میں آ گئی۔ کوئی کچھ بھی بولنے کے قابل نہ رہا۔

"مگر یہ کیسے ممکن ہے.....؟"

"ایسا نہیں ہو سکتا.....!! ماما بابا اس کی اجازت نہیں دیں گے۔!! سب سے پہلے وقار کا سکتہ ٹوٹا تو پھنسی پھنسی آواز میں اس کے منہ سے یہ جملے نکلے۔

"آخر تمہارے ذہن میں یہ خیال کیوں آیا.....؟ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ ہمیں اس کی قطعاً اجازت نہیں ملے گی.....!!" عالیہ بھی صدماتی کیفیت میں بولی۔

"اور پھر ہمارے پاس اتنا وقت کہاں ہے؟" زیبی نے بھی اعتراض کیا۔ "تم اچھی طرح جانتے ہو کہ ہمیں گھر کی چار دیواری سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں ہے۔"

تمام اعتراضات سن کر بھی راشد اپنے موقف پر ڈٹا رہا۔ اس نے صاف صاف کہہ دیا کہ اگر وہ سب رضا مند نہیں ہیں تو پھر "نیوایئر" کی پارٹی اس کی طرف سے منسوخ سمجھیں۔ وہ اپنے طے شدہ پروگرام کے تحت اکیلا ہی "نیوایئر" منا لے گا۔ تمام نوجوان پارٹی اس کا دوٹوک انکار سن کر اپنا سا منہ لے کر رہ گئی۔

وہ ان سب کا لیڈر تھا اور پارٹی کے ستر فیصد اخراجات بھی وہی برداشت کرتا تھا۔ ایک ایک کر کے تمام مایوسی سے اٹھ کر چل دیے۔ اس نے کسی ایک کو بھی روکنے کی کوشش نہیں کی۔

☆☆☆

یکم جنوری 2020ء

یہ یکم جنوری 2020ء کی حسین صبح ہے۔ سورج کی سنہری کرنیں بڑی حرارت بخش محسوس ہو رہی ہیں۔ بڑے سارے کچے صحن میں ایک چارپائی بچھی ہے جس پر ایک طرف اماں کے ماموں یعنی چھوٹے نانا بیٹھے ہیں اور دوسری طرف راشد بیٹھا ہے۔

اس رات اس نے بیگ میں اپنے دو جوڑے ڈالے اور اکیلا ہی چلا آیا تھا۔ نانا جان بمشکل ہی اسے پہچان پائے تھے۔ پھر کافی دیر تک اس سے لپٹے رہے۔ حیرت کی بات ہے کہ اسے ان کے وجود سے بھی اپنی ماں کے وجود جیسی مانوس خوشبو آ رہی تھی۔ اس نے زندگی میں پہلی بار کوئی جذباتی فیصلہ کیا تھا اور انسان کو ایسے فیصلے کر لینے چاہئیں کیوں کہ ایسے جذباتی فیصلے انسان کو بہت سکون دیتے ہیں۔

☆

صوفے پہ اوندھے پڑے کشن دیکھ کر یوں لگ رہا تھا کہ جیسے دو پہلوان لڑتے لڑتے ایک دوسرے کے اوپر گر پڑے ہوں۔ سینٹرل ٹیبل..... ایش ٹرے..... ڈیکوریشن پیس..... اور کرسٹل کے گلدانوں پر گرد دیکھ کر گمان ہو رہا تھا کہ جیسے کسی صحرا میں آ گئے ہوں۔ لینڈ لائن کریڈل سے ہٹا دیکھ کر اندازہ ہو گیا تھا کہ پچھلے دو گھنٹے سے گھر کا فون مصروف کیوں مل رہا تھا۔

اردگرد کا معائنہ کرتے ہوئے عاقب آگے بڑھا تو پاؤں کے نیچے ''چوں'' کی آواز پر اس زور سے اچھلا کہ چار قدم آگے جانے کے بجائے چار قدم پیچھے ہو گئے۔ چھوٹا سا ربڑ کا کھلونا جو عاقب کے جوتے تلے آنے پر بری طرح چلا اٹھا تھا۔

فرش پر جمی گرد کے باعث اس کا اصل رنگ ہی ماند پڑ گیا تھا۔ بخوبی اندازہ ہو رہا تھا کہ کئی روز سے جھاڑو پوچھا نصیب نہیں ہوا تھا۔ کمرے کے دروازے کے پاس بچوں کے جوتے ایک جوتا مشرق میں تو دوسرا

حنا بشریٰ

سرکھپری

مغرب میں پڑا تھا یوں جیسے دونوں ایک دوسرے سے ناراض ہوں۔ پاس ہی موٹنگ پھلی کے چھلکے اور چپس کے ادھ کھائے ٹکڑے پڑے تھے۔ بچوں کے کھلونے یہاں بھی جا بجا گرے ہوئے تھے۔

ان سب چیزوں سے بمشکل نظر ہٹاتے ہوئے عاقب نے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا تو کسی چیز کی چپچپاہٹ اس کے ہاتھ پر لگی۔ چہرے پر ناگواری کے آثار ابھر آئے۔ ہینڈل کے ساتھ چپکی چیونگم دیکھ کر عاقب کا میٹر بری طرح سے گھوم گیا۔

پینٹ کی جیب سے ٹشو پیپر نکال کر ہینڈل پکڑا اور نہایت غصے سے دروازہ کھول کر پہلا قدم بڑھانے کی خواہش ہی کی تھی کہ پاؤں کے نیچے آئے بچے کے گندے پیمپر نے اس خواہش کا گلا دونوں ہاتھوں سے گھونٹ ڈالا۔

''سارہ.....!'' وہ ہوا آواز بلند چلایا۔

مگر مخاطب لحاف کے اندر دبکا ہوا تھا۔ عاقب نے دو تین آوازیں دیں مگر جواب ندارد..... گہری

نیند تھی یا بے ہوشی کا انجکشن لگا ہوا تھا کہ دیکھنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ پاس ہی ایک سالہ علی لیٹا ہوا تھا۔ وہ جاگ رہا تھا۔ خالی فیڈر ہونٹوں میں دبائے وہ اسی امید پر نپل چوسے چلا جارہا تھا کہ شاید فیڈر میں سے کچھ نکل ہی آئے۔ کمال کا صابر بچہ تھا کہ خالی فیڈر سے بہلا ہوا تھا اور ماں کو خوب کھل کر سونے کا ٹائم دے رہا تھا۔ اگر اس کی جگہ کوئی اور ''ہلاکو خان'' ٹائپ بھوک کا کچا بچہ ہوتا، وہ چنگھاڑ مچاتا کہ ایک منٹ بھی ماں کا آنکھ بند کرنا دشوار کردیتا۔ دوسرا بچہ عثمان ماں کے ساتھ ہی لحاف میں دبکا تھا۔

''اف توبہ..... اتنی غافل نیند.....'' عاقب یہ منظر دیکھ کر بری طرح سے جھنجلایا تھا۔ ایک طائرانہ اور غضب ناک نگاہ پورے کمرے پر ڈالی تو یوں لگ رہا تھا جیسے کسی ''سرکس'' میں آگیا ہو۔ ہر طرف بے ترتیبی اور پھیلاوا تھا عاقب سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

اسی پل اٹیچڈ باتھ سے پانی گرنے کی آواز سن کر وہ اس طرف لپکا۔ نل کھلا تھا اور بالٹی فل ہوچکی تھی اور پانی بہہ بہہ کر نیچے گر رہا تھا۔ یقیناً جب نل کھولا ہوگا تو پانی نہیں آرہا ہوگا۔ کھولنے والے نے بند کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی تھی۔ نتیجتاً پانی ضائع ہورہا تھا۔

''حد ہوتی ہے لاپروائی کی!'' بڑبڑاتے ہوئے عاقب نے نل بند کرنا چاہا تو ایک بھیانک انکشاف منہ پھاڑے سامنے کھڑا ہوگیا کہ ٹونٹی خراب ہوچکی تھی سو نہ بند ہورہی تھی اور نہ پانی رک رہا تھا۔ عاقب نے تو سر پیٹ لیا۔ دوبارہ سے کمرے میں آیا تو امید تھی کہ محترمہ شاید بیدار ہوگئی ہوں مگر.....

''سارہ.....!'' غصے سے لحاف کھینچ کر وہ چلایا تھا۔

سارہ پر نظر پڑتے ہی آنکھیں حیرت سے پھٹنے لگیں۔

وہ جاگ رہی تھی۔ بس سماعتوں کے مفلوج ہونے کا اصل قصہ یہ تھا کہ سردی کی وجہ سے گرم اونی ٹوپی پہن رکھی تھی۔ جس نے کانوں کو بھی ڈھانپ رکھا تھا۔ اس کے علاوہ ایک اور دردناک انکشاف چھپا تھا کہ سارہ نے میوزک سننے کے لیے کانوں میں ہینڈز فری لگا رکھا تھا۔ گردوپیش سے بے نیاز وہ اپنی پسندیدہ مووی کا میوزک سننے میں محو تھی کہ نہ عاقب کی آمد کی خبر ہوئی نہ ہی علی کے خالی فیڈر کی۔ ویسے بھی علی گلا پھاڑ پھاڑ کر احتجاج بھی کرلیتا تو کیا فائدہ ہوتا۔ سارہ کو کہاں آواز پہنچنی تھی۔

''بہری ہوگئی ہو!'' ہینڈ فری کانوں سے الگ ہوا تو سارہ کی سماعتیں بحال ہوئیں۔

''تم..... کب آئے؟'' میوزک بند ہوجانے کی وجہ سے سارہ کے چہرے اور لہجے دونوں میں ناگواری تھی۔

''پچھلے پورے ایک گھنٹے سے..... مگر تمہیں ہوش کہاں تھا..... حد ہوتی ہے غیر ذمے داری اور لاپروائی کی!'' اور پھر عاقب کا لیکچر شروع ہوگیا۔ جو پورے تیس منٹ کا تھا۔ جس کو سنتے ہوئے سارہ کو جمائیاں آنے لگتی تھیں۔

''لیکچر کا موضوع.....'' عورت کی بے حسی۔ لاپروائی، غیر ذمے داری'' ہوتا تھا۔ ایسے لیکچر عاقب مہینے میں کئی بار دیا کرتا تھا۔ جو انتہائی ''بورنگ'' تھا اور ''طریقہ تدریس'' بھی سارہ کے نزدیک ایک دم فلاپ تھا۔

حالانکہ عاقب ہر بار بہترین الفاظ کا چناؤ کرتا۔ دل پہ کاری ضرب لگانے والے واقعات بھی پیش کرتا۔ جس میں دادی، نانی، اماں وغیرہ کے کارہائے نمایاں بھی سناتا۔

مگر ہر بار عاقب کو اندازہ ہوجاتا کہ اس بات نے نہ تو سارہ کے دل پر اثر کیا تھا اور نہ ہی دماغ پر..... دل ویسے کا ویسا ''بدتمیز دل'' ہی رہتا جو مان کے نہیں دے رہا تھا۔ اور دماغ اس کے تو کیا کہنے تھے جس میں سوائے بھوسے کے کچھ نہ تھا۔ نہ کان پر جوں رینگتی اور نہ ہی ہوش کے ناخن لیے جاتے۔ بلکہ سارہ کے چہرے پر ناگواری کے گہرے بادل دیکھنے کو ملتے۔ عاقب افسوس کے موسلا دھار مینہ میں بھیگتا چلا

جاتا۔ سارہ کو عاقب کے اس فضول لیکچر سے شدید چڑ تھی۔

عاقب نے سارہ سے لو میرج کی تھی۔ وہ اس کی یونی فیلو تھی۔ شوخ اور دلکش شخصیت کی مالک سارہ اسے بے حد بھائی تھی۔ گھر والوں کی مخالفت کے باوجود عاقب ڈٹ گیا کہ "اگر شادی کرے گا تو سارہ سے ورنہ ساری عمر یونہی کنوارا رہے گا۔"

یہ دھمکی کوئی عام دھمکی نہ تھی بلکہ اکلوتی اولاد کی تھی۔ وہ اولاد جس کا سہرا دیکھنے کی خواہش ماں کو اس دن سے ہو جاتی ہے جب وہ اس کی گود میں آتا ہے۔ انوکھے سے ارمان اپنے جگر کے ٹکڑے کے لیے پلنے لگتے ہیں۔ سو اس کی ضد کے آگے سب کو ہتھیار ڈالنا پڑے۔

سارہ اس کی زندگی میں شامل ہو گئی۔ وہ بے حد خوش تھا اور مطمئن بھی۔ شروع کا عرصہ تو خوب گزرا۔ مگر آہستہ آہستہ عاقب پہ سارہ کی شخصیت کے بہت سے پہلو واضح ہونے لگے۔ لاپروائی، غیر ذمے داری، انتہا کی کام چور، اچھے کھانے پینے کی شوقین اور نیند کی خوب شیدائی تھی۔ سوتی تو یوں لگتا کہ جیسے مُردوں سے ضد لگا کر سوئی ہو۔

عاقب کا خیال تھا کہ بچوں کے بعد سارہ لاپروائی کا "چولا" اتار کر ذمے داری کی "قبا" پہن لے گی۔ مگر نہ جی! سارہ میں دو عدد بچوں کے بعد بھی بدلاؤ پیدا نہ ہوا۔ ہاں البتہ بدلاؤ آیا بھی تو صرف جسامت میں۔ حد درجہ آرام اور نیند نے اس کا "وزن" خاصا بڑھا دیا تھا۔

بچوں کی موجودگی نے سارہ کو بے حد کاہل بنا دیا تھا۔ ان کے ساتھ وہ خود کو بھی "بے بی" سمجھنے لگی تھی۔ بچوں کے ساتھ سونا اور ان کے ساتھ ہی اٹھنا۔

"سارہ..... صبح ناشتہ تو بنا دیا کرو!" عاقب اکثر شکایت کرتا۔

"بھئی..... مجھ سے نہیں اٹھا جاتا صبح ہی صبح ناشتے کے لیے، رات بھر تمہارے بچوں کے ساتھ جاگو اور صبح سورج چڑھتے ہی تمہارے لیے اٹھ جاؤں.....!"

یوں سارہ نے ناشتے کے لیے بھی "ہری جھنڈی" دکھا دی۔ بلکہ "مفت مشورہ" دے ڈالا کہ بریڈ، مکھن، جیم لا کر گھر میں رکھو۔ ہلکا سا ناشتہ ہی بنانا ہوتا ہے۔ بناؤ، کھاؤ اور آفس جاؤ..... ویس آل..... "خوامخواہ کا" "سیاپا" بلکہ "ٹوٹل سیاپا" ڈالنے کی ضرورت نہیں۔ اگر اس قسم کے ناشتے سے بھی کام نہ چلے تو دکانیں کھلی ہوتی ہیں۔ وہاں سے سری پائے، حلوہ پوری ہر چیز مل جاتی ہے۔ اپنے لیے بھی لے آؤ اور میرے لیے بھی ہاٹ پاٹ میں رکھ دینا۔ میں اٹھ کر کھا لوں گی!"

سارہ کہہ کر کمبل میں منہ چھپا لیتی تو عاقب کا دل چاہتا کہ ہاٹ پاٹ اپنے سر پر دے مارے۔

عاقب کو شروع سے ہی اچھا ناشتہ کرنے کی عادت تھی۔ ہمیشہ ماں کے ہاتھ سے بنا ہوا ناشتا کیا تھا اب شادی کے بعد خواہش تھی کہ یہ کام بیوی کرے مگر وائے نصیب۔ سارہ کی وجہ سے اسے یہ عادت بھی بدلنا پڑی۔ اس نے بچوں کی خاطر "سمجھوتا" کر لیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ اندازہ ہوا کہ یہاں تو صرف "سمجھوتہ ایکسپریس" ہی چلے گی۔

"سارہ..... پلیز میری شرٹ تو استری کر دو!"

"عاقب خود کر لو نا۔ استری کرنا کون سا مشکل کام ہے!" جواب فوراً حاضر ہوتا۔

"سارہ..... میری جرابیں نہیں مل رہیں۔ دو الگ رنگوں کی کس ہو گئی ہیں!"

"اف عاقب..... تم تو بچہ ہی بن جاتے ہو۔ جو مل گئی ہیں پہن لو۔ بند جوتوں میں کیا پتا چلتا ہے؟" یہ ایک نیا فارمولا تھا جو سارہ نے ایجاد کیا تھا۔

"سارہ..... میرے موبائل کا چارجر نہیں مل رہا ہے؟"

"اوہ میں بتانا بھول گئی تھی کہ ساتھ والی سحر باجی کو ضرورت تھی وہ لے گئیں۔ تم آفس جا کر کسی سے لے کر چارج کر لینا!"

سفید جھوٹ سارہ کی عادت بن گئی تھی۔ اپنی لاپروائیوں پر پردہ ڈالنے اور خود کو رعایت دینے کے لیے جھوٹ بول دیتی۔ چارجر کا اصل قصہ کیا تھا یہ بھی

رات تک عاقب کو پتا چل گیا تھا۔ چارجر ساری رات سوئچ بورڈ میں لگا رہنے کی وجہ سے جل گیا تھا۔ اب اگر عاقب کو بتاتی تو "لیکچر" سننا پڑتا جو اسے بالکل پسند نہ تھا۔ سو جھوٹ بول کر جان بچائی۔ مگر عاقب کو کسی کونے کھدرے سے چارجر مل گیا تو اس نے موبائل کو چارجنگ پر لگانا چاہا۔ چارجنگ تو نہیں ہوئی ہاں البتہ ہلکا سا بجلی کا جھٹکا ضرور لگا تھا۔ جو جان لیوا ثبوت نہیں ہوا تھا۔

☆☆☆

"آج پھر دال ——!" پورے ایک ہفتے سے مونگ کی دال کھا کھا کر عاقب کو اپنی شکل مونگ کی دال جیسی لگنے لگی تھی۔ وہ آفس جاتے ہوئے سبزی کے پیسے دے کر جاتا تھا —— فریج میں چکن اور مٹن بھی فریز کیا تھا۔ خیال ہوتا تھا کہ رات کے کھانے میں کوئی اچھی سی ڈش مل جائے گی۔ مگر روز ہی مونگ کی دال اس کی شکل دیکھ کر قہقہے لگا رہی ہوتی تھی کہ "او بھائی دیکھ کیا رہے ہو۔ اب کھا بھی لو دیر بھی لگاؤ گے تو میں مونگ کی دال ہی رہوں گی۔ کر لو گل۔"

"عاقب —— ایک تو تمہارے نخرے بہت ہیں۔ چھوٹا ساری رات بہت بے چین رہا۔ ایک منٹ بھی سونے نہیں دیا۔ اس لیے جلدی میں بس یہی بنا سکی۔" دماغ پر نیند ہی اتنی سوار تھی کہ کون فریج سے گوشت نکالتا۔ دھوتا۔ اور پکاتا۔ کون سبزی کاٹتا اور اچھی سی ہانڈی تیار کرتا۔ سو سب الجھنوں کا ایک ہی حل، مونگ کی دال گھر بھر کے لیے پکانے میں آسان کھانے میں بھی آسان۔

دل پر پتھر رکھ کر عاقب دال کھانے پر آمادہ ہوتا تو نہ ہاٹ پاٹ میں روٹی ہوتی اور نہ ہی ڈش میں چاول دکھائی دیتے۔ بلکہ خالی ہاٹ پاٹ میں ایک چیونٹی یہ کہتے ہوئے جا رہی ہوتی۔

"دھت تیرے کی' آج ان کے گھر بھی روٹی نہیں بنی۔ چلو باہر ہوٹل چلتے ہیں۔"

"یہ کھاؤں کس کے ساتھ؟" بھوک کے مارے عاقب کی حالت غیر ہونے لگتی۔

"تمہیں میسج تو کیا تھا کہ آفس سے آتے ہوئے دو تندوری روٹیاں لیتے آنا!"

یہاں بھی وہی الجھن کون آٹا گوندھتا، کون گرمی میں چولہے کے پاس کھڑے ہو کر اپنی کومل جلد کو جھلساتا، آسان اور سادہ حل، "تندوری روٹی ایک تیری ایک میری۔"

اب چونکہ قصور بھی عاقب کا تھا کہ میسج نہ پڑھ سکا تو اس کا خمیازہ اس صورت میں بھگتنا پڑتا کہ اسے سلائس کے ساتھ دال زہر مار کرنا پڑتی۔

"نرالے ہی بچے پیدا کیے ہیں تم نے، جو کوئی کام ڈھنگ سے نہیں ہوتا۔" ضبط کرتے کرتے بھی عاقب سے ملکہ عالیہ کے حضور گستاخی ہو جاتی۔ اس کے سامنے خاندان کی بہت سی ایسی مثالیں تھیں جن کے بچے بھی تعداد میں زیادہ تھے مگر ایسا نہیں تھا کہ انہیں نہ اپنا ہوش ہوتا اور نہ ہی گھر کا۔ سارہ نے تو جیسے بدانتظامی کی کوئی اعلا مثال قائم کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

"ہاں تو کس نے کہا تھا کہ اتنی جلدی یہ "فوج" تیار کر لو۔" ملکہ عالیہ بھی جلال میں آ جاتیں۔ سارہ کے مطابق یہ فوج بھی دو بچوں پر مشتمل، جس کی وجہ سے گھر کا حشر نشر ہو گیا تھا۔

یہ صورت حال شدت اختیار کر گئی تو عاقب نے مدد کے لیے ایک عدد ملازمہ رکھ دی۔ اس کے آنے سے عاقب کو کسی حد تک سہولت ہو گئی۔ مگر سارہ کی عادتیں مزید بگڑ گئیں۔ وہ جو پہلے بیڈ سے اتر کر دو چار قدم چل لیتی تھی۔ وہ بھی اب ملازمہ کے ذمے لگا دیے۔

"آسیہ —— عثمان کو واش روم لے جاؤ!"

"آسیہ —— علی کا فیڈر بنا دو!"

"ذرا دیکھنا —— چولہے پہ دودھ پڑا ہے۔"

"بھئی کیا کرتی ہو۔ ابھی تک میرا سوٹ پریس نہیں کیا؟"

سارا وقت عاقب کے کانوں میں "آسیہ آسیہ" کی گردان سنائی دیتی رہتی۔ اکثر اسے لگتا کہ ملازمہ رکھ کر غلطی کر دی ہے۔ سارہ مزید آرام طلب اور کام چور ہو گئی ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ اسے احساس

ہونے لگا کہ وہ سارہ کی عادات اور طور طریقے ٹھیک کرنے میں بری طرح سے ناکام رہا ہے۔

کبھی زیادہ، غصہ آتا تو نتیجہ بحث ومباحثے کی صورت میں نکلتا۔ جس میں بچے تک سہم جاتے مگر نہ سہمی تو صرف سارہ، جس کا نعرہ تھا "جو ڈر گیا وہ مر گیا" ہاں البتہ موڈ کافی دیر کے لیے خراب ہو جاتا۔

"سارہ.....! تم کیوں نہیں سمجھتیں گھر ایسے نہیں چلتے۔" آخر محبت سے مجبور ہو کر اسے ہی ہتھیار ڈالنے پڑتے۔ اس نے سب کی مخالفت کے باوجود سارہ کو اپنایا تھا۔ اب کوئی انتہائی قدم اٹھا کر خود کو سب کے سامنے ذلیل نہیں کروانا چاہتا تھا۔ ویسے بھی دو بچوں کے بعد کوئی انتہائی قدم اٹھانا اسے احمقانہ فیصلہ لگتا تھا۔ وہ بہت کوشش کرتا۔ مگر سارہ نہیں سدھری تھی۔

"عاقب! ویسے تم بہت ناشکرے ہو۔ ناشکری میں تو تم نے عورتوں کو مات دے دی ہے۔" سارہ کے مطابق عاقب ایک ناشکرا مرد تھا۔ ہر بات پر تنقید ہر بات پر اعتراض۔

"آسیہ..... سب کام کر تو دیتی ہے پھر بھی تمہارا موڈ آف ہی رہتا ہے!" بائیں بازو پر چھوٹے بچے کو جھلاتے ہوئے دائیں ہاتھ سے اس کے منہ میں فیڈر دیتے ہوئے وہ خفگی بھری نگاہوں سے دیکھتی تو عاقب کے اندر شدید تھکاوٹ سی چھا جاتی۔

سارہ بے وقوف تھی یا ہر نعمت، آرام و آسائش نے اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سلب کر لی تھی۔ وہ گھر کی ملازمہ پر اس قدر انحصار کر کے مطمئن ہو گئی تھی کہ اسے عاقب کی شکایتیں بے جا اور اعتراض ناشکری لگ رہے تھے۔ اس کے مطابق گھر کا انتظام ٹھیک چل رہا تھا۔ عاقب بے کار میں اتنا معترض ہو رہا ہے اور گھر کا ماحول خراب کر رہا ہے۔

وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ اس کا شوہر اس سے کیا چاہ رہا ہے۔ عاقب کے اندر افسوس سا پھیلنے لگتا۔ وہ اچھے سے اچھا اسے پہننے کے لیے دیتا۔ کھانے پینے کی ہر چیز فراوانی سے لاتا۔ ہر مہینے اسے کھلا جیب خرچ دیتا۔ عاقب اس بات کا قائل تھا کہ جب اللہ عورت کی قسمت سے دیتا ہے تو پھر عورت کو بھی فراخ دلی سے دو۔ خوامخواہ اسے تنگی کا شکار نہ کرو۔

مگر سارہ کچھ ایسی "سر پھری" قسم کی عورتوں میں سے تھی جنہیں نہ اپنی کوتاہیوں کا احساس ہوتا ہے نہ اپنی غیر ذمے داری کا۔ شاید محبت کے زعم نے اسے بے فکر کر دیا تھا کہ جو بھی ہو۔ حالات جیسے بھی ہوں۔ عاقب اس کے بغیر نہیں رہ سکتا اور اگر یہ خوش فہمی تھی تو حقیقت ہی تھی۔ جس نے سارہ کو مزید "سر پھرا" بنا دیا تھا۔ مگر اب عاقب کی برداشت جواب دے رہی تھی۔ سارہ کی عادات اور طور طریقے تکلیف دینے لگے تھے۔

اور جب بات تکلیف اور اذیت تک پہنچ جائے تو پھر "محبت" کہیں پس منظر میں چلی جاتی ہے اور اس کا ذمہ دار وہ فریق ہوتا ہے جس کی وجہ سے یہ سب ہوتا ہے۔

☆☆☆

عاقب دوسرے شہر دوست کی شادی میں گیا تھا۔ جانے سے پہلے وہ ضرورت کی تمام اشیاء، جیب خرچ، ملازمہ کی تنخواہ سارہ کے ہاتھ پر رکھ کر گیا تھا۔ بس ڈیمانڈ یہ تھی کہ گھر کا خیال رکھنا، بچوں کا خیال رکھنا۔ مگر اس "سر پھری" عورت کو جیسے شوہر کی غیر موجودگی میں آزادی اور کھلی چھٹی مل گئی تھی۔ سارا گھر آسیہ کے حوالے کر کے خود کبھی واک پر نکل جانا۔ کبھی سہیلیوں کے ساتھ ڈنر ارینج کر لینا۔ کبھی کسی رشتے دار کو گھر بلا لینا تو کبھی شاپنگ پر نکل جانا۔ کھڑے کھڑے دس بیس ہزار کی شاپنگ بلاضرورت کر ڈالنا۔

عاقب سے تقریباً روز ہی فون پر بات ہو جاتی اور اسے یہ کہہ کر مطمئن کر دیا جاتا کہ سب "ٹھیک" ہے گھر بھی۔ بچے بھی اور آسیہ بھی۔ مگر ہائے آفت..... آسیہ کو ایک عدد چھینک آئی اور شام تک ہزاروں چھینکوں کا طوفان لے آئی۔ ڈھیروں کپڑے دھونے کی وجہ سے ٹھنڈ لگی تو بات نزلہ، زکام، بخار، جوڑوں کے درد پر جا پہنچی تو ہانپتی کانپتی آسیہ نے جو چالیس سالہ عورت تھی..... سب کام سارہ کے حوالے کیے اور خود دو چار دن کے لیے غائب ہو گئی۔

سارہ کے لیے یہ دن عذاب بن گئے۔ تقریباً ہر روز آسیہ کو نصف درجن کالز کی جاتیں صرف یہ پوچھنے کے لیے کہ "طبیعت کیسی ہے..... کب کام پر واپس آؤ گی۔" اور وہ جواب میں دو چار "چھینکیں" مار کر مزید طبیعت کی خرابی کا اشارہ دیتی تو سارہ کو رحم کے بجائے غصہ آنے لگتا۔

"باجی مجھ سے تو ہلا بھی نہیں جا رہا۔ کام کیسے کروں گی؟"

آسیہ کے بغیر تو سارہ کا ایک دن بھی گزارنا مشکل ہو گیا۔ کچن دیکھتی۔ بچوں کو سنبھالتی یا گھر کی صفائی ستھرائی کرتی۔ کام چوری تو پہلے ہی کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ سو سارا گھر الٹ پلٹ ہو گیا تھا۔ بیوی ہونے کے ناتے اس نے عاقب کی کمی اتنی شدت سے محسوس نہیں کی تھی جتنی کی اس نے آسیہ کی تھی۔

آسیہ کے بغیر تو اس کی دنیا میں اندھیرا چھا گیا تھا۔

جب عاقب دو ہفتوں کے بعد گھر لوٹا تو گھر کی حالت دیکھ کر سر پیٹ لیا۔

"یہ گھر کا کیا حال بنا دیا ہے سارہ---- گھر ہے یا کباڑ خانہ؟" عاقب پھٹ پڑا تھا۔

"اب آسیہ بیمار تھی تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟" پاس لیٹے علی کا خالی فیڈر دیکھتے ہوئے وہ بمشکل سیدھی ہو کر اٹھ بیٹھی ---- اسے اپنی سکھ شانتی کی بستی میں عاقب کا اچانک حملہ سخت زہر لگا تھا۔

"نہ سلام نہ دعا---- آتے ہی شروع ہو گئی جرح!" سر جھٹکتے ہوئے سارہ نے ٹیبل پر پڑا ڈبے کا دودھ جو "ٹی کوزی" کے نیچے اس مقصد کے تحت چھپا کر رکھا تھا کہ گرم رہے گا۔ اب گرم تھا یا بس گزارہ---- سارہ نے خالی فیڈر بھرا اور دوبارہ سے علی کے منہ میں ٹھونس دیا۔ کام چوری اور آرام طلبی کی یہ انتہا جو مرد کم ہی برداشت کر پاتے ہیں مگر سارہ تو جیسے عاقب کی برداشت ختم کرنے پر تلی تھی۔

"تو کیا ملازمہ کی بیماری کی صورت میں حرام تھا تم پر گھر کے کاموں کو ہاتھ لگانا.....!" عاقب سخت بدمزہ ہو کر بولا تھا۔

"بیوی ہوں تمہاری..... ملازمہ نہیں ہوں!" غلطی کو غلطی ماننا سارہ کی سرشت میں ہی نہیں تھا۔ وہ نہ صرف چلائی تھی بلکہ کمرے کی چیزیں نہایت غصے میں اٹھا اٹھا کر پھینکنا شروع کر دیں۔

"ان کے بچوں کو بھی سنبھالو اور ان کی باتیں بھی سنو.....!"

وہ چیختے ہوئے جیسے ہتھے سے اکھڑنے لگی تھی۔ بدتمیزی کرتے ہوئے وہ کچھ بھی سمجھنے کو تیار نہ تھی۔ اس کے ہاتھ میں جو چیز آ رہی تھی وہ اٹھا کر پھینک رہی تھی۔ اسی جنون میں اس نے پرفیوم اٹھا کر کو پھینکا تو پہلے عاقب کے پاؤں پر لگا اور پھر فرش پر گرا۔ تکلیف کی شدت میں عاقب نے ایک زوردار طمانچہ اس "سر پھری" کے رسید کر ڈالا۔ مگر اس کی زبان ایک منٹ کے لیے بھی نہ رکی تھی۔ رو رو کر اس نے سارا گھر سر پر اٹھا لیا تھا۔

☆☆☆

عاقب کی پھپھو چند روز کے لیے ان کے ہاں رہنے آئی تھیں۔ گھر کا ماحول، حلیہ اور خاتون خانہ کے مزاج سے کافی واقفیت ہو گئی۔ باقی معلومات عاقب نے فراہم کر دیں۔ پھپھو نے عاقب کے کہنے پر سارہ کو سمجھایا مگر وہ سارہ ہی کیا جو بات سمجھ لیتی۔

"تمہیں شرم نہیں آتی۔ میری برائیاں اپنے رشتے داروں سے کرتے ہوا!" شرمندہ ہونے کے بجائے سارہ نے عاقب کی کلاس لے ڈالی۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ پھپھو کی باتوں پر غور کیا جاتا اور عمل کیا جاتا الٹا اس نے بات کو گھما کر اپنے مطلب کی بات بنا لی تھی۔ یعنی دوسرے لفظوں میں پھپھو کو جتا دیا تھا کہ "میں سو سر پھروں پر بھاری ایک "سر پھری" ہوں جو اپنے آپ کو درست نہیں کرے گی چاہے دنیا ادھر سے ادھر ہو جائے.....!"

بس پھر اس "سر پھری" کا دماغ درست کرنے کے لیے پھپھو نے آخری حل نکال ہی ڈالا۔ جو مکمل رازداری سے عاقب کے گوش گزار کر دیا۔

☆☆☆

"آپ آ گئے آفس سے؟" صاف ستھرے حلیے

میں مسکراتی ہوئی سارہ نے عاقب کے ہاتھ سے بیگ لیا تو عاقب نے خوش گوار حیرت سے اسے اور سارے گھر کو دیکھا تھا۔ شیشے کی طرح چمکتا صاف گھر، ہر چیز اپنی جگہ پر..... تازہ پھولوں کی خوشبو سے سارا گھر مہک رہا تھا۔ لان کی تراش خراش تو عاقب نے گھر میں داخل ہوتے ہی نوٹ کر لی تھی اسے لگا جیسے وہ کسی اور کے گھر میں آ گیا ہو۔ سارہ میں یہ تبدیلی کوئی عام نہیں تھی بلکہ یہ تو انقلاب تھا۔ سارہ کا عاقب کو "تم" کے بجائے "آپ" کہنا۔

"بری بات عثمان۔ پہلے ہینڈ واش کرو۔ پھر کھانے کی چیز کو ہاتھ لگانا۔" چائے کی ٹرالی اور اس میں سجے لوازمات لے کر وہ لاؤنج میں داخل ہوئی تو عثمان نے حسب عادت گندے ہاتھوں سے بسکٹ لینا چاہا تو سارہ نے ٹوک کر عاقب کو مزید حیران کر ڈالا تھا۔

"پھپھو! آپ کے لیے بھی چائے بنا دوں۔"

دو چار دن سے پھپھو کی طبیعت ناساز تھی۔ سارا وقت وہ اپنے کمرے میں رہتیں۔ سارہ سے بھی کسی حد تک خفا تھیں مگر آج گھر کی صفائی ستھرائی اور سارہ کی خوش اخلاقی نے انہیں بھی حیرت سے دوچار کیا تھا۔ ورنہ سارہ اور خوش اخلاقی دو الگ چیزیں تھیں۔

"یہ آسیہ کی تنخواہ۔" حیرتوں کو بمشکل سائیڈ پر رکھتے ہوئے عاقب نے کہا تو سارہ کے جواب نے پھر سے اسے مجسمہ حیرت بنا دیا۔

"آسیہ کو میں نے کام سے ہٹا دیا ہے۔ گھر کے سارے کام میں خود کر لوں گی تو پھر یہ خوامخواہ پیسوں کے زیاں والی بات ہوئی نا....."

مسکراتے ہوئے اس نے کپ میں چائے ڈالی۔ پہلے ادب کے ساتھ پھپھو کو تھمائی اور پھر عاقب کو دی۔ پلیٹوں میں لوازمات ڈالے اور ساتھ ساتھ عثمان کی بھی تربیت کرتی رہی۔ اس دوران سارہ نے عاقب اور پھپھو کی حیرتوں کا مزہ چائے کے ساتھ لیا تھا۔

"عاقب ..... رات کے کھانے کے لیے کیا بناؤں؟"

سارہ کے سوال پر عاقب کو شک ہونے لگا تھا کہ یہ سارہ نہیں کوئی اور ہے۔

وہ پوچھ رہی تھی کہ میں کیا بناؤں۔ جس کو عاقب منتیں کر کے کہتا تھا کہ "یار باہر کا کھانا کھا کھا کر بدہضمی ہو گئی ہے۔ خدا کے لیے کچھ تو گھر میں بنا لو....." اس بات پر سارہ طوفان برپا کر دیتی تھی۔ عاقب نے حیرت سے دیکھتے ہوئے رات کا مینو بتایا۔ مگر دل میں ابھی بھی ڈر تھا کہ کہیں خواب تو نہیں دیکھ رہا۔

"پھپھو.....! آپ کے لیے پرہیزی کھانا بنا دوں.....!" مسکراتی ہوئی سارہ نے پوچھا اور کن انکھیوں سے ان کے چہروں کی تحریر پڑھی تھی۔ دل ہی دل میں قہقہے لگاتی وہ چائے کے برتن اٹھا کر کچن میں آ گئی۔ دیکھے بنا بھی اسے یقین تھا کہ دونوں پھپھو اور بھتیجے نے لازمی ایک دوسرے کو سوالیہ نگاہوں سے دیکھا ہوگا۔

"یہ اس "سر پھری" کا دماغ ٹھکانے کیسے آیا؟"

"عورت کو عورت سے کاٹ پترا!" گزشتہ شب پھپھو نے عاقب کے کان میں جو حل بتایا تھا وہ یہ تھا۔

"دوسری عورت لے آ..... تجھے کوئی کمی ہے ایک سے بڑھ کر ایک مل جائے گی۔ میرے شہزادے کو..... کیوں اپنی زندگی اس "سر پھری" کے ہاتھوں اجیرن بنا رکھی ہے۔"

پھپھو کا یہ مشورہ اتفاق سے سارہ نے بھی سن لیا تو اس کے پیروں تلے سے جیسے زمین ہی کھسک گئی۔ وہ کام جو عاقب کا لیکچر، ڈانٹ اور پھٹکار نہیں کر سکا تھا۔ پھپھو کی اس بات نے کر ڈالا تھا۔ سوتن کا خوف ایسا تھا کہ اس نے تو "سر پھری" کو رات بھر سونے نہ دیا۔ وہ سوچوں میں گھری اپنی کوتاہیوں پر غور کرتی رہی۔ عاقب کی محبت میں شراکت اسے کسی صورت گوارا نہ تھی۔

صبح وہ اس ارادے کے ساتھ اٹھی تھی کہ خود کو بدلنا ہے۔ ورنہ جیسے لوہے کو لوہا کاٹتا ہے ایسے ہی "سوتن" کا وجود عورت کو کاٹ کے رکھ دیتا ہے بس مرد کا دماغ گھومنے کی دیر ہوتی ہے۔

☆

فرزانہ کھرل

سمیر کہیں جا تا ہے

صحن میں کلمہ شہادت کی گونج کے ساتھ جنازہ اٹھایا جا رہا تھا۔ اسی گھر کے سب سے کشادہ کمرے میں ایک نوعمر لڑکا اپنے مرحوم باپ کی وارڈ روب کے خفیہ لاکر میں باپ کی چند پسندیدہ اشیاء رکھنے کے بعد اسے لاک کر رہا تھا۔ اس کا باپ جن امور کو تنہائی میں انجام دیتا تھا۔ وہ لڑکا باپ کے گزر جانے کے بعد اس کا کارِ

زندگی کسی پہ بھی ظاہر نہیں ہونے دینا چاہتا تھا۔ وہ باپ کے محفی معاملات اب اپنی ماں پر بھی آشکار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وارڈ روب چھوڑ کے دروازے کی سمت بڑھتا ہے۔

باہر کلمہ شہادت کا ورد جاری ہے۔

پھر وہ اچانک کچھ یاد آنے پر بیڈ کی جانب لپکتا ہے، بیڈ شیٹ کھینچنے کے بعد بھاری فومی گدا بھی الٹ دیتا ہے۔ وہ بیڈ کی پائتی پہ ٹک کے بیڈ کے درمیانی چوکور تختے پر محبت سے ہاتھ پھیرتا ہے جو بظاہر لکڑی کا ہموار تختہ ہے۔ اگلے لمحے وہ اس چوکور بھاری تختے کو دونوں ہاتھوں کی قوت سے ذرا سا سرکاتا ہے کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اسے کس مخصوص زاویے سے سرکانا ہے۔

اس چوکور تختے کے نیچے کیا کوئی کھائی تھی یا کنواں تھا۔

وہ تختے کے نیچے چھپی کھائی کے ایک سرے پہ ایک ناخن نما تالا دیکھ کے مطمئن ہو جاتا ہے۔

کچھ دیر بعد وہ بیڈ کو سابقہ حالت میں ڈھالتے ہوئے کمرے کا دروازہ کھول دیتا ہے۔

دہلیز پر ہاتھ رکھتے ہی اسے یاد آتا ہے۔ ابھی رات کی ہی تو بات تھی، جب وہ باپ کی بگڑتی حالت دیکھ کے ڈاکٹر کو بلانے کی غرض سے جا رہا تھا تو عقب سے اس کے بابا نے نقاہت زدہ آواز میں پکارا تھا۔

"حب! میرا ایک کام کرو گے؟" وہ دہلیز پر ہی رک گیا تھا۔ وہ اپنے باپ کا حب تھا، وہ باپ کی کسی بات سے کب انکاری ہوتا تھا۔

اب کلمہ شہادت کا ورد گلی میں جاری تھا۔ وہ لمبے ڈگ بھرتا اپنے باپ کے جنازے کو تھام لیتا ہے پھر وہ چند چہروں کو کھوجتا ہے، اور اس چھوٹے سے ہجوم میں سے ان چہروں کو شناخت کر لیتا ہے، وہ ان اشک بار چہروں کو دیکھ کے مسکرا دیتا ہے۔

☆☆☆

وائٹ اور گرے ٹائلز سے مزین ایک کنال کے فخر ولا میں اس وقت ناشتے کی میز تیار تھی۔ وہاں فخر حیات کی بیوی سیرت اور اس کی دونوں بیٹیاں سارہ اور تاشیہ میز کے گرد موجود تھیں۔ ہمیشہ کی طرح ان کے آسودہ چہروں پر تازگی تھی۔ مگر ان تینوں خواتین کی آنکھوں میں جو سہم تھا، وہ بھی معمول کا حصہ تھا جو مسز حیات اور سارہ کی آنکھوں سے فخر حیات کے آنکھوں سے اوجھل ہوتے ہی چھٹ جاتا تھا مگر یہ سہم تاشیہ کی آنکھوں بلکہ اس کے مزاج و اطوار سے ہمہ وقت لپٹا رہتا تھا۔

سیرت نے اپنے پروقار اور بارعب شوہر کو ڈائننگ روم کی طرف آتے دیکھا تو نگاہ میں ایک مصنوعی اور وقتی احترام اتر آیا، اس کا شوہر حافظ قرآن تھا۔ پانچ وقت کا نمازی اور تہجد گزار بھی تھا، وہ اللہ کی عطا کردہ ان پرہیز گاریوں کے باوجود بے سکون اور غیر مطمئن ہی نظر آتا تھا حالانکہ اس کا اٹھنا بیٹھنا بھی نیک بندوں کی محفل میں ہوتا تھا۔ وہ اپنی عبادتوں اور پرہیز گاریوں کی بنا پر خود کو عام لوگوں سے اعلا وارفع سمجھتا تھا۔

فخر حیات ابھی ڈائننگ ٹیبل سے چند فرلانگ کے فاصلے پر تھا کہ گیٹ پہ گاڑی کا ہارن بجا تو وہ آراستہ لاؤنج کے وسط میں چونک کے رکا۔ آج ہارن کی ٹون مخصوص نہیں تھی۔ وہ قدموں کا رخ موڑتا لاؤنج کی کھڑکی کی طرف آیا۔ اب گاڑی پورچ تک آ چکی تھی، اس نے ڈرائیونگ سیٹ پہ بیٹھے شخص کو تند نگاہی سے دیکھا پھر اسے درشت آواز میں پکارا۔

اگلے چند لمحوں بعد اس کے سامنے مؤدب کھڑا ڈرائیور سمجھ نہیں پایا کہ اس سے کیا غلطی ہوئی ہے۔ اس نے ابھی فل پیٹرول ڈلوا دیا تھا اور گاڑی کی تمام کنڈیشن بھی سیٹ تھی کہ بچیوں کے سفر کے دوران اسے گاڑی کا جگہ جگہ رکنا سخت ناپسند تھا۔

"آج فرزند کیوں غائب ہے؟"

اس نے بنا سلام دعا کے اس شخص سے یوں بات کی جیسے وہ واقعی صرف ایک ڈرائیور تھا ان کے درمیان کوئی رشتہ داری نہیں تھی۔

"بابا کو رات سے تیز بخار ہے اور....."

''اچھا ٹھیک ہے۔''

وہ ہاتھ کے اشارے سے بات ختم کرتا ڈائننگ ٹیبل کی طرف آیا۔اس نے بیٹیوں کے سلام کا جواب بھی محض سر کے اشارے سے دیا۔ بیوی نے آگے بڑھ کر اس کے لیے کرسی کھینچی۔

''تم اس قدر غیر ذمہ دار ماں ثابت ہو سکتی ہو، مجھے اس چیز کا بالکل بھی اندازہ نہیں تھا۔''

وہ سخت لہجے میں گویا ہوا۔اس کی بیوی کا چہرہ پھیکا پڑا۔''یا اللہ کیا غلطی ہوگئی۔'' وہ اڑی رنگت کے ساتھ اپنی نشست پہ آ گی۔

''بچیوں کے فون فل چارجڈ ہیں ان میں، بیلنس بھی موجود ہے۔'' وہ شوہر سے نرم لہجے میں ہم کلام ہوئی۔

''یہ بات تمہارے علم میں ہونی چاہیے تھی کہ آج فرزند کے بجائے فرقان آیا ہوا ہے۔''

دبی آواز میں اس کا لہجہ انتہائی سخت تھا کہ تاشیہ کے ہاتھ سے چائے چھلک گئی جبکہ سارہ نے ناگواری چھپانے کی خاطر چہرہ کچھ اور جھکا لیا۔

''مجھے رات کو ہی فرزند بھائی کی بیماری کی خبر ہوگئی تھی اور فرقان صبح آتے ہی مجھ سے ملا تھا، آپ جانتے ہیں کہ فرقان ہماری بچیوں کو بیٹی کہے بنا مخاطب نہیں کرتا پھر بھی آپ پتا نہیں اتنا وہم کیوں کرتے ہیں۔'' اس نے چائے، آملیٹ اور ناشتے کی دیگر اشیاء شوہر کے سامنے کیں۔

''تمہیں اور بچیوں کو اندازہ ہونا چاہیے کہ جو لوگ ہمارے معیار اور ہماری برابری کو نہیں چھو سکتے، ان کے اندر ہمارے خلاف غصہ اور حسد چھپا ہوتا ہے اور یہ لوگ موقع پرست ثابت ہوتے ہیں۔''

اس کا لفظ لفظ تنفر میں ڈوبا ہوا تھا، تاشیہ کے ہاتھ کانپے جو اس نے فوری گود میں رکھ لیے۔

''چلو جی! ان کا لیکچر شروع ہوگیا۔'' سارہ نے ناشتے کے لوازمات پہ اکتائی نگاہ ڈالی۔

''تم لیٹ ہو رہی ہو تاشیہ!'' سارہ کا یہ جملہ معمول کا حصہ تھا جو تاشیہ کے لیے اجازت کا باعث ہوتا تھا۔

''آج تم بہن کو چھوڑنے بھی جاؤ گی اور لینے بھی جاؤ گی۔''

باپ کے اس حکم نے سارہ کو جی بھر کے بدمزہ کیا۔ اس نے اپنے سے چھ سال چھوٹی بہن کو گھور کے دیکھا جس کے چہرے پر دودھ پیتی بچی کی سی کم سنی چھائی رہتی تھی جو اس وقت بھی ایک ملائم ٹشو کی طرح دکھ رہی تھی۔

☆☆☆

وہ انتہائے دسمبر کا ایک مختصر ترین دن تھا۔موسم خراب تھا اور بادل یوں سیاہ تھے، جیسے گھر پہ رات غالب آ چکی ہو۔گمان تھا کہ اگلے لمحے بارش شروع ہو جائے گی، اس علاقے کی جنازہ گاہ میں جنازہ پڑھنے والے اس علاقے کی معزز ترین ہستی حافظ صاحب کے منتظر تھے جو کالونی کے مولوی صاحب کی غیر موجودگی یا ان کی علالت کے باعث جنازہ پڑھانے میں پیش پیش رہتے تھے۔

آج بھی وہاں لوگ مرنے والے کی قسمت پہ رشک کر رہے تھے کہ اس بندہ گناہ گار کا جنازہ اس ہستی نے پڑھانا تھا جس نے اپنی شعوری عمر سے لے کر آج تک ایک نماز بھی قضا نہیں کی تھی۔باپ کے تابوت کے سرہانے کھڑا تاشیہ دور تک دیکھتا ہے۔وہ جنازہ صفوں کے لحاظ سے بہت بڑا تھا۔وہ سب کون تھے اور کہاں سے آئے تھے۔

تب ہی ہجوم میں سے ایک آواز ابھرتی ہے۔

''حافظ صاحب کا فرمانا ہے کہ وہ کسی ایسے ویسے شخص کا جنازہ نہیں پڑھائیں گے۔''

اس اطلاع دینے والے نے اس پیغام کو مناسب الفاظ میں ان تک پہنچایا تھا۔تب ہی بارش کے چند قطرے گرتے ہیں، ٹھنڈے یخ..... جیسے برف کی بوندیں.....حب کے سر اور کندھوں پہ گرنے والی وہ یخ بوندیں جیسے ہر رگ میں سرائیت کر گئی تھیں۔ جب جنازہ پڑھانے سے حافظ صاحب

انکاری تھے تو پھر اہل کالونی وہ جنازہ کیونکر پڑھتے۔ وہ چپکے سے کھسکنے لگے۔

حب پلکوں پر جمی برف کو جھاڑ کے دیکھتا ہے کہ ان کالونی والوں کے جانے کے باوجود لوگوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا تھا۔ جانے والے بھی پلٹ پلٹ کر دیکھ رہے تھے کہ لوگ کس سمت سے کھنچے چلے آ رہے ہیں۔

''استغفار..... وہ حافظ صاحب کس قدر متکبر ہیں۔'' ایک معمر بزرگ صفوں سے نمودار ہوتا ہے۔

''کیا مرنے والا مسلمان نہیں تھا۔ کیا وہ کلمہ گو نہیں تھا۔'' وہ بزرگ اس کے باپ کے دوست کے والد تھے جو بہت دور سے جنازے میں شرکت کی غرض سے آئے تھے۔ جب وہ جنازہ پڑھانے کی غرض سے آگے آئے تو تابوت کے پاس کھڑا حب محبت سے مسکرا دیا جو اگلی صفوں میں کھڑے تھے۔ وہ اس کے بابا کے دوست تھے۔ اس نے باپ سے کیا وعدہ نبھا دیا تھا۔ اس کے بابا کے سب ہی دوست وفادار ثابت ہوئے تھے۔

☆☆☆

''تمہارے بیگ میں اس وقت جتنی بھی رقم ہے، اسے نکالو..... ہوا لگاؤ..... اڑاؤ اور لٹاؤ۔'' اس کے گروپ کی لڑکیوں نے اتنا کہنے کے ساتھ ہی اس کے کندھے سے لٹکا بیگ جھپٹ لیا تھا۔

''خوامخواہ میں اڑاؤں اور لٹاؤں؟'' تاشیہ نے انہیں الجھن بھرے انداز میں دیکھا۔

''یہ پارٹی خوامخواہ میں نہیں ہوگی بدھو..... بلکہ اس خوشی میں ہوگی کہ اس سالانہ مشاعرے میں تم بھی سلیکٹ ہو چکی ہو۔'' لڑکیاں اسے خوش خبری سنا کر کینٹین کی طرف بھاگیں۔

''واؤ گریٹ۔''

اس خوش خبری کے تمام رنگ اس کے چہرے پہ بکھر گئے۔ اس نے بھی کینٹین کی طرف رخ موڑا۔ وہ ابھی پوری طرح خوش بھی نہیں ہوئی تھی کہ معاً اس نے راہداری کے دوسرے سرے پہ صہیب ولید کی جھلک دیکھی۔ وہ اس شخص کو دور سے دیکھ کر ہی دعا کرنے لگتی تھی کہ ان کی درمیانی راہ میں کوئی دلدل پھوٹ پڑے یا پھر زمین ایک چھوٹا موٹا سمندر ہی اگل دے کہ درمیانی فاصلہ..... فاصلہ ہی رہے گو کہ وہ ابھی کافی دور تھا مگر وہ بے ساختگی میں چار قدم پیچھے ہٹی تو اپنی خالہ زاد مائدہ کے کندھے سے ٹکرائی۔ جو تاشیہ پہ کٹیلی سی نظر ڈال کے صہیب ولید کے استقبال کو آگے بڑھ گئی۔ مائدہ اسی یونیورسٹی میں پڑھاتی تھی سو صہیب سے اس کے خاصے دیرینہ اور دوستانہ تعلقات تھے۔ وہ جیسے ٹہلتا ہوا ان کے قریب آیا۔

''بندے کو اتنا جادو ٹونا تو آنا چاہیے کہ بوقت ضرورت غائب ہوا جا سکے۔'' اسے کبھی کبھار بھی سامنے پا کر وہ اس سے سامنا نہ ہونے کی دعائیں کرتی تھی کہ اسے دیکھ کے دل لمحہ بھر کو اپنی جگہ سے سرک سا جاتا تھا۔

''ایک تو جناب مدت بعد آئے ہیں اور دوسرا حلیہ ایسا ہے کہ دوست تمہیں دیکھ کے خوش ہونے کے بجائے مشکوک ہو چکے ہیں۔''

مائدہ نے اگرچہ اک دوستانہ قسم کا شکوہ کیا تھا مگر اسے صہیب کی مضمحل حالت تشویش میں مبتلا کر رہی تھی۔ وہ جواباً بس مسکرا دیا۔ وہ جس حلیے میں تھا۔ لمحہ بھر کو تاشیہ بھی اس سے نظر نہیں ہٹا پائی اور جب بدحالیاں اوڑھے ہوئے اس شخص نے اس سے نگاہ ملانا چاہی تو اس لڑکی نے بوکھلا کے رخ بدل لیا۔

وہ سر جھکا کے مسکرا دیا۔ وہ کبھی اکیلے میں ملتی تو وہ بتاتا کہ ''تم سامنا ہونے پہ انجان بن جاتی ہو مگر تمہاری آنکھیں مجھے شناخت کر لیتی ہیں۔''

''اس غیر حاضری کا کیا نتیجہ نکالوں کہ یہ فرہاد کہاں کہاں نہریں کھودتا رہا ہے۔''

مائدہ کا شک اور سوال اپنی جگہ پہ اٹل تھا کہ وہ ہنس دیا۔

''توبہ ہے بھئی..... کیا عجیب شکوک ہیں تمہارے۔ ایک اسلحہ فروش کا فرہاد وغیرہ سے کیا لینا

دینا۔"

اس نے بات ہنستے ہوئے ہی مکمل کی۔ اس اسلحہ فروش کے مسکراتے لبوں نے کیا ہی بدترین غلط بیانی کی تھی۔ اس کا فرہاد سے لینا دینا نہیں تھا مگر اس کی خانہ بدوش طبیعت میں اس وقت بھی کوئی مجنوں رقص کر رہا تھا۔ تاشیہ نے اس رقص زدہ وجود سے نگاہ ہٹائی اور اس راہداری سے دور بھاگنے لگی۔

"جب بھی فون کرو، تمہارا یہ والا نمبر بزی ہوتا ہے اور مجھے تم سے ایک بہت ضروری کام ہے لہٰذا مجھے اپنا کوئی دوسرا نمبر دو۔"

وہ دونوں ساتھ ساتھ چلتے اسی سمت جا رہے تھے کہ جس سمت کو اس سے نظریں چرانے والی اور دامن چھڑانے والی جا رہی تھی اور وہ اس بات سے بے خبر تھی۔

☆☆☆

حب اپنے باپ کی گیلی قبر کے پاس دوزانو بیٹھا تھا۔ اسے موسم کی پروا تھی نہ سردی کی۔ اسے گہرے ہوتے اندھیرے کا بھی ڈر نہیں تھا۔ وہ کسی چیز سے خوف زدہ نہیں تھا۔ حب کو اس وقت صرف اپنے باپ کی پروا تھی۔ اسے تازہ قبر کی پروا تھی، جس سے وہ سینہ جوڑ کے بیٹھا تھا۔ اس نے شدت سے دعا مانگی تھی کہ آج کی رات بادلوں کو اس قبرستان پہ برسنا چاہیے جہاں یا تو قبریں پکی ہوتی ہیں یا پھر تازہ اور کچی قبروں کی پروا کرنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ شکر تھا کہ ان برفیلی بوندوں کے بعد بادلوں نے اپنا رخ بدل لیا تھا۔ وہ ایک گھنٹے کے بعد جب واپسی کے راستے پہ آیا، تو راستے میں موجود ان چاروں اشخاص کو دیکھ کے دنگ رہ گیا۔

☆☆☆

"تمہاری دوستیں باہر لان میں دعوت شیراز اڑا رہی ہیں اور تم یہاں اندر منہ لٹکا کے بیٹھی ہو بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ منہ چھپا کے بیٹھی ہو؟"

مائدہ نے سامنے والی کرسی پہ بیٹھتے ہوئے اس پہ بڑی ہی گہری نظر ڈالی، جیسے وہ اس کا چہرہ پڑھ رہی ہو اور اس کا چہرہ تو کوئی ان پڑھ بھی پڑھ سکتا تھا۔

"اب تمہارے کیا ارادے ہیں یار؟" تاشیہ نے اسے آنکھیں دکھائیں۔ "میں جتنا لیٹ ہو چکی ہوں نا تو اگر بابا آج کانفرنس میں بزی نہ ہوتے تو اب تک ان کی بے شمار کالز آ چکی ہوتیں۔"

سارہ نے اس کو صبح ہی صفاچٹ جواب دے دیا تھا کہ میں دوپہر میں نہیں آؤں گی اور اب وہ مائدہ کے سر پہ سوار تھی کہ "میرے ساتھ گھر تک چلو، بعد میں فرقان بھائی تمہیں ڈراپ کر دیں گے۔"

"فکر مت کرو..... خالہ سے میری بات ہو چکی ہے۔ مجھے مارکیٹ میں بس ٹیلر سے سوٹ لینے ہیں پھر تمہیں گھر پہنچا کر مجھے بھی گھر جلدی جانا ہے۔ ویسے ایک بات تو بتاؤ، چلو صہیب کے ساتھ تم لوگوں کا کوئی نہ کوئی حساب نکلتا ہوگا مگر تمہیں فرقان بھائی سے کیوں ڈر لگ رہا ہے۔"

مائدہ کو اس کے یہ بلاوجہ کے خوف کوفت میں مبتلا کرتے تھے۔

"مجھے کسی سے بھی ڈر نہیں لگتا۔ مجھے بس اپنے بابا کی باتیں خوف زدہ کرتی ہیں اور....."

"آہ..... تمہارے بابا!" مائدہ کے منہ میں جیسے کونین سی گھلی تھی۔

مائدہ نے ایک طرف دیکھ کے ہاتھ ہلایا۔ وہ اب اسی جانب آ رہا تھا۔ تاشیہ نے جب گردن موڑ کے دیکھا تو وہ ٹیبل کے قریب پہنچ چکا تھا۔

"کیا یہ اب میرے برابر بیٹھے گا۔" اس کے اوسان خطا ہوئے۔

"پلیز جلدی سے میرا نمبر لکھو۔" وہ آواز مسافر نہیں تھی۔ وہ آواز ٹھکانے ڈھونڈتی تھی اور ٹھکانے بھی رگوں میں ڈھونڈتی تھی۔

"اگر اتنی جلدی میں تھا تو پھر وہاں بیٹھنے کا کیا جواز....."

وہ بند لبوں میں بڑبڑائی اور اس کے بیٹھے ہی اپنی جگہ پہ سمٹ سی گئی۔ برابر میں بیٹھنے کا یہ مطلب تو نہیں تھا کہ اس کمزور دل لڑکی کو نگاہ میں دیوانگی بھر کے

دیکھا جاتا۔ وہ جانتی تھی کہ وہ اسلحہ فروش آنکھوں میں قید خانے لیے گھومتا تھا، اس کی مسکراہٹ ریشمی اور رنگین ڈوریاں مفت میں بانٹتی تھی۔ اس نے مائدہ کے ہاتھ سے مار کرلیا، اب وہ ٹیبل کے کنارے پڑی فائل پر اپنا نمبر لکھ رہا تھا۔ اس مخمل حواس لڑکی نے پلکیں جھپکا کے فائل کو دیکھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اس فائل کے صفحات جل جل کے خاک ہو رہے تھے، کیا کبھی ایسا ممکن تھا کہ صہیب ولید، تاشیہ فخر حیات کی فائل پر اپنا پرسنل نمبر لکھ رہا ہو..... پھر اس تاشیہ نامی لڑکی نے اپنی جگہ چھوڑنے میں تاخیر سے کام نہیں لیا تھا۔ اس کے اس فعل نے مائدہ اور اس کے دوست کو جی بھر کے حیران کیا تھا۔

☆☆☆

وہ واپسی کی راہ پہ آیا تو اپنے باپ کے ان قریبی دوستوں کو اپنا منتظر پا کے حیران رہ گیا۔ جب اس نے اپنے عزیز و اقارب سے کہا تھا کہ میں ابھی قبرستان میں رکوں گا تو پھر اس نے پلٹ کر نہیں دیکھا تھا کہ اس کے ساتھ کوئی اور بھی رکا تھا یا سب چلے گئے تھے۔

''بیٹا! ہم تمہیں اس وقت قبرستان میں اکیلا چھوڑ کے کیسے جا سکتے تھے۔''

وہ آواز ہی مشفق نہیں تھی، اس کے کندھے پہ ٹکنے والا ہاتھ جیسے روح تک محبت سرائیت کر رہا تھا۔ وہ ایک دم ہی بھرپور انداز میں مسکرا دیا تھا، اس نے پلٹ کے درختوں کے جھنڈ پہ نگاہ ڈالی، جن کے پار ایک تازہ قبر تھی۔ وہ ایک مافوق الفطرت منظر تھا، اس نے بہت سے لوگ دیکھے جو اس کے باپ کی قبر پہ پھول نچھاور کر رہے تھے، وہ کچھ بھی سمجھنے سے قاصر تھا۔ کیا اس کا ذہن دیوانگی کی طرف مائل ہوتا جا رہا تھا۔

☆☆☆

وہ دونوں اس وقت شہر کی ایک معروف اور پرہجوم مارکیٹ میں ایک ساتھ جیسے رینگ، رینگ کے آگے بڑھ رہی تھیں۔ تاشیہ، مائدہ کے کندھے سے یوں چپکی ہوئی تھی جیسے اس ننھی منی بچی کو گم ہونے کا خدشہ ہو۔ مائدہ نے اسے ہاتھ سے پیچھے دھکیلا۔ ابھی پون گھنٹہ قبل اس نے کینٹین میں جو حرکت کی تھی اس پر مائدہ کا موڈ ابھی تک خراب تھا۔

''تم اپنی یہ امپچور حرکتیں چھوڑ دو، ورنہ کسی دن بھرے بازار میں تمہیں پیٹ کے رکھ دوں گی۔''

وہ دوپٹہ درست کرتے ہوئے جھنجلائی، مگر وہ بے چاری اس خوف کا کیا کرتی جو اس کی تربیت میں کوٹ کوٹ کے بھر دیا گیا تھا۔ اسی وقت چار پانچ صحت مند خواتین کا گروپ سامنے سے آ رہا تھا۔ اب راستہ کس کو ملتا، وہ دونوں بھی ایک جیولری شاپ کے سامنے رک گئیں۔

''تم جانتی تو ہو کہ اتنی بھیڑ میں میرا دماغ ماؤف ہو جاتا ہے۔'' اس نے اپنی ناراض کزن کا موڈ اچھا کرنے کی کوشش کی۔

''تم بنا بھیڑ اور ہنگامے کے بھی ایسی بے وقوفیوں کا مظاہرہ کرتی رہتی ہو تاشیہ فخر حیات!'' وہ اس کا نام چبا چبا کے بولی۔ جیسے دانتوں تلے اس کا شجرہ چبا رہی ہو۔ ''تم ذرا کینٹین کا منظر یاد کرو، وہاں میں کس قدر شرمندہ ہوئی ہوں۔ مطلب ایک بندے سے بات میں کر رہی ہوں اور ہاتھ پاؤں تمہارے ٹھنڈے ہو رہے ہیں۔ پھر تم وہاں سے یوں سرپٹ بھاگیں کہ الاماں، تم نے اپنی اس حرکت سے اسے بھی چونکایا جبکہ وہ تمہاری طرف متوجہ ہی نہیں تھا۔''

مائدہ نے یہ جملہ جان بوجھ کے ادا کیا۔

''کیسے متوجہ نہیں تھا۔'' وہ جھٹ سے گویا ہوئی۔ اس سے سچ اگلوانے والی دو قدم آگے ہوئی۔ اس بونگی لڑکی سے مسکراہٹ چھپانا بھی تو ضروری تھا۔

''اور تمہیں پتا ہے اس نے وہ نمبر.....''

''اچھا آگے بڑھو، مجھے بھی دیر ہو رہی ہے یار۔''

اس نے تاشیہ کی بات سنے بنا اسے اپنے ساتھ گھسیٹا، جب وہ دونوں ٹیلر شاپ پہ آئیں تو دکان پہ گراشٹر دیکھ کے دھک سے رہ گئیں۔

''او..... نو.....'' مائدہ نے منہ بری طرح

بگاڑا۔ آج اس کے لاڈلے بھتیجے کی پہلی سالگرہ تھی، اس نے یہاں اپنا، امی اور بھابھی کا سوٹ سلنے دیا ہوا تھا۔ جو آج کی تاریخ میں ہی ملنا تھا۔ بہر حال ادھر اُدھر کے استفسار سے پتا چلا کہ ٹیلر کچھ دیر قبل ہی کسی کام سے گیا ہے، گویا واپسی ممکن ہے۔ اب چار و نا چار انہیں انتظار تو کرنا ہی تھا۔

☆☆☆

حب قبرستان سے گھر آیا تو گھر میں دن بھر کا ہنگامہ اور ہجوم مفقود تھا۔ وہاں صرف اس کی ایک ممانی اور خالہ تھیں۔ جو اس کی ماں سے خاصے فاصلے پر بیٹھی آپس میں بات چیت کر رہی تھیں۔ اس کی ماں دیوار سے پشت ٹکائے سوگوار بیٹھی تھی۔ وہ کچھ دیر اس کے پاس رکنا چاہتا تھا مگر اس نے اس پہ نگاہ تک نہیں ڈالی۔ وہ پھر بھی اس کے سامنے بیٹھ گیا، اس نے ماں کے پاؤں پہ اپنے ہاتھ رکھے، اس کی ماں کے وجود کا جمود ایک جھٹکے سے ٹوٹا۔

"اگر حافظ صاحب جنازہ پڑھا دیتے تو شاید تمہارا باپ بخشا جاتا۔"

ایک بار پھر حب کے سر پہ بھاری بوندیں گریں، وہ سر نہیں اٹھا سکا۔

"ہائے بدنصیبی نے تمہارے باپ کا قبر تک پیچھا کیا۔" وہ اب سر پیٹ رہی تھی۔ ماں کے ان الفاظ نے اسے جلتے تندور میں جھونکا۔

"تم مجھے بلاوجہ کی تسلیاں دیتے تھے نا، آج تمہیں یقین آ گیا ہوگا کہ لوگ تمہارے باپ کو یوں ہی بدمعاش نہیں سمجھتے تھے۔ وہ یقیناً غیر قانونی کام کرتا تھا، وہ منشیات فروش تھا۔ وہ اسلحے کا اسمگلر بھی تھا۔ وہ کون سا حاجی نمازی تھا کہ اس کا جنازہ نیک لوگ پڑھاتے۔" وہ پھر سے سسکنے لگی۔

حب کا سر کچھ اور جھک گیا۔ وہ مانتا تھا کہ اس کے باپ کی زندگی ایک عجب ڈھنگ سے گزر رہی تھی مگر اس کے بابا.....

"تمہارا سر دکھ رہا ہوگا، چائے پی لو۔" اس کی خالہ نے اس کے آگے چائے کا کپ رکھا۔ ایک آدھ منٹ بعد چائے پہ اک تہ سی جم گئی۔ سلوٹ زدہ بے کشش تہ — ممکن تھا تہ کے نیچے چھپی چائے خوش رنگ ہو، خوش ذائقہ ہو۔

"ماں کو کھانا کھلا دیں خالہ!" اس نے کندھوں کو ذرا سا سیدھا کیا۔

"ہاں بھابھی اندر کھانا لگا رہی ہیں۔" خالہ نے کپ اٹھا کے حب کے ہاتھ میں تھمایا۔

"تمہارے بابا کے کسی دوست نے کھانا بھجوایا ہے۔" خالہ نے بات کرتے ہوئے اس کا ٹھنڈا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا۔ حب کے ہونٹوں پہ اک تلخ سی آہ ٹوٹ سی گئی۔ گویا ان کے گھر آس پڑوس سے کھانا نہیں آیا تھا۔

"اگر آس پڑوس والے جنازہ پڑھ کے آتے تو شاید کھانا بھی بھیج دیتے۔" اس کی ماں غیر متوقع طنز پہ مسکرائی۔ وہ ایک جھٹکے سے سیدھا ہوا۔

"ان سب کے واپس آنے سے کچھ فرق نہیں پڑا تھا۔ جنازہ گاہ میں اتنے لوگ تھے کہ جگہ کم پڑ رہی تھی۔" بالآخر وہ ضبط کے دائرے سے نکل آیا تھا۔

"ہاں وہ بہت زیادہ لوگ، وہ سب کے سب سیاہ کار اور شریک جرم لوگ تھے۔" وہ تنفر بھری آواز میں چلائی۔

"وہ جیسے بھی تھے، انہوں نے جنازہ تو پڑھا تھا نا انہیں اللہ کے حکم کی پروا تھی۔"

وہ ماں سے کہنا چاہتا تھا مگر وہ خاموش رہا۔ وہ ماں کا دکھ سمجھ رہا تھا جواب ایسے شخص کی بیوہ کہلانے پہ تڑپ رہی تھی کہ وہاں کے رہائشیوں نے جس کا جنازہ پڑھنا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔ اگر حافظ صاحب اس غرور کے ساتھ ہی جنازہ پڑھا دیتے کہ شاید یہ گناہ گار میری وجہ سے بخشا جائے تو ان کی عزت رہ جاتی۔

☆☆☆

دو گھنٹے کی ریش ڈرائیو کے بعد حافظ صاحب اس وقت ایک ملاقاتی کے طور پر اپنے دیرینہ دوست کی شان دار لائبریری میں ٹانگ پہ ٹانگ جمائے بیٹھے تھے۔ چائے پینے کے بعد وہ دونوں دوست ایک

دوسرے کے بولنے کے منتظر تھے۔ اس وقت حافظ صاحب کی ہر جنبش بے چین تھی۔ انہوں نے اسی بے قراری کے ساتھ دوست سے استفسار کیا۔ جس سے آج وہ دو سال بعد اپنے ایک کام سے ملنے آئے تھے۔

"میں نے سنا ہے، تم مجاہد طیب کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہو؟" وہ آگے کو جھک کے نہایت راز داری کے ساتھ گویا ہوئے۔ حالانکہ جس جگہ وہ بیٹھے تھے، وہاں دیواریں بہری ہوتی ہیں۔ سامنے بیٹھے شخص نے نفی میں سر ہلایا۔

"میں کچھ خاص نہیں جانتا۔"

"جانے دو یادر! ابھی کچھ دیر پہلے میری تمہارے ایک پرانے کولیگ سارنگ سے بات ہوئی تھی، لہٰذا تم مجھ پر بھروسا کر سکتے ہو۔" ان کی آواز میں جوش تھا۔ یادر نے نشست کی پشت سے ٹیک لگائی اور مسکرا کے دیکھا۔

"یہ معلومات، یہ تفتیش، تم کن چکروں میں ہو حافظ! حالانکہ تمہارے حلقۂ احباب میں تو پہلے ہی ایسے ایسے مومن ہیں جن کی تہجد بھی کبھی قضا نہیں ہوئی اور اب تو سنا ہے، کسی مہنگے چینل پہ دینی پروگرام کی ہوسٹنگ بھی کر رہے ہو پھر ان سر پھرے نمازیوں اور مجاہدوں سے تمہیں کیا سروکار۔" یادر نے یہ تمام باتیں بے تاثر اور جان چھڑانے والے انداز میں کی تھیں۔

"یار! زندگی میں پہلی بار مجھے کسی معاملے میں تمہارا تعاون درکار ہے اور تم ہو کہ....." یادر کا خشک رویہ محسوس کر کے ان پہ یاسیت سی چھا گئی۔

"یقین مانو، یہ سارے راز و نیاز شاید اتھارٹی جانتی ہوگی۔ میں تو ان کا ایک معمولی سا کارندہ ہوں مگر یہ بتاؤ تم مجاہد طیب کے پیچھے کیوں ہو؟" یادر نے چہرے کو سپاٹ رکھتے ہوئے پوچھا۔

"اب آگے یا پیچھے والی بات ہی نہیں یادر صاحب کہ مجاہد طیب تو اللہ کو پیارا ہو چکا ہے۔" انہوں نے یادر پہ جتاتی نگاہ ڈالی کہ میرے پاس ایک حد تک کی رپورٹ ہے۔

"اگر یہ خبر سچی ہے تو پھر یوں کرتے ہیں مل کے فاتحہ پڑھ لیتے ہیں۔" یادر بھی سنجیدہ چہرے کے ساتھ مسکرایا۔

"میں اس کے جنازہ میں شرکت کرنا چاہتا ہوں۔" حافظ صاحب اپنی بے بسی ضبط کرتے، التجائیہ سا ہو کے اصل مدعا پہ آئے۔

"ہاہاہا....." یادر کا قہقہہ خاصا بلند تھا۔ "مجھے یقین ہے کہ تم نے اس صوبے کے ہر نامور مفتی اور اسکالر کے جنازوں میں شرکت کی ہوگی۔ تمہیں پھر بھی لگتا ہے کہ غازیوں اور مجاہدوں کا جنازہ پڑھنے سے تمہاری بخشش ہو جائے گی۔" یادر کی آنکھوں میں وہ قہقہہ جیسے جم گیا تھا۔

"وہ تو سب ٹھیک ہے مگر میں ایک مجاہد کے جنازے میں بھی شرکت کا شرف حاصل کرنا چاہتا ہوں۔" وہ ضدی لہجے میں گویا ہوئے۔

"یعنی اور ثواب کمانا چاہتے ہو۔" یادر نے ان کے چہرے کے تاثرات کا مزہ لیا۔

"یہی سمجھ لو۔" حافظ صاحب نے کندھوں کو خفیف سی جنبش دی۔

"ثواب، ثواب اور بس ثواب..... یار! کچھ کام اللہ کی محبت میں اور اس کی خوشنودی کے لیے بھی کر لیا کرو تو ہو سکتا ہے اللہ کا جو حکم تم انجانے میں بجا لاؤ، وہی تمہارا حاصل بن جائے۔"

"کیا تم میرا وقت ضائع کر رہے ہو؟" ملاقاتی نے اپنے افسر دوست کو کاٹ دار نظروں سے دیکھا۔ یادر نے ان پہ متاسف نگاہ ڈالی اور اس کی مضطرب آنکھوں میں آنکھیں گاڑ کے بولا۔

"یار! یہ تم پرہیزگار اور حاجی نمازی لوگ کبھی صوفیوں کے حجرے ڈھونڈتے ہو، کبھی اولیاؤں کے ٹھکانے تلاش کرتے ہو، کبھی مجاہدوں کا جنازہ پڑھنے کے لیے جانے کس کس کے آگے گریہ زاری کرتے ہو۔ میری مانو تو اس ساری مشقت کو چھوڑو حافظ صاحب! اپنے ارد گرد رہنے والے غریب غرباء کو پیٹ بھر کے کھانا کھلاؤ۔ اس سے بڑا بھی کوئی ثواب

ہوسکتا ہے۔ خیر تمہیں بتاتا چلوں کہ مجاہد طیب کو اپنا اصل گھر آباد کیے تین چار گھنٹے گزر چکے ہوں گے۔ تم یہ بتاؤ، بھابھی کیسی ہیں اور بچیوں کی اسکولنگ کیسی جارہی ہے؟"

اس نے اصل بات کے بعد موضوع ہی بدل دیا تھا کہ ملال میں گھرے حافظ اس کا سپاٹ چہرہ دیکھتے رہ گئے۔

☆☆☆

پورے ایک گھنٹے کے بعد اس کھڑوس ٹیلر کو اپنی دکان کا خیال آ ہی گیا تھا۔ جب وہ کپڑے اٹھا کے مارکیٹ سے باہر آئیں تو ان کی پہلی نگاہ مائدہ کے بھائی پہ ہی پڑی جو بائیک سے ٹیک لگائے، ان ہی کا منتظر تھا۔ وہ تیزی سے ان کی طرف آیا اور بہن کے ہاتھ سے شاپرز پکڑے، اس نے بہن کے پہلو سے چپکی تاشیہ پہ ایک بھرپور نظر ڈالی تھی کہ وہ اس کے سلام کا جواب بھی نہ دے پائی۔ ولید صہیب کے بعد یہ دوسرا شخص تھا جسے دیکھ کے وہ خوف زدہ ہو جاتی تھی۔

"تم جانتی تو ہو کہ آج منے کی سالگرہ ہے۔ اب اگر پہلے تمہارے ساتھ جاؤں تو پھر اپنے گھر آنے تک میں بہت لیٹ ہو جاؤں گی۔" اس کا گھر مارکیٹ کے نزدیک ہی تھا۔

"تم فرقان بھائی کو فون کر کے پارکنگ سے گاڑی بلواؤ، میں چلتی ہوں۔" وہ سارے فیصلے خود ہی کرتے ہوئے تاشیہ کو ہاتھ ہلاتی آگے بڑھ گئی۔

اب اس خبط الحواس لڑکی نے اپنا کندھا ٹٹولا۔ اس کا دل کہیں کھائی میں گرا یا میرے خدا..... اس کا بیگ تو اس کی دوستوں کے پاس ہی رہ گیا تھا۔ اس نے مائدہ کو پکارنا شروع کیا مگر آواز کہیں گلے میں ہی گھٹ کے رہ گئی۔

☆☆☆

صہیب ولید اس وقت ایک درمیانے درجے کے ریسٹورنٹ میں بیٹھا تھا، وہ وہاں ایک پچھتر سال کے ریٹائرڈ پولیس آفیسر سے نہایت باادب لہجے میں بات کر رہا تھا۔ بات کرتے کرتے اس کی نگاہ انٹرنس پہ اٹھ جاتی، جیسے وہ کسی اور کا بھی منتظر تھا۔ کچھ دیر بعد وہ اندر داخل ہونے والے افراد کو دیکھ کے مسکرایا اور استقبالیہ طور پہ آگے بڑھا، آنے والوں کے وجود سے بھی جوانی جھڑ چکی تھی۔ صہیب نے چہار سو ایک محتاط سی نگاہ ڈالی۔ اب وہ پانچوں افراد چائے پیتے ہوئے جو گفتگو کر رہے تھے، وہ سمجھ سے باہر تھی۔ وہ سر پھرے غازیوں کے قصے تھے۔

وہ مجاہدوں کے انتظار میں بوڑھی ہوتی آنکھوں کے افسانے تھے۔ وہاں غرناطہ کے بوسیدہ محلات کی خستہ حالی کے تذکرے ہو رہے تھے۔ کبھی گفتگو پینترا بدلتی تو باتوں میں بارود کا دھواں پھوٹنے لگتا۔ وہ گفتگو ان چھ افراد کی زبان کو ترش و شیریں ذائقے چکھا رہی تھی۔ ان کی گفتگو میں گھوڑوں کی ٹاپیں اٹھ رہی تھیں۔

☆☆☆

وہ اپنے حواس درست کرنے میں مسلسل ناکام ہو رہی تھی۔ اس نے خود کو پرسکون رکھنے کے لیے لگاتار گہرے سانس لیے مگر لمحہ بہ لمحہ اس کا جسم اکڑتا جا رہا تھا۔ اوپر سے ہوا کا اشتعال اور موسم کے تیور بارش کی نشان دہی کر رہے تھے۔ دکانوں سے اٹھنے والا شور سڑک سے گزرتا دھاڑتا ہوا ٹریفک، دکانوں کے شٹر دھڑا دھڑ گر رہے تھے۔ کیا فرقان بھائی اسے یہاں ڈھونڈ سکتے تھے اور یقیناً وہ اسے ڈھونڈ رہا ہوگا۔ اس نے خود کو تسلی دی، وہ ایک بہادر لڑکی نہیں تھی کہ رکشے یا ٹیکسی کو ہاتھ کے اشارے سے روکتی اور گھر چلی جاتی۔ وہ اکیلے سفر کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی، بالفرض وہ یہاں کسی سے فون مانگ کے کال کرتی تو کہاں کرتی۔ اسے تو سارہ کا نمبر تک زبانی یاد نہیں تھا۔

اسے محسوس ہوا کہ بھٹہ والے کے پاس کھڑے چند لڑکے اس کی حرکات و سکنات پہ نظر رکھے ہوئے تھے، اس پہ طاری گھبراہٹ تو کوئی اندھا بھی دیکھ سکتا تھا۔ وہ آنسو بہانے کا پروگرام منسوخ کرتی مارکیٹ کے مخالف سمت چل دی کہ پارکنگ ایریا مارکیٹ کے

اسی سمت تھا۔

اس نے مڑ کے دیکھے بنا بھی جان لیا کہ وہ لڑکے اس کے پیچھے ہی تھے۔ وہ تیز رفتاری سے چلتی ایک قریبی بوتیک کے اندر گھس گئی۔ اس کی آنکھوں کے آگے تو اندھیرا چھایا ہوا تھا، وہ سامنے سے آتی لڑکی کو کیا دیکھتی سو تصادم کے باعث ہاتھ میں پکڑی فائل نیچے گری۔ وہ لڑکی اسے سوری کرتی فائل اٹھانے کو جھکی تو اس کی نگاہ فائل کے کونے پہ جم کے رہ گئی۔

وہ جب یونیورسٹی میں آئی تھی تو صہیب کا لاسٹ سمسٹر چل رہا تھا، اس کے بعد بھی وہ گاہے بہ گاہے وہاں آتا رہتا تھا۔ وہ دونوں اس عجیب راستے پہ کھڑے تھے جہاں ابتدا کے ذرا آگے ہی اختتام تھا اور وہ شخص اس ذرا سے درمیانی راستے میں جم کے کھڑا تھا۔ اسے نظر انداز کرنا مشکل تھا' اس کی فائل پہ ایک بوجھ کی طرح مسلط وہ نمبر اچانک ہی ایک امید میں ڈھل گیا تھا، وہ اسے مائدہ کا نمبر تو بتا ہی سکتا تھا۔

☆☆☆

وہ کچھ دیر پہلے کے سنے قصوں کو ذہن میں ترتیب دیتا ہوا، گاڑی نہایت احتیاط سے چلا رہا تھا۔ اس کے جسم میں جتنی رگیں تھیں، ابھی اس نے اتنے ہی گنجلک اور پوشیدہ راستوں پہ سفر کرنا تھا تو بزرگوں سے سنی سنائی یہ داستانیں اس کے لیے زادِ راہ تھیں۔ گاڑی گھر کے راستوں پہ رواں تھی جب اس کے سیل کی گھنٹی مدھم سروں میں بجی' اس نے اسکرین پہ نگاہ دوڑائی۔ یہ ایک انجانا نمبر تھا، اس نے نمبر بغور دیکھتے ہوئے کال پک کی۔

''آپ صہیب ہی ہیں ناں.....'' وہ ایک گھبرائی ہوئی آواز تھی۔

''جی، یہ میں ہی ہوں۔'' اس کی حسیات چوکنا ہوئیں۔

''میرا بیگ یونی میں رہ گیا تھا، مجھے کسی کا نمبر یاد نہیں اور ڈرائیور بھی کہیں پارکنگ میں ہے۔ آپ مائدہ کو بتائیں کہ میں یہاں مارکیٹ میں گم ہو چکی ہوں۔'' اس نے وہ تمام باتیں ایک ہی سانس میں کی تھیں۔ وہ بے یقینی سے حیرانی تک آیا اور تیزی سے سارا معاملہ سمجھ گیا۔ وہ یہ بھی سمجھ گیا کہ اس نے غلطی سے اپنا نمبر تاشیہ کے فولڈر پہ لکھ دیا تھا۔

''آپ اس وقت کس جگہ پر ہیں؟'' اس نے اپنے ماتھے کو چھوا۔

''میں ایک بوتیک میں ہوں۔'' اس کی آواز میں گھبراہٹ بدستور قائم تھی۔

''مگر وہ بوتیک کہاں ہے تاشیہ؟'' اس نے جھنجلا کے پوچھا۔

''یہ شاید کریم مارکیٹ کے موڑ پر ہے۔''

''اچھا ٹھیک ہے، میں پہنچ رہا ہوں۔'' اگر وہ یہ کہہ دیتا تو وہ لڑکی بوتیک میں ہی ٹھنڈی پڑ جاتی۔

''میں مائدہ سے بات کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔'' اس نے گاڑی بیک کرتے ہوئے کال کاٹ دی۔ وہ اس شخص کو کبھی یاد نہیں کرتا تھا مگر وہ اس کے حافظے میں رہتا تھا۔ اس وقت بھی گاڑی اسپیڈ سے بھگاتے ہوئے اس کے ذہن میں فخرِ حیات کا چہرہ ابھرا۔ پتھریلا اور مغرور چہرہ۔

☆☆☆

وہ اپنے عہد پر قائم تھا اور اپنی روٹین کے مطابق زندگی گزار رہا تھا۔ اس نے کوئی شہر تباہ کیا تھا اور نہ ہی قتل و غارت کی تھی۔ اس کے ہاتھوں پہ کسی حشرات الارض کا خون بھی نہیں تھا، مگر اس کی وجہ سے ایک خاندان کے دو افراد کا چین و سکون تباہ ہو کے رہ گیا تھا۔ اس کے ایک متکبرانہ عمل نے ایک خاندان کو معاشرتی ہجوم سے نکال کی دیوار کے ساتھ لگا دیا تھا۔

کیا اس نے سوچا تھا کہ گناہ اور ثواب کے چکر میں پڑ کر اس نے جو فیصلہ سنایا تھا، وہ بھیانک نتائج کا حامل تھا۔

جنہوں نے ان کے دکھ سے منہ موڑ لیا تھا۔ اب مرنے والے کی بیوہ اردگرد کے ان رہائشیوں کے ساتھ حق ہمسائیگی کیسے نبھا سکتی تھی۔ اسے جانے کب تک ان قریبی لوگوں کے دکھ سکھ سے کٹ کے رہنا تھا۔ کیا اس نے سوچا تھا کہ مرنے والے کا بیٹا جب گلی

میں نکلے گا تو باپ کا جنازہ چھوڑ کے بھاگنے والے چہروں کو کس نظر سے دیکھے گا، اس نے یہ بھی نہیں سوچا تھا کہ جب اب اپنے علاقے کی مسجد میں جمعہ بھی کیونکر ادا کرتا، جس کی خطابت اور امامت حافظ صاحب کرواتے تھے۔

☆☆☆

ان کا تعلق نسلوں پر محیط نہیں تھا۔ ان کے تعلقات اہل کالونی کی حد تک بھی خوش گوار نہیں تھے پھر بھی وہ اس لڑکی کے لیے بہت زیادہ پریشان ہو رہا تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ صہیب نے تاشیہ کو پہلی بار یونی میں دیکھا تھا۔ بھلے دور سے سہی، بھلے سرسری سا ہی سہی مگر انہوں نے بہت پہلے سے ایک دوسرے کو دیکھ رکھا تھا۔

فخر حیات نامی گرامی بندہ تھا، اس کی بیٹی جس تعلیمی ادارے میں بھی جاتی تو باپ کی شہرت اس کے ساتھ ہوتی۔ سو وہ بھی یونی میں تاشیہ کی جوائننگ سے جلد ہی باخبر ہو گیا تھا۔ وہ اس بات سے اچھی طرح باخبر تھا کہ فخر حیات اپنی فیملی کو سیپ میں موتیوں کی طرح رکھتا ہے۔

ایک دن وہ دانستہ اور اچانک اس کے مقابل آ گیا تھا۔ بتانے والوں نے تاشیہ کو بتا رکھا تھا کہ یہاں صہیب ولید بھی پڑھتا ہے۔ جب وہ راستے میں آیا تو اس وقت وہ مسجد اریا کی سنسان روش پہ تھی۔ تاشیہ نے اسے ایک سیکنڈ میں پہچان لیا۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ فخر حیات کی فیملی میں ایسے کون سے محلات جڑے تھے جہاں کسی عام انسان کا قیام ناممکن تھا۔ اس روز اس نے ایک ضدی سی کیفیت کے زیر اثر تاشیہ کو کچھ زیادہ ہی دھیان سے دیکھ لیا تھا کہ اس کی پیشانی پہ ابھرنے والی ان چند بوندوں کا وہ آج تک متبادل نہیں ڈھونڈ سکا تھا۔ وہ چند بوندیں اوس تھیں، پسینہ تھا، خوف تھا یا پشیمانی۔ میدے سے بنی وہ لڑکی جس طرح سانس لے رہی تھی، کیا وہ اس سے خوف زدہ تھی۔ یا وہ ہر کسی سے ہی ڈرتی تھی۔

پھر آنے والے وقت میں صہیب نے جان لیا کہ واقعی تاشیہ حیات کی ذات میں اک مکمل جزا تھا جس کی بالکونیوں پہ اس کے باپ نے بڑی بڑی جادوگرنیاں بٹھا رکھی تھیں اور خوف ناک شکلوں والے پہرے دار تعینات تھے۔ تب ہی تو وہ لڑکی ڈری سہمی سی رہتی تھی۔

یونی چھوڑنے کے بعد وہ وہاں اس کے لیے کب جاتا تھا، وہ وہاں عمر رسیدہ جادوگرنیوں کا نظارہ کرنے جاتا تھا۔ وہ تو یہ دیکھنے جاتا تھا کہ وہ میدے جیسی لڑکی آج بھی گن گن کے سانسیں لیتی ہے یا اس نے اب صہیب ولید سے بے خوف ہو کر، بدصورت پہرے دار ہٹا دیے تھے۔

اس نے گاڑی بوتیک کے قریب ہی پارک کی۔ وہ خاصی عجلت میں اندر آیا کہ بوتیک کا گلاس ڈور آواز کے ساتھ بند ہوا۔ وہ اندر آیا تو تاشیہ کا چہرہ دوسری جانب تھا۔ وہ چند لمحے خاموش کھڑا اسے دیکھتا رہا۔

"آپ کو کچھ ہیلپ چاہیے سر؟" کاؤنٹر کے پیچھے کھڑی لڑکی پیشہ ورانہ مسکراہٹ کے ساتھ اس کی طرف آئی۔ تاشیہ نے پلٹ کے دیکھا۔ کیا وہ گمان بھی رکھتی تھی کہ پلٹ کے دیکھنے پر اسے صہیب نظر آئے گا۔ وہ اپنی آنکھوں پر یقین کر سکتی تھی کہ وہ سامنے کھڑا تھا۔ کیا وہ اس پر بھروسا کر سکتی تھی، وہ دو قدم آگے آیا۔

"میرا مائدہ سے رابطہ نہیں ہو سکا مگر میں تمہیں ان کے گھر تک ڈراپ کر سکتا ہوں۔" اس نے یہ جملہ سوائے تاشیہ کے ہر چیز پہ نگاہ دوڑاتے ہوئے بولا تھا۔

"تم نہیں جانتیں سیرت! یہ لوگ کس قدر حاسد اور موقع پرست ہوتے ہیں۔" اسے باپ کی گفتگو یاد آئی۔

اس نے لبوں کو زبان پھیر کے تر کیا۔ آخر وہ اس بوتیک میں کب تک ٹک سکتی تھی۔ اس کے پاس ایک راستہ تھا کہ وہ اس سے پارکنگ کھنگالنے کا کہتی..... مگر آج تو فرزند چچا کے بجائے اس کے ساتھ فرقان تھا، وہ صہیب کے لیے اجنبی چہرہ تھا۔ وہ

اعتماد سے محروم لڑکی اپنے باپ کی باتوں کے سوا، کسی پہ اعتبار نہیں کرتی تھی۔ وہ ایک ٹھنڈی جھرجھری لے کر رہ گئی، اب ایک دشمن پہ اعتبار کرنا اس کی مجبوری تھا اور کوئی راستہ نہیں تھا۔

☆☆☆

تاشیہ کے فون پر ہنوز کالز جا رہی تھیں مگر وہ پک نہیں کر رہی تھی۔ اس وقت سیرت کی حالت یہ تھی کہ جیسے جسم سے جان نکلی جا رہی تھی۔ ایک تو موسم خراب تھا، دوسرا رات ہونے والی تھی۔ اسے مائدہ پہ بھی حد سے سوا غصہ تھا جو اسے مارکیٹ میں اکیلا چھوڑ کے خود گھر بھاگ گئی تھی اور فرقان بے چارا جو آج پہلی بار اپنے باپ کی ڈیوٹی بھگتانے آیا تھا۔ اب ایک گھنٹے سے مارکیٹ میں خوار ہو رہا تھا۔ ان کا دل پھٹ رہا تھا کہ یہ سب کیوں ہو رہا ہے، اس کی معصوم سی بیٹی کو جانے کس مصیبت کا سامنا تھا۔ سارہ پہ بھی ماں کی گرج برس مسلسل جاری تھی۔

"اگر تم اسے لینے چلی جاتیں تو یہ سب نہ ہوتا" وہ بے چاری بالکل گم صم سی بیٹھی تھی۔

"تھوڑی دیر پہلے تمہارے بابا کا فون آیا تھا، وہ بس گھر پہنچنے والے ہوں گے تو سوچو، اب آگے کیا ہوگا؟" وہ ہاتھ باہم پھنسا کر بے چینی سے ٹہل رہی تھی۔

"حیرت ہے امی! آپ کو اس وقت بھی بابا کے غصے کی پروا ہے حالانکہ آپ کو اس وقت صرف تاشیہ کی پروا ہونی چاہیے۔ بس اب بابا سے ہم کچھ نہیں چھپائیں گے، بابا کے کئی دوست اونچی پوسٹس پہ ہیں، وہ جلد ہی....."

"خبردار.....خبردار تم نے تاشیہ کے متعلق اپنے باپ سے کچھ الٹا سیدھا نہیں کہنا۔"

وہ سارہ کی بات کاٹ کے اس قدر درشتی سے بولی کہ سارہ کا رنگ فق ہوا۔

"ابھی کچھ دیر تک ہمیں تاشیہ کی کال کا انتظار کرنا ہے۔" وہ ماں کے سرخ چہرے کو پھٹی آنکھوں کے ساتھ تکے جا رہی تھی جس کو بیٹی کے بجائے اپنی ذات کی فکر تھی، کیا تھا۔ اگر بابا انہیں ایک بار پھر احمق، کم عقل، گھامڑ یا غافل عورت کہہ لیتے۔ کیا تھا اگر ایک بار پھر وہ بیوی کے خاندان کو جدید اور انگلش گالیوں سے نواز لیتے۔

"فخر حیات، مہر حیات کا بیٹا ہے اور مہر حیات ایسا انسان تھا جس کے بیٹے بھی اگر کچھ وقت باہر گزار کے آتے تھے تو اس کی نظریں انہیں قصائی کی طرح ٹٹولتی تھیں۔ وہ ان کی نبض چیک کرتا تھا۔ آج تو پھر بیٹی کا معاملہ ہے۔ تاشیہ کی یہ گھنٹے بھر کی گمشدگی اسے باپ کی نظروں میں تاعمر بے وقار کر دے گی۔"

اس کی ماں نے یہ کیسی بات بتائی تھی۔ سارہ جیسے دھواں دھواں ہوئی۔ وہ سارا دھواں اس کے گلے میں اٹکا۔

"کیا دنیا میں اس کا باپ اور دادا ہی پرہیزگار تھے یا پھر آدم کی اس دنیا میں ان دو انسانوں کے علاوہ سب حیوان تھے۔ سب ناپاک تھے کہ جن کا سایہ پڑتے ہی اس گھر کے باسی ناپاک ہو جاتے تھے۔ سارا بس اتنا جانتی تھی کہ دنیا اتنی خراب نہیں تھی، جتنا اس کے باپ دادا کا گمان خراب تھا، جتنا ان کا اخلاق خراب تھا۔

☆☆☆

وہ مارکیٹ سے مائدہ کے گھر کا راستہ اچھی طرح جانتی تھی مگر اس وقت اندھیرا پھیل چکا تھا۔ اس کے حواس سن تھے، وہ راستے کو شناخت نہیں کر پا رہی تھی۔ وہ محتاط تھی اور کھڑکی کے ساتھ سکڑ کے بیٹھی تھی

"جو لوگ ہمارے معیار اور ہماری برابری کو نہیں چھو سکتے، یہ اندر سے ہمارے خلاف ہوتے ہیں۔ یہ موقع پرست ہوتے ہیں۔"

وہ اپنے باپ کی ایسی اور کئی باتوں کو ذہن سے جھٹک نہیں پا رہی تھی۔ وہ اس وقت اپنے باپ کے ناپسندیدہ ترین شخص کے رحم و کرم پر تھی۔ اس نے صہیب کو مشکوک نظروں سے دیکھا، وہ اس وقت کیا سوچ رہا ہوگا' کیا وہ صحیح سمت جا رہا تھا؟

"آپ مجھے کہیں اور تو نہیں لے کے

جارہے؟" وہ اپنے وہموں کے پیش نظر ہکلا کے بولی۔ دل الگ دھک دھک کی بازگشت سنا رہا تھا۔ گاڑی کی رفتار دھیمی ہوئی پھر گاڑی سائڈ پر ہوتے ہوتے ایک ہلکے جھٹکے سے رکی۔

صہیب نے شکوک میں گھری اس لڑکی کی بات پہ اسے حیران کن یا متعجب نظروں سے نہیں دیکھا تھا۔ اس نے بس اسے دیکھا جیسے دل عزیز ہستی کو پہلی بار قریب سے دیکھتے ہیں، جیسے ان چہروں کو دیکھتے ہیں جنہیں دوبارہ دیکھنا شاید نصیب میں ہو، شاید نہ ہو۔

"میں تم سے بات کروں گا اور اس دن کروں گا، جب تمہارے ساتھ توہمات کے یہ کالے پیلے پہرے دار نہیں ہوں گے۔ جب تمہارے ساتھ شکوک کی ماری ہوئی، لمبے دانتوں والی جادوگرنیاں نہیں ہوں گی، جس دن تم اکیلی ہوگی، جس دن تم کہو گی، آؤ صہیب! بات کریں۔"

وہ اپنی ہی اس بات پہ ہنسا۔ اس بزدل لڑکی نے اسے یوں دیکھا جیسے کسی پاگل کو دیکھتے ہیں۔

"کون سے پہرے دار..... کون سی جادوگرنیاں؟" وہ اس سے کس زبان میں بات کر رہا تھا، اس نے اب سامنے دیکھتے ہوئے گاڑی اسٹارٹ کی۔

"جو ہمارے اندر قیام کر لیتے ہیں، انہیں ہم غلط راستوں پہ نہیں بھٹکاتے اور آدم کی اس دنیا میں پرہیز گار بہت کم ہوں گے مگر ایک دوسرے کے اندر قیام پذیر بہت زیادہ ہیں تاشیہ!" اس نے یہ بات بھی سامنے دیکھتے ہوئے کی تھی۔

☆☆☆

اس اتفاق کو کیا وہ اب گمان میں بھی لا سکتی تھی کہ وہ ابھی دو منٹ پہلے صہیب ولید کی گاڑی سے اتری تھی۔ وہ حافظے پر زور دیتی تو کیا یاد آجاتا کہ وہ ایک گھنٹہ قبل مارکیٹ میں خود کو گمشدہ سمجھ رہی تھی اور وہ شخص اسے ڈھونڈنے آیا تھا، وہ یہ خود سے منوا سکتی تھی کہ آج کی شام وہ کسی مشکل کا شکار تھی۔ اس نے مائدہ کے گھر کو پرسکون نظروں سے دیکھا پھر ان کی ڈور بیل کو چھوا۔

"میں جانتا ہوں کہ آج کل کسی دوست پر بھی اعتبار ممکن نہیں۔ دشمن تو پھر دشمن ہے۔"

اس کے ذہن میں وہ کرخت لہجہ بھنبھنایا۔

وہ دونوں یہیں خوب جانتی تھیں کہ ان کا باپ انہیں اس دشمن کا حوالہ دیتا ہے جس دشمن نے پوری زندگی میں صرف فخر حیات کو ایک پیغام بھیجا تھا کہ "ایک دن فخر حیات اس حد تک پچھتائے گا کہ وہ طویل العمر پچھتاوا ہوگا جو اس کے ساتھ ہی دفن ہوگا۔" وہ سر جھٹک کے مسکرائی، اس نے دشمن پہ جان بوجھ کے اعتبار نہیں کیا تھا لیکن آج اس نے جان لیا تھا کہ وہ مشکل باتیں کرنے والا شخص قابل اعتبار ہے۔

دروازہ اس کے خالہ زاد عاطف نے کھولا۔ عاطف کی آنکھیں خیرہ ہوئیں۔

"زہے نصیب——"

وہ بڑی ترنگ میں مسکرایا۔ اس نے تاشیہ کے سفید چہرے سے نظر ہٹا کے باہر گلی میں جھانکا۔ تاشیہ ہوٹل میں جانے کے بجائے گھر کیوں آئی ہے، وہ بھی تن تنہا——

"مجھے اندر تو آنے دو۔" وہ اس کی گم صم حالت پہ اکتا کے بولی۔ وہ تحیر میں گھرا سامنے سے ہٹا۔ وہ اندر آئی تو اس کا استقبال گہرے سکوت نے کیا۔ وہ اب خالی صحن میں حق دق کھڑی تھی اور اس کے سامنے بنا سنورا عاطف کھڑا تھا۔ صحن میں اس کے پرفیوم کی تیز مہک ویسے ہی چکرا رہی تھی، جیسے اس وقت تاشیہ کا سر چکرا رہا تھا۔

"تم ہوٹل جانے کے بجائے گھر آگئی ہو، تو اب اتنی زیادہ پریشان کیوں ہو۔"

وہ اس کی پریشان حالت دیکھ کے اپنی دل داریاں بھول چکا تھا گویا گھر میں عاطف کے علاوہ صرف وہ تھی۔ اس کی ہتھیلیوں پہ چیونٹیاں رینگیں۔

"تم ادھر اندر آ کے بیٹھو، میں تمہارے لیے پانی لاتا ہوں۔" وہ کچن کی طرف بڑھا تو وہ وہیں صحن میں

پڑی کرسی پر گر گئی۔ یہ آج اس کے ساتھ کیا ہو رہا تھا۔ عاطف نے اسے پانی کا گلاس دیا پھر دوسری کرسی گھسیٹ کے اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ تو وہ مزید حواس باختہ ہوئی۔

"میں بھی ابھی ہوٹل کے لیے نکلنے ہی والا تھا، مگر تم بتاؤ کہ یہ سب کیا ہے اور تم کسی بھٹکی ہوئی روح کی طرح کہاں پھر رہی ہو۔"

اس کی مسکراہٹ محض ایسے چھیڑنے جیسی تھی، مگر تاشیہ کے لیے وہ ایک موقع پرست انسان کی مسکراہٹ تھی۔

"وہ دراصل مم..... میں اب تک مارکیٹ میں ہی تھی۔" اس نے وہ جملہ کانپتی آواز میں ہی مکمل کیا۔ وہ ایک بار پھر ازلی خوف کا شکار ہو چکی تھی۔

"تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے، تم کانپ رہی ہو۔او..... مائی گاڈ۔ کیا تمہیں بخار ہے۔"

وہ گہرے تفکر سے گویا ہوا اور بے اختیار ہی اس کے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھا۔ وہ ہاتھ جیسے ایک بھاری پتھر تھا کہ وہ کوشش کے باوجود سرکا سکتی تھی نہ ہٹا سکتی تھی۔

"مجھے ہاتھ مت لگاؤ۔" اس نے اپنی تمام ہمتیں سمیٹ کے یہ مختصر جملہ ادا کیا کہ عاطف کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ اس نے اپنا ہاتھ برق رفتاری سے ہٹا لیا۔

"میں تمہیں ہاتھ کیوں لگاؤں گا، میں تو تمہاری طبیعت کی وجہ سے....."

"میری امی سے یا سارہ سے بات کروا دیں پلیز۔" وہ ٹپاٹپ آنسوؤں کے درمیان بولی۔

"تم جس سے کہو، میں بات کرواتا ہوں مگر مجھے اتنا گھٹیا تو مت سمجھو۔" وہ سرخ چہرے کے ساتھ بولا۔

تاشیہ نے جھٹکے سے سر اٹھایا۔ اعتماد و اعتبار سے محروم وہ لڑکی بے یقینی کا شکار تھی۔

"ٹھیک ہے، میں تمہیں پسند کرتا ہوں، اس بات پر میرا اختیار نہیں ہے مگر میں تمہیں اپنانے کے خواب نہیں دیکھتا۔ اس لیے نہیں کہ میں تمہارے حسب نسب کے ہم پلہ نہیں۔ بلکہ اس لیے کہ اکمل فخر ہم سے کوئی تعلق، واسطہ رکھنا ہی نہیں چاہتے۔ صرف اتنی سی بات پہ کہ مائدہ نے بچپن کا رشتہ ختم کر دیا ہے اور اکمل کے خیال میں مائدہ کا باپ اور اس کے بھائی اس بے غیرتی میں برابر کے شریک ہیں، کیونکہ انہوں نے ایک عورت کا ساتھ دیا۔"

عاطف اب خاموش ہو چکا تھا۔ وہ اپنے فون پہ اس کے گھر کال ملا رہا تھا۔ تاشیہ خشک آنکھوں کے ساتھ اسے دیکھے جا رہی تھی، اس کا باپ جب اس کی ماں کے سامنے ان کی خالہ کی فیملی کے متعلق بولتا تھا تو اس فیملی کو دو کوڑی کا کر دیتا تھا۔

دنیا اتنی بری نہیں تھی، اس کے باپ کی زبان بری تھی۔ اس کا اخلاق برا تھا۔

"لو خالہ سے بات کرو۔" عاطف نے اسے مسکرا کے دیکھا، اس کی مسکراہٹ شائستہ تھی۔

☆☆☆

شوہر کو گھر میں آتا دیکھ کے اس کا دل جیسے بند ہوا مگر وہ جبراً مسکرائی۔ وہ گھر سے کچھ فاصلے پر تھا جب اس نے سیرت کو فون کر دیا تھا کہ "میرے کپڑے تیار رکھنا۔ میں ایک دوست کے ہاں ڈنر پر انوائٹ ہوں۔" وہ دونوں آگے پیچھے کمرے میں آئے۔

"تم لوگوں کا دن کیسا گزرا..... اور بچیاں کیا کر رہی ہیں۔" وہ دسیوں بار بھی گھر آنے پر یہی سوال دہراتا تھا۔

"اللہ کا شکر ہے، سب ٹھیک ہے۔" سیرت کا جواب بھی رٹا رٹایا ہوتا مگر آج اس نے معمول سے ہٹ کے بات کی۔

"میں نے آپ کا یہ ڈریس منتخب کیا ہے، اب پتا نہیں اس ڈنر کے لیے سوٹ ایبل ہے کہ کچھ اور نکالوں۔" وہ اس کے قریب سے گزرتی ہوئی بیڈ کی طرف آئی۔

وہ جو اس سے دو قدم پیچھے تھا، وہ تیسرا قدم نہیں اٹھا سکا۔ اس نے بیوی کو بغور دیکھا جس کے چہرے

پر معمول کا رنگ غائب تھا۔ وہاں ایک الگ سی کیفیت رقم تھی، فخر حیات کا ماتھا ٹھنکا۔ اس نے سیرت کی جانب پیش قدمی کی۔

"آریا پھر پار—" سیرت نے اسے تھوک نگل کے دیکھا۔ وہ بات نہیں اک دھماکا تھا جس سے یہ گھر ہی نہیں، فخر حیات کا وجود بھی چیتھڑا چیتھڑا ہونا تھا۔ اس نے ایک بار پھر اللہ سے سب ٹھیک ہونے کی التجا کی۔ اس نے اللہ سے ان ہی لمحات میں سب ٹھیک ہونے کی دعا کی۔

"سارہ اور تاشیہ کہاں ہیں؟" اگر وہ اپنے باپ کی طرح جابر تھا تو باپ کی طرح کائیاں بھی تھا۔ اس نے جان لیا کہ کچھ تو کہیں پہ غائب ہے۔

"میں بس آپ کو بتانے ہی والی تھی کہ—" سیرت کے فون کی گھنٹی چیخی، جو وائے قسمت اس کے ہاتھ میں ہی تھا۔ یہ ایک وقتی راہ نجات تھی۔ دوسری طرف فخر حیات کی جان پہ بنی تھی کہ وہ اسے کیا بتانے والی تھی۔

"امی! میں خالہ کے گھر پر ہوں، آپ فرقان بھائی کو بھیجیں۔" سیرت نے جواباً ایک مختصر سرگوشی کی اور فون بند کر دیا۔ وہ یک بارگی روح تک چمک اٹھی تھی۔ "اے مالک! میرے ہر اچھے گمان کو ہمیشہ یوں ہی یقین عطا کرتے رہنا۔"

"وہ آج آپا کے پوتے کی پہلی سالگرہ تھی تو میں نے تاشیہ کو....."

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" وہ اپنی بات مکمل نہ کر سکی۔ "میں تمہیں ہزار بار منع کر چکا ہوں، میں اپنی بچیوں پر تمہارے رشتے داروں کا سایہ بھی برداشت نہیں کر سکتا تو پھر تم نے اتنا بڑا فیصلہ کس سے پوچھ کے کیا ہے؟"

وہ جو زمانے بھر کے لیے شائستہ لب و لہجہ رکھتا تھا، وہ بیوی سے اس قدر جاہلانہ طریقے سے اس کے خاندان کی خوبیاں بیان کر رہا تھا کہ اس کی آواز سیرت کی سانسوں پہ اک بھاری دباؤ ثابت ہو رہی تھی۔ اس نے تاشیہ سے مدھم سرگوشی کی تھی کہ سارہ سے بات کرو، اب وہ مطمئن تھی کہ سارہ نے تمام معاملات سنبھال لیے ہوں گے۔

ٹھیک آدھے گھنٹے بعد جب وہ فرقان پہ برس رہا تھا تو وہ حقیقت بھول چکا تھا کہ فرقان اس کے چچا زاد بھائی کا بیٹا ہے۔ اسے بس یہ یاد تھا کہ وہ باقی لوگوں سے اپنے ڈرائیور کو زیادہ تحویل دیتا ہے۔ تاشیہ کی شامت سب سے آخر میں آئی تھی۔

ایک عورت تین مردوں کو جہنم رسید کر سکتی ہے اور یاد رکھو کہ عورتوں کی وجہ سے صرف بزدل مرد جہنم رسید ہوتے ہیں۔"

وہ یہ بات انیس دفعہ تو فوقتاً یاد دلاتا رہتا تھا۔ اس کے باپ کا لہجہ اور انداز کاٹ دار دار سے بھی زیادہ سخت تھا لیکن آج وہ باپ کی چیخ و پکار پر لرز، لرز کے بستر میں دبکی۔ نہ اس نے فالتو آنسو بہائے۔

اس کا آخری ڈر فرقان فرزند تھا۔ جب وہ اس تن تنہا، ڈری سہمی لڑکی کو رات کے اندھیرے میں بحفاظت گھر لے آیا تو اس کے تمام ڈر کسی مائع کی صورت بہہ گئے۔ آج وہ کانپ کانپ کے کسی لکڑی کی طرح سخت ہو گئی تھی۔ آج وہ لکڑی میں ڈھلی تو دنیا کو نئی نظر سے دیکھا۔ اس رنگ برنگی دنیا میں کوئی پتھر کا تھا، کوئی سونے کا، کوئی لکڑی کا۔ صرف وہ ہی مٹی کی تھی۔ اسے آج احساس ہوا کہ انسانوں کے اس جنگل میں وہی سفر کرتا ہے جو مٹی کے وجود کو کئی دھاتوں میں ڈھال کے جیتا ہے۔

باپ کے سامنے فرقان کا جھکا ہوا، سر دیکھ کے اس نے جان لیا کہ طاقت کا غلط استعمال آپ سے وابستہ لوگوں کو لکڑی اور پتھر میں ڈھال دیتا ہے پھر مٹی کا انسان اس پتھر اور لکڑی سے خوف زدہ رہنے لگتا ہے۔

☆☆☆

وہ جائے نماز پر بیٹھی تسبیح پڑھ رہی تھی جب لمحہ بھر کو بے حرکت ہوتی تو جب جان لیتا کہ ماں اس کی طرف متوجہ ہے۔ وہ گیلے بال برش کرنے کے بعد صحن میں آیا تو جائے نماز خالی تھی۔ وہ گھڑی اٹھانے کی

غرض سے ٹیبل کی طرف آیا جو کچن کی کھڑکی کے ساتھ رکھی تھی۔

"بیٹا! کھانا تیار ہے۔" وہ اسے پر تو لتا دیکھ کے تیزی سے کچن کے دروازے میں آئی۔

"آ کے کھالوں گا، خطبہ شروع ہونے والا ہے۔" اس نے مجلت میں بات کی اور اسی رفتار سے صحن عبور کیا۔

"تمہاری ٹوپی، فون اور گاڑی کی چابی جائے نماز پر پڑی ہے۔" ماں کی اس بات نے اس کے پکڑ لیے۔ بچ کے پانچ گھر چھوڑ کے تو آگے ہی مسجد تھی اور وہ ہمیشہ باجماعت نماز ادا کرنے والا پچھلے چھ دنوں سے گھر میں نماز پڑھ رہا تھا تو کیا آج وہ جمعہ کی نماز بھی گھر میں پڑھتا۔ وہ باپ کے کسی بھی عمل پہ خود شرمندہ تھا نہ اسے دنیا سے منہ چھپانے کی ضرورت تھی پھر اس بات سے ماں کا کیا مطلب تھا۔ وہ پوچھنے کی غرض سے واپس پلٹا مگر وہ پیش قدمی کر چکی تھی۔

"آج تمہارے کسی بھی دوست نے ہمارے دروازے پہ دستک نہیں دی مگر مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑا۔" ماں نے یہ بات نگاہ ملا کے کی تھی۔ ماں کیا سمجھتی تھی کہ جب نے ان دستکوں کا انتظار نہیں کیا۔ اس نے نگاہ چرالی۔

"مجھے بھی اس سب سے کوئی فرق نہیں پڑا۔" وہ تیزی سے گویا ہوا۔

"مجھے اچھا لگے گا نہ میں کبھی چاہوں گی کہ تم اب حافظ کی امامت میں نماز پڑھو۔"

وہ دوٹوک لہجے میں بولی۔ حب کی پیشانی نے چند بوندیں اگلیں۔ ٹھنڈی، یخ اور بھاری..... پھر وہ قدم گھسیٹتے ہوئے آگے بڑھا، اس نے جائے نماز سے فون، ٹوپی اور گاڑی کی چابی اٹھائی۔ اس دن سترہ سالہ حب ٹھنڈی پیشانی کے ساتھ روڈ پہ جس اسپیڈ سے گاڑی بھگا رہا تھا۔ اس کا ذہن بھی اتنی ہی تیزی سے کام کر رہا تھا، اس کے تعلق، اس کے دوست اس کی گلی کی مسجد، سب کچھ پیچھے رہ گیا تھا۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب آگے اس نے کیا کرنا ہے۔

☆☆☆

وہ ایک عجیب کیفیت میں تھی۔ اسے پرسکون ہونے کے لیے کچھ وقت درکار تھا۔ وہ باپ کے موڈ سے واقف تھی، وہ دو دن کی غیر حاضری کے بعد یونی آ ہی گئی۔ وہ وہاں آ کر مزید پریشان ہوئی کہ سالانہ تقریب کے لیے اس کی تمام دوستوں نے تقریباً آدھی ادھوری تیاری تو کر ہی لی تھی۔ سو وہ یونی سے آتے ہی سارہ کے سر پر سوار ہوئی۔

"مجھے جلدی سے کچھ لکھ کر دو یار! کہ بیچ میں بس چار دن تو رہ گئے ہیں۔

"میں اب کچھ نہیں لکھ سکتی۔ وہ اور زمانوں کی بات تھی۔"

سارہ نے ریموٹ اٹھا کر آواز تیز کی تو پچاس انچ کی ایل ای ڈی پہ کسی میوزیکل شو کا غل غپاڑہ، سارہ کے لیے وقتی سکون ثابت ہوا۔ سٹنگ روم میں آتی سیرت نے ٹی پہ افسردہ نگاہ ڈالی۔ وہ اپنے تایا زاد کو پسند کرتی تھی مگر فخر کے رعب و دبدبہ کے زیر اثر وہ لوگ رشتہ مانگنے کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔

دوسرا سارہ جب سے تعلیم سے فارغ ہوئی تھی تب سے فخر نے رشتہ دیکھنے دکھانے جیسا سلسلہ شروع کر رکھا تھا مگر اس کے نزدیک کوئی لڑکا بھی مکمل مسلمان نہیں تھا سو اس تمام صورت حال نے مل کر سارہ کو ضدی اور باپ سے متنفر سا کر دیا تھا۔ تاشیہ نے اس کے ہاتھ سے ریموٹ جھپٹ کے آواز بند کی۔

"آپی پلیز، موڈ خراب کرنے کے بجائے کچھ لکھنے کی کوشش کرو۔ یہ میری قابلیت اور عزت کا سوال ہے۔" وہ بہن کے کندھے سے لگ کر التجائیہ سی ہوئی۔

"اگر بابا کو بھنک بھی پڑ گئی نا کہ تم وہاں مشاعروں اور مباحثوں میں حصہ لینے لگی ہو تو محترمہ تمہارا یہ لاسٹ سمسٹر ادھورا رہ جائے گا۔ لہٰذا اپنی اوقات میں رہ کے صرف علم حاصل کرو۔

یہ بھی ان کی مجبوری تھی کہ ان کی ایک کلاس ہے جہاں ان سے سوال کیا جاتا ہے کہ ہاں بھئی فخر حیات!

بچیاں کیا پڑھ رہی ہیں، کہاں پڑھ رہی ہیں۔ یہ جو ہمیں ہائی فائی تعلیمی اداروں کے منہ دیکھنا نصیب ہوئے ہیں نا تو بابا کے ان ہائی فائی تعلقات کی بدولت ہوئے ہیں۔"

سیرت نے ایک محتاط سی آہ بھرتے ہوئے ٹیبل سے میگزین اٹھایا۔

سارہ نے جو بھی کہا تھا، لفظ بہ لفظ سچ تھا مگر سیرت کو اس کا تاشیہ کے سامنے باپ کے خلاف بولنا بہت برا لگتا تھا۔

"میں نے تم سے پہلی اور آخری بار فرمائش کی ہے، چلو اک نظم ہی لکھ کے دے دو۔"

بہن کے اس قدر طویل لیکچر کے بعد بھی تاشیہ کی رٹ وہی کی وہی تھی۔ سیرت ان کی گفتگو میں دخل اندازی سے عموماً پرہیز ہی کرتی تھی۔ اس وقت بھی وہ میگزین اٹھا کے اپنے کمرے میں جانے لگی تو ٹھنڈک محسوس ہونے پہ اس نے پردہ سرکا کے کھڑکیاں چیک کیں۔ جو کہ ادھ کھلی تھیں۔

"توبہ کرو تاشی! میں پھر سے شاعری کروں یعنی اپنے باپ کے لیے جہنم کا ایندھن تیار کروں۔" وہ بے تاثر آواز کے ساتھ ہنسی۔

سیرت جیسے ہل کے رہ گئی، اس کی ہنسی اور کھڑکیاں پھلانگتی خنکی میں کچھ فرق نہیں تھا۔

"حالات جیسے بھی ہوں مگر لڑکیوں کی زبان اور لہجہ کیوں گستاخ ہو۔" وہ آخری کھڑکی بھی کھٹاک سے بند کرتی ہوئی پلٹی۔

تاشیہ نے ماں کو حیرت سے دیکھا، وہ اس انداز میں بات کرنے کی عادی نہیں تھی۔

"کیوں امی! کیا بابا نے میرا نحیف سا مسودہ ہوا میں اچھالتے ہوئے ایسا نہیں کہا تھا۔" وہ روبرو ہوتی ہوئی تڑخ کے بولی۔

"وہ تمہارا باپ ہے، جو مناسب سمجھتا ہے وہی کرتا ہے۔" وہ جتنی نرم تھی، اتنی ہی سخت بھی ہو جاتی تھی۔ وہ اکثر سہیلی رہتی تھی مگر بسا اوقات اس کا ماں بننا ضروری ہو جاتا تھا۔

"اس مسودے میں کیا نامناسب تھا، چند موسم تھے۔ سبز اور پیلے پتوں کی کہانیاں تھیں۔ چند ایک خوش رو اور خانہ بدش تتلیاں تھیں۔ جب بابا نے ان صفحات کو پھاڑ کے پھینکا تو اس سب سمیت میں بھی اس قیمتی قالین پہ کہیں اوندھے منہ گری تھی۔"

اسے احساس ہی نہیں ہوا کہ وہ رو رہی تھی۔

سیرت کے قدم بھی اس قیمتی قالین پر گڑ کے رہ گئے۔ یہ تمام سچویشن تاشیہ کی سوچ کے خلاف تھی۔ اسے سارہ کے آنسوؤں نے پریشان کیا، اسے ماں کے زرد پڑتے چہرے نے بھی تکلیف دی مگر آج اس کے جسم پہ رعشہ طاری ہوا۔ نہ ہی پہلے کی طرح بھاگ کے اس نے کہیں پناہ ڈھونڈی تھی۔

☆☆☆

رات کو جب تاشیہ نے ٹیبل لیمپ آف کرتے ہوئے دیوار کی جانب کروٹ بدلی تو اسے وہ پراسرار شخص یاد آیا۔ اسے سارہ کی شاعری میں اڑتے خوش رنگ پرندے یاد آئے۔ وہ فی الوقت وہ منظر بھول جانا چاہتی تھی، جب سارہ کے مسودے سے الگ ہو کر ہرے اور پیلے پتوں کی کہانیوں نے دم توڑ دیا تھا۔ شاید وہ کچھ دیر تک سو ہی جاتی کہ یک دم ٹیبل لیمپ جادوئی طور پر آن ہوا۔ کیونکہ سارہ تو گھنٹہ بھر پہلے منہ سر لپیٹ کے سو چکی تھی پھر ایک سرسراہٹ سی ہوئی تو اس نے ڈرتے ڈرتے رخ بدلا، وہ ہاتھ میں کاغذ اور قلم لیے بیڈ سائیڈ پر کھڑی تھی۔ تاشیہ کے چہرے پہ مسکراہٹ پھیلی۔

"اچھا بتاؤ، ٹاپک کیا ہے۔" اس نے کرسی گھسیٹی اور لیمپ تلے صفحہ کھولا۔

"نیرہ کو سمندر، ساحل کشتیاں اور محبت.....
جبکہ مجھے برف، سردی، جاڑا اور محبت....."

سارہ کے دل کی کیفیت بدلی لیمپ تلے پڑے خالی صفحے کی کیفیت بھی بدلی۔ اس کورے صفحے نے سارہ کو پہچان لیا تھا۔ اس نے اپنے قریب ہوتی قلم کی نوک کو اک راز سے آگاہ کیا۔

"یہ ایک مشکل ٹاپک ہے کہ سردیوں میں کھلی

کھڑکیوں کو دھیرے سے بند کر دینا آسان ہوتا ہے مگر کہرے کے موسم میں بند کھڑکیاں بہت مشکل سے کھلتی ہیں۔"

☆☆☆

وہ جانتا تھا کہ اسلحہ کی چھوٹی سی دکان کے چار دروازے ہیں۔ایک پورا چکر لگانے کے بعد اس نے گاڑی اس دروازے کے سامنے پارک کی، جو کشادہ اور مین سڑک پہ کھل رہا تھا پھر وہ پیدل چلتا ہوا، ایک لمبا چکر کاٹ کے اس دکان کے عقبی دروازے کی طرف آیا۔ وہ چاہتا تو باقی دو دروازوں کا کھوج باآسانی لگا سکتا تھا، اس نے دستک کے بجائے دروازے پہ چابی بجائی۔ اس نے چند لمحوں بعد بجائے دستک کے دروازے پر یوں انگلی بجائی، جیسے دف بجاتے ہیں۔ اس نے تیسری بار دستک دینے کے لیے ہاتھ اٹھایا تو دروازہ فوری کھل گیا۔ دروازہ کھولنے والے کے چہرے پر پریشانی تھی، نہ حیرت۔ جیسے وہ اسے کسی خفیہ آنکھ سے دیکھ چکا تھا۔ آنے والے کو خوب دیکھنے کے بعد اس نے پیچھے پلٹ کر دیکھا، باقی تینوں بھی ان ہی کی طرف دیکھ رہے تھے شاید وہ ان کا اشارہ پاکر اسے اندر لے آیا۔ ان چاروں کے تاثرات عجیب تھے۔اس نے ہلکی سی پریشانی محسوس کی، جیسے وہ سب اسے پہچاننے سے انکاری ہو سکتے تھے۔ وہ چھ روز قبل یہاں اپنے باپ کی فوتگی کی اطلاع دینے آیا تھا، تب وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ یہاں دوبارہ آئے گا۔

"تمہاری ماں جانتی ہے کہ تم اس وقت کہاں ہو؟" جو اس سے مخاطب ہوا تھا، اس کا لہجہ متفکر تھا۔

"نہیں۔ میں جمعہ پڑھنے کے بعد سیدھا ادھر آیا ہوں۔" اس نے سر جھکا کے جواب دیا۔

"کیا گھر میں کوئی مسئلہ ہے یا کوئی دوسری پریشانی ہے۔" تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد اسی شخص نے دوبارہ سوال کیا۔

"ایسا کچھ بھی نہیں ہے انکل!" حب نے اس کی طرف دیکھ کر جواب دیا۔اب وہ سر اٹھا کر اس کے اگلے جملے کا انتظار کر رہا تھا۔

"گو کہ تمہارا چچا ایک ایمان دار آدمی ہے۔ پہلے بھی تمہارے بابا کی غیر موجودگی میں دکان وہی سنبھالتا تھا اور ہمارا خیال ہے کہ تمہارے ذمہ دار ہونے تک وہ یہ کاروبار سنبھال سکتا ہے پھر بھی بیٹا! آپ کو اس سے یا کسی سے بھی کوئی مسئلہ ہو تو تم ہمیشہ ہمیں اپنے ساتھ پاؤ گے۔" بات کے اختتام پہ اس کا ٹھوس لہجہ اور بھی مضبوط ہوا۔

"اب گھر جاؤ بچے! تمہاری ماں پریشان ہو رہی ہوگی۔" وہ اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کے شفقت سے مسکرایا تو حب کا سر اثبات میں ہلا مگر اس کی نگاہ اس انکل کے آہنی چہرے پر جمی تھی۔

اس نے چائے ختم کی پھر اپنی ذہین اور پرعزم آنکھیں اس کی آنکھوں میں گاڑ کے بولا۔

"میں آپ کے ساتھ مل کر وہی کام کرنا چاہتا ہوں جو میرے بابا کرتے تھے۔" اس نے سامنے بیٹھے شخص کے سر پہ گویا بم پھوڑا تھا۔

☆☆☆

"تم دو دنوں سے آ رہی ہو اور میرے ڈیپارٹمنٹ یا میرے آفس کا ایک چکر بھی نہیں لگایا، اس سے صاف ظاہر ہے کہ تم مجھ سے ناراض ہو۔" وہ دونوں اس وقت اولڈ ہال روم کے ایک کونے میں کھڑی تھیں۔وہ جواباً مسکرائی۔

"میں تم سے ناراض بھی ہو سکتی ہوں اور تمہارا یہ شکوہ اسی پیکنگ میں تمہیں لوٹا رہی ہوں۔" اس کے چہرے پہ شرارت تھی، اس کی نگاہ سامنے تھی جہاں لڑکیاں ڈرامے کی ریہرسل کر رہی تھیں۔

"تم اپنی بات کے اول حصے پہ عمل کر چکی ہو لیکن یہ پیکڈ شدہ شکوہ مجھے دینے کے بجائے اپنے بیگ میں رکھ لو کیونکہ میں گزشتہ روز اس طرف آئی تھی۔ جب تم گیم گراؤنڈ کے سرے پہ اکیلی کھڑی شاہ بلوط کے درختوں پہ کچھ دم کر رہی تھیں۔"

مائدہ اپنے جہازی سائز بیگ میں منہ گھسائے بولی پھر بیگ میں سے اک کارڈ برآمد کرتے ہوئے

اس کے ہاتھ میں پکڑایا۔
''سب کچھ آناً فاناً ہی ہوا ہے۔ جھٹ منگنی اور پٹ بیاہ والا معاملہ ہی سمجھو۔ اب اس شور شرابے میں مزید بات نہیں ہو سکتی، سو کل ملیں گے ان شاء اللہ۔''
وہ اسے ہاتھ ہلاتی آگے بڑھ گئی۔ تاشیہ نے کچھ سمجھی اور نا سمجھی کے عالم میں ہاتھ میں موجود کارڈ کو دیکھا۔ اس کے چہرے نے کئی رنگ بدلے اور آنکھوں میں نمی ابھری۔ مائدہ اس کی اکلوتی خالہ کی اکلوتی بیٹی تھی۔ سیرت پہ اپنے شوہر کا خوف اس قدر سوار تھا کہ وہ تمام رشتے داروں سے کٹ کے رہ گئی تھی۔ اس نے مائدہ کو دیکھا جو پلک جھپکنے میں دروازے تک پہنچ چکی تھی۔ وہ کل کا انتظار نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے دوڑتے ہوئے ہال کراس کیا۔
''مائدہ رکو پلیز.....'' وہ اب کوریڈور میں آمنے سامنے تھیں۔
''یہ کیا ہے؟'' اس کو کارڈ دکھاتے ہوئے وہ غیر متوازن لہجے میں بولی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتی رہیں۔
''یہ میری شادی کا کارڈ ہے۔'' اس نے پلکیں جھپکنے میں پہل کی۔
''اور بتایا نا کہ یہ سب معاملات ہفتہ دس دن طے پا گئے تو ابو نے کہا، لڑکی اٹھائیس برس کی ہو چکی ہے۔ اب مزید دیر نہیں ہوگی، اب اسے کہتے ہیں سرپرائز۔'' اس نے کندھوں کو اک ادا سے اچکایا۔
''یہ ایک شان دار سرپرائز ہے لیکن خالہ کو امی سے یہ بات شیئر کرنی چاہیے تھی کہ تمہاری بات پکی ہو رہی ہے یا تمہاری شادی کی ڈیٹ فکس ہونے والی ہے۔ تم نے یوں غیروں کی طرح ایک دم کارڈ پکڑا کے کیا ثابت کیا ہے؟'' وہ شدت ضبط سے سرخ ہوئی۔
''کم آن تاشی! اب ایسی باتیں کر کے خود کو ہلکان کرو، نہ مجھے ڈسٹرب کرو اور تمہاری امی کوئی عام عورت نہیں۔ وہ مسز فخر حیات ہیں اگر انہیں شرکت کی اجازت نہ ملی تو وہ احتجاجاً بھوک ہڑتال تو نہیں کریں گی ناں۔'' وہ پھیکا سا مسکرائی۔
''معاف کرنا تاشیہ! مگر تمہارے بابا—— پتا نہیں ان کے نزدیک وہ کون سے عمل ہیں جو باعث ثواب ہیں۔ انہیں تو ہم جیسے عام لوگوں کو عزت دینا بھی گناہ کے برابر لگتا ہے۔ اپنی بیٹی کے لیے سینکڑوں رشتے ٹھکرانے کا ان کے پاس جواز ہے کہ آج کل کا ہر لڑکا شرعی عادات سے دور ہے اور بیٹی کے لیے انسان کے چناؤ پہ وہ روز قیامت خدا کے سامنے جواب دہ ہوں گے۔ دوسری طرف کوئی لڑکی از خود ایک کریکٹر لیس کے ساتھ رشتہ ختم کرنے کا مطالبہ کرتی ہے تو ان کے نزدیک وہ باغی اور بے حیا ٹھہرائی جاتی ہے۔ اس لڑکی کا باپ اور بھائی اس لیے بے غیرت ہیں کہ انہوں نے اپنی بیٹی کو چوٹی سے پکڑ کے اس اوباش کے ساتھ رخصت کیوں نہیں کیا۔''
مائدہ کا لہجہ اگر اس سے بھی تلخ ہوتا تو بجا تھا۔ وہ حقیقت بتا رہی تھی۔ تاشیہ کی گردن خود بخود ہی جھک گئی۔

☆☆☆

''مجھے تم لوگوں میں آمنہ نظر نہیں آ رہی۔'' مائدہ ہجوم پہ نگاہ ڈالتے ہی پریشان ہوئی۔
''میڈم! وہ آج نہیں آئی۔'' ہجوم سے اک لڑکی چلائی۔
''اوہ نو۔'' مائدہ کا منہ بنا۔ ''اسے معلوم بھی تھا کہ آج فائنل ریہرسل ہے۔'' اس نے ہاتھ میں پکڑا اسکرپٹ فولڈ کرتے ہوئے ایک طائرانہ نگاہ ڈالی پھر اس کی نگاہ تاشیہ پہ ٹھہر گئی گو کہ تاشیہ کا اس پلے میں کوئی رول نہیں تھا مگر وہ یہ تمام ریہرسل دلچسپی سے دیکھ رہی تھی۔
آج دو تین دنوں کے بعد دھوپ نکلی تو وہ سب آڈیٹوریم کے بجائے لان میں میلہ لگائے بیٹھی تھیں۔
''تاشیہ! پلیز ادھر آؤ اور مشک بادہ کا رول کرنے والی لڑکی کے ساتھ گل سیمیں کے ڈائیلاگز تم بولتی جاؤ لیکن ذرا ایکٹ کرتے ہوئے۔''
تاشیہ نے اس حکم پہ اسے گھورا مگر وہ اس کی

گھوریوں کو خاطر میں کہاں لاتی تھی۔ مائدہ انہیں آمنے سامنے کر کے ایک دوسرے گروپ کی طرف آ گئی جہاں لڑکیاں اور لڑکے لائیو ناک شو کی ریہرسل کر رہے تھے مگر یوں لگ رہا تھا جیسے وہاں قہقہوں کی پریکٹس ہو رہی ہے۔ وہ ان کے کان کھینچ کھانچ کے پہلے گروپ کی طرف واپس آئی، اس نے سنگی بنچ پہ بیٹھتے ہوئے ابھی کمر ٹکائی ہی تھی کہ وہ ایک دم سامنے آ گیا۔

''تم بھی کمال ہو مائدہ! مجھے بلاوا بھیج کے خود آفس سے غائب ہو جاتی ہو۔'' صہیب نے اس ہدایت کار کو خفگی سے مخاطب کیا۔ مائدہ نے شرمندہ ہوتے ہوئے اسے بیٹھنے کو کہا۔

''دراصل آج سب کچھ فائنلی ایکٹ ہو رہا ہے تو میرا ذہن بہت الجھا ہوا ہے۔ تم بتاؤ چائے لو گے یا کافی۔'' وہ ابھی جواب میں بتانے ہی والا تھا کہ اس کی توجہ اس آواز نے کھینچی۔

''سنو مشک بادہ! تم اس محل میں جب مہمان بن کر گئے تھے تو شہزادہ یاقوت سے بدلہ لینے گئے تھے اور میں گل سیمیں جس کے ذمے ان دنوں شہزادے کے عہدہ دار مہمانوں کو اپنی معیت میں دیوان خاص تک لانا تھا۔'' اس نے لڑکیوں کی بھیڑ میں اسے دیکھنے کی کوشش کی۔

''اور تم مشک بادہ! تم نے میرا حسن اور شہزادے کا مجھ پر التفات دیکھ کے نہایت غلط اندازہ لگایا تھا۔

''بائی گاڈ!'' وہ ہنسا۔ ''اس صدی کی لڑکی بھی الف لیلوی قصوں کی گرویدہ ہے۔ آج کی لڑکی بھی شہزادی کی باتیں کرتی ہے۔'' اس نے لڑکیوں کے جھرمٹ میں تاشیہ کو تلاشا۔

''کیا اس صدی کے لوگوں نے محبت کرنا چھوڑ دی ہے۔'' مائدہ نے اس پہ معنی خیز اور ترچھی نگاہ ڈالی تو وہ معصومیت سے کندھے اچکا کے رہ گیا۔

''پھر اس صدی کے شہزادے اکثر گنجے ہوتے ہیں، اس لیے ہم لڑکیاں آج بھی طلسمی کہانیوں کی دلدادہ ہیں۔'' مائدہ نے یہ بات مسکرا کے کی تھی مگر وہ اس کی بات پہ خوب ہنسا۔ وہ جب مائدہ سے بات کر رہا تھا وہ جب ہنس رہا تھا اس کا دھیان تب بھی داستان گو میں اٹکا تھا، جہاں مشک بادہ نے گل سیمیں کے متعلق غلط اندازہ لگایا تھا اور وہ اندازہ کیا تھا، وہ تاشیہ کی آواز کا منتظر تھا۔

''میں نہیں جانتی تھی مشک بادہ کہ تم وہاں بدلہ لینے آئے تھے اور تمہارا ہدف گل سیمیں ہی تھی۔'' وہ اس کی آواز پہ اکتفا نہیں کر پا رہا تھا۔ وہ اسے دیکھنے کا متمنی تھا مگر وہ کچھ محتاط سی آہیں بھرنے کے سوا کیا کر سکتا تھا۔

''تاشیہ! یہ تم کیا کر رہی ہو؟'' مائدہ دانت پیس کے گویا ہوئی۔

''تمہیں ہر ڈائیلاگ کے ساتھ لہجہ بھی بدلنا ہے۔ اگر تم بنا تاثرات کے بات کرو گی تو مشک بادہ تاثرات کیا خاک دے گا۔'' مائدہ نے اسے بلند آواز میں ٹوکا۔

''او کے۔ میں کوشش کرتی ہوں۔'' یہ لٹھ مار آواز تاشیہ کی تھی۔ کچھ لڑکیاں ادھر اُدھر ہوئیں تو اس کا دل بھی جیسے نگاہ ہوا' اب وہ سامنے تھی اور بول رہی تھی۔

''تم مجھے شہزادہ یاقوت کی محبوبہ سمجھ کے بھگا لے گئے تھے اور تم کیا سمجھتے تھے، تم مجھے میری مرضی کے بنا بھگا لے گئے تھے۔ نہیں ..... یہ آسان نہیں تھا۔ یہ ناممکن تھا۔ میں آج تمہیں بتاؤں مشک بادہ.....!''

اس نے گھوم کے رخ بدلا اور وہ بے حرکت ہوئی۔ صہیب نے جیکٹ کی جیبوں سے ہاتھ نکال کے سینے پہ لپیٹے۔ اس کی نگاہ میں شرارت تھی، دلچسپی تھی اور بہت کچھ تھا۔

''کیا وہ اسکرپٹ چھوڑ کے بھاگ جائے گی۔ صہیب کا ارتکاز اور گہرا ہوا۔ وہ اک ذرا الجھی۔ اک ذرا تذبذب کا شکار ہوئی۔ پھر اس نے اپنی نگاہیں اسکرپٹ پہ مرکوز کیں۔ وہ اب دوبارہ مشک بادہ سے مخاطب ہوئی۔

"جب تم مجھے محل سے بھگانے کے پروگرام بنا رہے تھے تو تم نہیں جانتے تھے، تمہاری اس جدوجہد میں گل سیمیں کی مرضی بھی شامل تھی۔ تم مجھے اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ تمہاری بھول تھی۔ سچ یہ تھا کہ میں تمہارے ساتھ آئی تھی پھر تم نے مجھے جس رئیس کے ہاتھ بیچا، میں جب چاپ بکتی رہی۔ اگر میں زبان کھول دیتی، حقیقت اگل دیتی تو تم مجھے واپس محل بھیج دیتے جبکہ میں....."

"بس یہ ڈائیلاگ اس نے کچھ ٹھیک سے ادا کیا ہے۔" اس کی توجہ میں مائدہ کی آواز مخل ہوئی۔

"یہ داستان خاصی دلچسپ معلوم ہوتی ہے۔" وہ مسکرایا۔

"نہیں، یہ بہت عجیب داستان ہے، اس کا اینڈ حیران کر دیتا ہے۔" مائدہ نے شادی کا کارڈ اس کے ہاتھ پہ رکھا۔

"اور ہاں، جب شادی پہ عاطف سے ملاقات ہو تو اس بات کا ذکر نہ کرنا کہ اس کی جاب کے لیے تم نے سفارش کی تھی۔"

اس نے جتنی تیزی سے بات ختم کی، صہیب نے اتنی ہی تیزی سے سر ہلایا۔ وہ محسوس کر چکا تھا کہ تاشیہ نے اپنی ذات کے گرد سے وہ کالے پیلے پہرے دار ہٹا دیے تھے۔ آج اس کی آواز میں کپکپاہٹ کی جگہ اعتماد تھا۔ اس کی آواز نے صہیب کو اس داستان میں الجھا لیا تھا۔

"گل سیمیں تمہاری قید میں کبھی تھکی نہ بھاگی کیونکہ اسے تم سے پہلی ہی نظر میں محبت ہو گئی تھی۔"

"آہ..... کیا تھا اگر وہ یہ جملہ بولنے سے قبل رخ نہ بدلتی اور کمال ہوتا اگر مشک بادہ کا رول وہ کر رہا ہوتا۔ اس کی ٹھنڈی آہ نے مائدہ کو مسکرانے پر مجبور کیا۔

"ابھی یہ داستان باقی ہے لیکن میرے گھر سے بار بار کالز آ رہی ہیں تو مجھے نکلنا ہوگا۔" وہ بیگ سنبھالتے ہوئے اٹھی پھر دو قدم چلنے کے بعد رکی۔

"جو داستان ابھی جاری ہے، بہتر یہی ہے کہ اپنی دلچسپی ختم کرتے ہوئے اسے ادھورا چھوڑ کے بھاگ جاؤ۔"

مائدہ نے ایک ہی جملے میں کیا کچھ نہیں کہہ دیا تھا کہ وہ تیز دھوپ میں برف کی ڈلی رکھ کے چلی گئی تھی۔ اس کی نگاہ پھر بھی اسی لڑکی پر تھی جو مائدہ کے جاتے ہی اسکرپٹ چھوڑ کے بھاگ گئی تھی۔ وہ اب لان کی باڑھ پھلانگ کے اس سے دور جا رہی تھی اور وہ گل سیمیں کی حقیقت جاننا چاہتا تھا۔

☆☆☆

تین چار غیر حاضریوں کے بعد آج دھوپ کی آمد ہوئی تھی، جو اچھی لگ رہی تھی۔ وہ کھڑکی میں کھڑی تھی جب اس نے شوہر کو کوریڈر میں دیکھا۔ وہ اخبار پڑھتے فرزند کے پاس رکا جو ہڑبڑا کے مؤدب ہوا تھا۔ حالانکہ وہ عمر میں اس سے بڑا تھا۔ فخر نے اپنی ریسٹ واچ پہ نگاہ ڈالی۔

"تاشیہ بیٹی کی یونیورسٹی میں فنکشن وغیرہ ہے تو اس نے مجھے دیر سے آنے کا بولا تھا۔" فرزند کی بات پہ فخر کا چہرہ تناؤ کا شکار ہوا۔

"کیا پتا وہ جلدی فارغ ہو جاتی..... تو تمہیں گھر کے بجائے یونیورسٹی کے باہر رکنا چاہیے تھا۔" اس بات پہ سیرت کا دماغ چیخ کے رہ گیا۔

جو لوگ خود عمل نہیں کرتے، وہ گھر میں یا کسی بھی محفل میں جس موضوع پہ اور جتنی بھی بڑی بڑی باتیں کر لیں، لوگ وہ محفل چھوڑتے ہی ان کا وعظ نصیحت بھول جاتے ہیں۔

اس بندے کے قول و فعل کا تضاد اس کی عبادتوں اور اس کی پرہیز گاریوں کو پس منظر میں دھکیل دیتا تھا۔ آج وہ اتنی اپ سیٹ تھی کہ اس کا دل چاہ رہا تھا، آج وہ پیر پٹختے ہوئے اور اسے تند نظروں سے گھورتے ہوئے اس کے سامنے آئے۔

وہ یہ سب تو نہیں کر سکی، لیکن اس نے اتنا کیا کہ جب شوہر سامنے آیا تو وہ آج اپنے چہرے پہ مخصوص مسکراہٹ نہیں سجا سکی۔ آج اس نے فخر حیات کا فیورٹ قہوہ بھی بے دلی سے بنایا تھا۔ وہ پہلا گھونٹ

بھرتے ہی چونکا۔
"آج قہوہ بناتے وقت تمہارا دھیان کدھر تھا؟" وہ کسی بھی معاملے میں درگزر کا عادی نہیں تھا، اس نے قہوہ ٹیبل پر پٹخنے کے انداز میں رکھا۔
"آج سر میں بہت درد تھا تو شاید جلدی میں۔۔۔۔"
"سر میں درد تھا تو قہوہ بنانے سے پہلے دوا لے لیتیں۔" وہ ہنوز درشتی سے گویا ہوا۔ یہ نئی بات نہیں تھی، وہ اس کا فقرہ شاید کبھی کبھار ہی مکمل ہونے دیتا ہوگا۔ فخر کی رعونت اس کا جملہ تلوار کی طرح کاٹ لیا کرتی تھی۔
"اگر تم شادی میں شمولیت کی وجہ سے دماغ خراب کیے بیٹھی ہو تو کان کھول کے سن لو، تم بھلے پاگل خانے پہنچ جاؤ میں پھر بھی اجازت نہیں دوں گا۔" وہ دبے لہجے میں پھنکارا۔
وہ انسان تھی۔ آج اس کا ضبط بھی بری طرح چٹخا۔
"میرا دماغ کسی شادی کی وجہ سے خراب نہیں ہوا بلکہ تمہارا پروگرام دیکھ کے خراب ہوا ہے فخر حیات صاحب! کیا ہوتے ہیں یہ حقوق العباد۔۔۔۔ اور کیا ہوتی ہے اقربا پروری۔۔۔۔ آپ کو اس ٹاپک پہ بات کرنے کا کوئی حق نہیں تھا۔"
"تم کہنا کیا چاہتی ہو؟" اس کی آنکھوں سے غضب چھلکا۔
"آپ کیمرے کے سامنے بیٹھ کے جو بھی کہہ رہے ہوتے ہیں، وہ صرف آپ کے فینز اور آپ کے نامی گرامی دوستوں تک نہیں پہنچ رہا ہوتا ہے۔ وہ پروگرام میری اور تمہاری برادری بھی دیکھ رہی ہوتی ہے۔ تمہاری آج کی گفتگو کے نتیجے میں میرا آدھا دن تو رشتے داروں کی کالز پک کرتے گزرا ہے اور تمہاری باتوں سے متاثر ہو کر کل تمہاری بھابھی زین کے لیے سارہ کا ہاتھ مانگنے آ رہی ہیں۔" اس کی آواز آج شوہر کے سامنے پہلی بار اونچی ہوئی تھی۔
"کیا بکواس کر رہی ہو تم؟" وہ اس کی باقی تمام گستاخیاں فراموش کرتا ہوا، اس بھاوج والی بات پہ تلملا کے اٹھا۔
"بھابھی اپنے بیٹے کی کس خوبی کے پیش نظر میرے گھر رشتہ ڈالنے آ رہی ہیں، جو صرف جمعہ پڑھنے کی حد تک مسلمان ہے۔"
"سارہ دو ماہ پہلے اٹھائیس برس کی ہو گئی ہے۔ اب تو تاشیہ کی بھی تعلیم مکمل ہونے والی ہے۔ آپ یوں ہی ہر رشتہ ریجیکٹ کرتے رہے تو بچیوں کی عمر نکل جائے گی۔ زین سلجھا ہوا لڑکا ہے، پھر اچھا کماتا ہے۔ جب اللہ ہدایت دے گا تو وہ حاجی اور نمازی بھی بن جائے گا۔ ابھی آج ہی تو آپ ٹی وی پہ کہہ رہے تھے کہ بچوں کے رشتے کرتے وقت پہلا حق قریبی رشتے داروں کا ہونا چاہیے۔" وہ اپنی آواز کا دم خم توڑتے ہوئے نرمی سے گویا ہوئی۔ آج قسمت نے موقع دیا تھا تو وہ سارہ کے لیے ایک حد تک تو کوشش کر سکتی تھی۔
"مجھے زین یا کسی کے بھی متعلق تمہاری رائے درکار نہیں۔ سمجھیں تم۔۔۔۔ اور زین جیسوں کو ہدایت ملے گی، یہ تمہاری بھول ہے۔ سو دفعہ تو میں اسے مختلف لڑکیوں کے ساتھ لنچ اور ڈنر کرتے ہوئے دیکھ چکا ہوں۔" وہ استہزاء سے ہنسا۔
"خدا کے لیے فخر حیات! اس بات کو سمجھو کہ جو نظر آ رہا ہوتا ہے وہی سچ نہیں ہوتا۔ ہو سکتا ہے وہ لڑکیاں اس کی کولیگز ہوں، اس کی کلاس فیلوز ہوں اور ان کے ساتھ ڈنر یا لنچ کرنا اس کے کریکٹر لیس ہونے کی دلیل نہیں ہے اگر ہم ڈھونڈنے نکلیں تو یہاں کوئی غازی اور مجاہد بھی ہمیں اصل صورت کے ساتھ نظر نہیں آئے گا۔ کچھ معاملات میں اللہ پہ بھی بھروسا کر لیا کرو یا پھر اپنی بیٹیوں کو گلے کا ہار بنا کے بیٹھے رہنا۔" اس نے جاتے جاتے اپنی خواہش پوری کی۔ وہ پیر پٹختے ہوئے اور اسے تند نگاہوں سے گھورتے ہوئے ایک کمرے میں گھس گئی۔
"اب یہ احمق مجھے بتائے گی کہ اصل کیا اور نقل کیا ہے۔" وہ بڑبڑایا۔

"اب کیا میں اس سے پوچھ کے پروگرام کیا کروں گا جو اتنا بھی نہیں جانتی کہ یہ اقربا پروری جیسے موضوعات ہم ان جاہلوں کے لیے کرتے ہیں، جنہیں کسی بات کا علم ہی نہیں۔" اس نے نخوت سے سر جھٹکا۔

☆☆☆

اسے صہیب کے بارے میں اتنا علم تھا کہ وہ ایک جہاں گرد انسان ہے۔ وہ بظاہر اسلحہ فروش تھا لیکن اس کی شہرت یہ تھی کہ دو پہروں کا وہ معزز شخص اپنی شامیں رندوں اور سازندوں کی محفلوں میں گزارتا تھا اور تاریکیوں میں گم ہو کے وہ اک اسرار میں ڈھل جاتا تھا۔ اس کے باپ اور اہل علاقہ کی نظر میں صہیب ولید روشن اور قابل ذکر کارناموں کا مالک نہیں تھا۔

وہ عصر کی نماز پڑھنے کے بعد اب مسجد کے احاطے میں بیٹھی اس شخص کے متعلق سوچ رہی تھی جس کی مشکوک شہرت کے باوجود وہ تاشیہ کو سارہ کے مسودے میں رکھے، ان موسموں کی طرح لگتا تھا جن میں ہرے اور پیلے پتوں کی کہانیاں تھیں۔ چند خوش رو اور خانہ بدوش پرندوں کی اڑانیں تھیں۔ وہ سارہ کے مسودے کا انجام جانتی تھی، وہ محبت کے اس مختصر موسم سے ان پتوں اور ان پرندوں کو اڑا دینا چاہتی تھی کہ صہیب ولید، اس کے بابا کی نظر میں مشک بادہ تھا جوان کے محل میں صرف بدلہ لینے کی غرض سے آتا۔

دس منٹ احاطے میں گزارنے کے بعد اب وہ مسجد سے ملحق سیڑھیوں پر آ بیٹھی۔ وہ ابھی گھر نہیں جانا چاہتی تھی مگر وہ یہاں بھی کب تک بیٹھی رہتی۔ اسے یہ پرسکوت جگہ اور یہاں کے قدیم درختوں کی خاموشیاں متاثر کرتی تھیں۔

"میں تمہیں ابھی پیغام بھیجنے ہی والا تھا کہ ابھی باہر مت آنا۔ میں راستے میں کھڑا ہوں۔" وہ تھوڑا آگے آیا تو اس کی مسکراتی آواز تاشیہ کی سماعتوں سے ٹکرائی۔ وہ ہلکا سا جھینپ کے مبہم سا مسکرائی۔

"آپ مائدہ سے ملنے آئے تھے، وہ کافی دیر پہلے جا چکی ہے۔" وہ سپاٹ آواز میں بولی اور اسے بس ذرا سا دیکھا۔

"ہمم ـــــ اچھا کیا کہ بتا دیا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ میں یہاں مائدہ کی وجہ سے آتا ہوں۔" اس کی چال دھیمی ہوئی۔

"اور میں سمجھتا تھا، میں یہاں اس کی وجہ سے آتا ہوں جو مجھے دیکھتے ہی بھاگ جاتی تھی جو مجھے دیکھتے ہی ظالم بلاؤں کو اور زمانے بھر کی دانا بوڑھیوں کو اپنے گرد جمع کر لیتی تھی تاکہ میں دور کا دور کھڑا رہ جاؤں۔" وہ اس ایک لفظ "تھی" پہ چونکی اور سر اٹھا کے دیکھا۔

وہ کیسے جان گیا تھا، آج وہ اکیلی تھی۔ آج اس کے ساتھ خوف تھا نہ دانا بوڑھیاں تھیں۔ وہ اس نظر شناس کو دیکھتی رہ گئی۔

"آپ مشکل باتیں کرتے ہیں جو میں نہیں سمجھ سکتی۔" اس نے نگاہ چرائی اور اس اچھے وقت کو یاد کیا جب وہ اس سے سامنا ہوتے ہی ادھر اُدھر ہو جاتی تھی۔

"اچھا پھر کہیں بیٹھ کے کوئی آسان سی بات کرتے ہیں کہ تمہیں کیا اچھا لگتا ہے اور تمہیں سیاہ رنگ کیوں اچھا لگتا ہے اور یہ کہ ابھی تم سے مائدہ نے کہا تھا نا، تم بنا تاثرات کے بات کرو گی تو جواب میں مشک بادہ کیا خاک تاثر دے گا۔"

وہ ایک دم سامنے ٹھہر کر بہت سارا مسکرایا۔ وہ بات کو گھما پھرا کے پھر وہیں لے آیا تھا۔ وہ بات کرتا تھا، وہ دیکھتا تھا، وہ مسکراتا تھا ـــــ جیسے سامنے ایک دیوار کھڑی کر دیتا تھا کہ اب اس کے پار جا کے دکھاؤ۔ وہ اس طرف کیسے کھڑی رہتی، ان کے راستے الگ تھے۔ وہ ہرگز بھی نہیں چاہتی تھی کہ ان کا کوئی اسکینڈل منظر عام پر آئے۔

"اگر کہیں بیٹھ کے بات کریں گے تو آپ میرے سوالوں کا جواب دے سکیں گے۔"

وہ مسکرائی۔ اس نے ثابت کیا کہ وہ تاثرات کے ساتھ بھی بات کر سکتی ہے۔

"ہوں ----" اس نے ایک طویل ہنکارا بھرتے ہوئے تاشیہ کو بغور دیکھا۔ اب وہ اس گراؤنڈ کے قریب آ چکے تھے، ریہرسل کے بعد خوش گپیاں لگائی جارہی تھیں۔ کچھ لڑکیوں نے تاشیہ کو دیکھتے ہی سیٹیاں بجا کر اسے گل سیمیں کے نام سے چھیڑا تو وہ اس کو بخش ہوتا دیکھ کے محظوظ ہوا۔

"تمہارے سوال اور میرے جواب کسی فرصت کے لیے اٹھا رکھیں گے، ابھی تو میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ یہ مشک بادہ کون تھا۔" اس کی چند فیلوز اسے مڑ مڑ کے دیکھ رہی تھیں۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی نروس ہو رہی تھی۔

"مشک بادہ ایک بہت امیر تاجر تھا۔" اس نے تیزی سے وضاحت کی۔ "اور آپ سے ایک بات کہوں۔" اس نے گراؤنڈ کی طرف رخ موڑ لیا۔ "آپ دوبارہ کبھی میرے راستوں میں مت آیئے گا۔" اس نے بیگ کو بائیں کندھے سے اتار کے دائیں پہ شفٹ کیا۔ صہیب کی نگاہوں نے اس خطرناک کو پہلی بار اتنا نزدیک سے دیکھا۔

"وہ گل میں کس چیز کا بدلہ لینے آیا تھا؟" اس نے تاشیہ کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے اک دوسرا سوال کیا تو وہ بل کھا کے پلٹی۔ پھر اس پہ شکوہ بھری نگاہ ڈالی۔

"جب وہ تجارت کر کے آتا تھا شہزادہ یاقوت اس کا تمام قیمتی مال چوری کروالیا کرتا تھا اور آپ کے تیسرے اور آخری سوال کا جواب یہ ہے کہ گل سیمیں نے کئی سالوں بعد مشک بادہ کو جو حقیقت بتائی تھی....." وہ گھڑی بھر کو خاموش ہوئی پھر اس نے گل سیمیں کی وہ حقیقت اسے ایک جملہ میں بتائی، جسے سن کے وہ حیران رہ گیا۔ وہ واقعی حیران رہ گیا۔ اس کے حواس مختل ہوئے۔ گویا مشک بادہ نے ساری عمر کا پچھتاوا مفت میں خرید لیا تھا۔

☆☆☆

وہ ایک خنک شام تھی اور تاریکی سے جلد ہی گھل مل گئی۔ عقبی احاطے کے جس حصے میں ٹھک ٹھک، کی آواز آ رہی تھی وہاں زرد بلب کی روشنی بس مختصر حصے کو روشن کر رہی تھی۔ اس کے ہاتھ اب آخری چند کیلیں تھیں جو اس نے وہاں موجود ایک لوہے کے ڈبے میں محفوظ کر لی تھیں اور ذرا دور ہٹ کے سیڑھی کا جائزہ لیا۔

"تمہارے باپ کی زندگی میں بھی یہ چیز میری رقیب تھی اور اس کے جانے کے بعد بھی اس کا مقام نہیں بدلا۔

وہ اس بات پہ پہلے جی بھر کے مسکرایا پھر چہرہ موڑ کے آواز کی سمت دیکھا۔ ماں کے ایک ہاتھ میں چائے کا کپ تھا اور دوسرے ہاتھ میں گرم چادر تھی۔ صہیب نے آگے بڑھ کے چائے کا کپ تھاما تھا۔ ماں نے وہ چادر اس کے کندھوں پہ پھیلائی۔

"یہ اب کہاں استعمال ہوتی ہے کہ اس ٹھنڈی شام میں اس کی مرمت ضروری تھی۔" وہ بات کرتے ہوئے سیڑھی کے قریب آئی اور وہ ماں کی بات سنتے ہوئے ماضی کی اک شام کھوج لایا۔ وہ بڑے ڈبے میں ہاتھ ڈالتا اور ایک موٹی کیل نکال کے باپ کی ہتھیلی پہ رکھتا۔

"تمہاری ماں بہت لاپروا عورت ہے۔ وہ اس بات سے لاعلم تھی کہ ملازمہ نے اسٹور صاف کرنے کے بعد سیڑھی کو دوبارہ اندر ہی رکھا۔" صہیب پہ حیرت طاری ہوئی۔

"آج اس کے باپ نے زندگی میں پہلی بار..... اس کی ماں کے خلاف بات کی تھی۔ اس نے سیڑھی پہ اک ناپسندیدہ نگاہ ڈالی۔

"آپ اس کی مرمت کیوں کر رہے ہیں؟" اس نے یہ سوال ہاتھ پیچھے باندھ کے کیا۔ یعنی اب وہ باپ کی مدد کرنے کا روادار نہیں تھا۔ اس کا باپ اسے دیکھ کے مسکرایا۔

"یہ سیڑھی بڑی اعلا چیز ہوتی ہے، جب اس پہ چڑھتے ہیں تو منظر بدل جاتے ہیں پھر ہمیں وہ نظر آتا ہے جو زمین پہ کھڑے لوگوں کو دکھائی نہیں دیتا۔" اس کی ماں نے لوہے کے اسٹول سے ہتھوڑا اٹھا کے جیسے

چھپالیا کہ چائے ختم کرنے کے بعد وہ یہ ٹھک ٹھک دوبارہ شروع کرسکتا تھا۔ صہیب نے سیڑھی کو حسرت سے دیکھا۔

''چیزوں کی عمر لمبی ہوتی ہے اور انسان عمر لکھوا کر لاتا ہے۔ آپ بتائیں کہ دو گھنٹوں سے کہاں غائب تھیں؟'' وہ لوہے کے جھولے میں ماں کے ساتھ ہی ٹکا۔

''جب بیٹا مجھے دو مہینوں کی غیر حاضری کا جواب نہیں دیتا تو میں بھی اسے کوئی وجہ نہیں بتا سکتی۔''

''میں یہ ساری محنت آپ کے لیے اور بچوں کے لیے ہی کر رہا ہوں۔'' وہ سنجیدگی سے بولا تو وہ اس کا کان کھینچ کے ہنس پڑی۔

''بیوی کے لالے پڑے ہیں اور بچوں کے لیے مال جمع کیا جا رہا ہے۔'' وہ مسکراتے مسکراتے آزردہ ہوئی۔

''تم نے اپنے ساتھ تو جو کیا سو کیا۔ تم نے میرے ساتھ بھی بہت برا کیا ہے۔ میں اس شخص کے آگے دامن پھیلاؤں گی جس نے.....'' وہ لب بھینچ کے خاموش ہوئی۔ وہ ہمیشہ کی طرح خاموش رہا، بس ماں کے ٹھنڈے ہاتھوں کو اپنے مضبوط ہاتھوں میں جکڑ لیا۔

''اور میں نے تو یہ بھی سنا ہے کہ وہ تمہارے خلاف ثبوت اکٹھے کرتا پھر رہا ہے۔ وہ لوگوں کو قائل کرتا پھر رہا ہے کہ تم علاقہ غیر کے دہشت گردوں کو اسلحہ بیچتے ہو۔'' وہ دھیمی سی آواز میں سرسرائی۔ وہ بہت مدھم سا مسکرائی۔

''ابھی تو وہ کچھ بھی نہیں کر رہا۔ آپ ذرا رشتہ لے کر جائیں پھر دیکھیے گا، وہ کیا کیا نہیں کرتا۔'' وہ یہ بات کر کے ماں کو مزید پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔

☆☆☆

اب ایسا بھی نہیں تھا کہ فخر حیات اور یاور خان برسوں بعد مل رہے تھے۔ ان کی ملاقات کہیں نہ کہیں ہو جاتی تھی مگر آج جس طرح فخر حیات بطور خاص اس کی رہائش گاہ پر اس سے ملنے آیا تھا، تو یہ بات یاور کے اطمینان میں مخل ہو رہی تھی۔ آج اتنے سالوں بعد بھی دونوں کا انداز نشست وہی تھا۔ یاور اس کی گفتگو سننے کے بعد اپنی چیئر جھلاتے ہوئے اسے گہری نظروں سے دیکھ رہا تھا جو اپنے مطلب کی بات کرنے کے بعد ٹانگ پہ ٹانگ جمائے اس بک ریک کو تاڑ رہا تھا، جہاں اب مزید صحت مند کتابوں کا اضافہ ہو چکا تھا۔

''اتنی لف روٹین کے باوجود اس شوق کے لیے کیسے وقت نکالتے ہو؟'' وہ مزے دار کافی کا گھونٹ لیتے ہوئے مسکرایا۔

''جیسے تم اپنی روٹینز میں سے ان بے جا خواہشات کے لیے وقت نکال لیتے ہو۔'' وہ بھی اسی کے انداز میں مسکرایا۔

''یہ بے جا خواہشات نہیں، ان معاملات کا تعلق میرے انتہائی جذبات سے ہے۔'' اس کا لہجہ ہی نہیں تاثرات بھی ٹھوس تھے۔

''تم میری باتوں کا برا مت مانو..... بلکہ سمجھنے کی کوشش کرو، یہ جو اسلام کے لیے، وطن کے لیے یا پھر دنیا کے کسی بھی خطے میں رہنے والے مظلوم مسلمانوں کے لیے انڈر گراؤنڈ کام کرتے ہیں جس طرح وہ اپنے امور ہم سے مخفی رکھتے ہیں تو آپ جیسے یا میرے جیسے مسلمانوں کو بھی ان کے متعلق اپنے جذبات پہ قابو رکھنا چاہیے۔ وہ اپنا کام سنواریں، ہم اپنے کام سے کام رکھیں۔

اب میں یا آپ یا ہمارے جیسے کئی مال داران کے فنڈز میں حصہ ڈالنے کے بجائے ان کی ملاقاتوں کا ثواب حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ تو بس رہنے دو یار! اگر ہمیں ثواب ہی کمانا ہے تو یہ جو سردی اور گرمی سے بے نیاز لوگ اپنے ننگ دھڑنگ بچوں کو ساتھ لگائے سڑکوں پہ روڑی، کوٹ رہے ہوتے ہیں۔ کبھی ہم اپنی لگژری گاڑی سے باہر آ کر ان سے بات کر لیں، ان کی کچھ مدد کر دیں۔ اس سے بڑا کیا ثواب ہوگا۔'' وہ سرسری سی نگاہ میں دیکھ سکتا تھا کہ اس وقت فخر کا چہرہ ہزار رنگ بدل چکا تھا۔

''تمہیں سچ بتاؤں تو میں نے بھی حالیہ برسوں

میں حب کی کارکردگی کے صرف قصے سنے ہیں۔ حب اور اس کے کئی ساتھی مظلوم کشمیریوں کا دایاں بازو ہیں، ان کی آس اور امید ہیں۔ جس طرح حب اور اس کے ساتھی یا پھر باقی مجاہدین اپنی کل کمائی سرحد پار نچھاور کررہے ہیں تو ان سے ملنے کے بجائے ہمارے لیے ان کی تقلید ضروری ہے حالانکہ میں بھی حب سے ملنے کا خواہش مند ہوں مگر....." وہ خاموش ہوگیا۔ اس کی "مگر" نے فخر کو بے قرار کیا۔

"میں جانتا ہوں، تمہارے پاس تب بھی اختیارات تھے، جب تم خود کو ایک معمولی آفیسر کہتے تھے اور اب تو تمہارا شمار اتھارٹی سے بھی آگے ہے۔

"ہاہاہا....." وہ فخر کی بات پہ ہنستا ہی چلا گیا۔

"تم بھی جانتے ہو یاور کہ فخر حیات راز رکھنے والا بندہ ہے۔" وہ ہٹ دھرمی سے گویا ہوا۔

یاور اس کی ہٹ دھرمی پہ پہلو بدل کے رہ گیا پھر چند لمحوں بعد خود کو پرسکون کرتے ہوئے خاصے نارمل انداز میں ہم کلام ہوا۔

"یہ بتاؤ، بچیوں کے رشتے وغیرہ طے کردیے ہیں یا ابھی اپنے جیسا مکمل مسلمان ڈھونڈنے میں لگے ہو۔" وہ کان مسلتے ہوئے کھل کے مسکرایا۔ جواب میں فخر حیات نے اسے گھورا تھا۔

"تاشیہ تو ابھی زیر تعلیم ہے جبکہ سارہ کا رشتہ ایک دو روز تک طے ہوجائے گا۔" اس نے بھی نارمل انداز اپنالیا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ یاور خاں کا، کام کرنے کا اور کسی کے کام آنے کا ایک اپنا طریقہ تھا۔

☆☆☆

جس رات مائدہ کی بارات تھی، اسی رات فخر کے گھر سارہ کے رشتے کے سلسلے میں ایک فیملی ڈنر پر انوائٹ تھی۔ اس گھر کی تینوں خواتین نے کسی بھی صدمے کا اظہار کیے بنا جیسے ہر قسم کی صورت حال سے سمجھوتا کرلیا تھا مگر اگلے دن سیرت جب لڑکے والوں کے گھر سے ہو کے آئی تو وہ تمام سمجھوتے اور ادب آداب بھلا کر ایک جاہل عورت کی طرح چیخی۔

"آپ سارہ کا رشتہ اس پچاس سال کے مرد سے طے کریں گے۔" اس نے اندر آتے ہی ہاتھ میں پکڑا پاؤچ کہیں دور اچھالا۔

کچن کے دروازے میں کھڑی سارہ اس صورت حال پہ حیران ہوئی۔ اس نے ماں کو ہمیشہ باپ کے آگے مؤدب ہی دیکھا تھا۔ وہ اسے اور تاشیہ کو کبھی باپ کے سامنے نگاہ تک اٹھانے کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ وہ فخر حیات کی ہزار خامیوں کے باوجود اپنی بیٹیوں کے سامنے اس کی خوبیوں کو نمایاں کرنے کی کوشش کرتی تھی۔

"یہ اسلام کی کس کتاب میں لکھا ہے کہ کسی لڑکی کی شادی ایک پچاس سال کے مرد سے نہیں ہوسکتی۔ اسلام مرد کی عمر پہ نہیں، اس کے کردار پر زور دیتا ہے۔ وہ اب تک ایک اچھے خاندان اور ایک مذہبی لڑکی کے انتظار میں تھا۔" وہ سیرت سے بھی زیادہ بلند آواز میں چیخا۔

"جو بھی ہو، مجھے اس رشتے پہ اعتراض ہے۔" وہ بے تحاشا آنسوؤں کے درمیان بولی۔

"مگر مجھے اس رشتے پہ کوئی اعتراض نہیں۔" وہ دونوں میاں بیوی آواز کی سمت گھومے۔

سارہ پانی کا گلاس ٹیبل پر رکھتے ہوئے ماں کے پاس بیٹھی۔ اسے ماں سے شکوہ رہتا تھا کہ وہ اس کے حق میں اس کے باپ سے بات کیوں نہیں کرسکتی۔ لیکن پچھلے سات دنوں سے اس کی ماں نے اس کا اور زین کا مقدمہ پوری جان سے لڑا تھا۔ تائی کو رشتہ مانگنے کی ہمت بھی سیرت نے دلائی تھی مگر فخر حیات نے بھائی کی فیملی سے جس طرح بات کی تھی تو سارہ اور زین کی ہر امید ختم کردی تھی۔ آج اسے ماں کے آنسو تکلیف میں مبتلا کررہے تھے، وہ اس موقع پر کمزور پڑ کے اسے اور تکلیف نہیں دے سکتی تھی۔ اس نے سیرت کے آنسو پونچھے۔

"جب حقائق سامنے ہوں اور کسی کو قائل کرنا بھی مشکل ہو تو پھر باقی معاملہ اللہ پہ چھوڑ دینا چاہیے۔"

وہ ایک جملے میں بات ختم کرتے ہوئے، ایک پرسکون چال کے ساتھ کچن کی طرف بڑھی تھی، ہوسکتا ہے فخر حیات نے یہ اسلام کی کتابوں میں نہ پڑھا ہو

کہ رشتہ طے کرتے وقت لڑکی کی رائے اہم ہوتی ہے۔ لیکن یہ کیسے ہوسکتا تھا، اس نے آج اس ٹاپک پہ پورے دو گھنٹے کا پروگرام کیا تھا۔ اس نے زین کو، سیرت کو اور سارہ کو دو گھنٹے خوش فہمی میں مبتلا رکھا تھا۔

☆☆☆

صہیب دیکھتا تھا کہ اس کے بابا ہفتوں بعد گھر آتے یا پھر دکان بند کر کے کئی دن گھر میں گزار دیتے۔ اس کی ماں شوہر کے اس روٹین پہ اپنا غصہ عموماً کنٹرول رکھتی تھی لیکن دن کے اکثر اوقات میں جب اس کے بابا کمرے کا دروازہ بند کر لیتے تو ماں دروازہ کھلنے تک کبھی ہلکی کبھی بلند آواز سے بڑبڑاتی رہتی۔

''بند کمرے میں بھی اپنی اور ہماری بربادی کے سارے کام کرتا ہے۔ سارے سامان کرتا ہے، اللہ جانے نشہ کرتا ہے کہ شراب پیتا ہے۔'' آج بھی وہ گھر آیا تو ماں بڑبڑا رہی تھی۔

وہ اس کمرے کے بند دروازے کو گھورتا رہا۔ وہ کچھ سوچ کے عقبی حصے کی طرف آیا۔ کمرے کی عقبی کھڑکیاں بھی بند تھیں۔ وہ مایوسی سے پلٹا، اس کی نگاہ کمرے کی پشت سے لگی سیڑھی پہ پڑی۔ اس کے اندر پٹاخہ سا چھوٹا۔

''جب ہم سیڑھی پہ چڑھتے ہیں تو منظر بدل جاتا ہے.....''

ایک دو تین..... وہ ذہن میں گنتی کرتا ہوا، جب بائیسویں پائیدان پہ چڑھا تو اس کے ہاتھ نے روشن دان کو دھیرے سے چھوا۔ جو بند تھا، وہ یوں ہی چپکے سے نیچے اتر آیا۔ اگلے دن باپ کی غیر موجودگی میں اس نے وہ روشن دان قدرے کھول دیا تھا۔ جب کمرے کا دروازہ بند ہوا تو صہیب نے گزشتہ عمل دہرایا۔ وہ اندر کا منظر دیکھ کے حیران رہ گیا۔ اس کے بابا کے ہاتھ میں سگریٹ تھی، نہ شراب تھی۔ وہ بیڈ پہ نقشے پھیلائے، ان کے کچھ حصوں پہ مارک کر رہا تھا۔

☆☆☆

''مجھے آپ کے بیٹے کا پیغام اچھی طرح یاد ہے اور میں منتظر ہونے کے ساتھ حیران بھی تھا کہ اس پیغام پہ ابھی تک عمل درآمد کیوں نہیں ہوا۔ میری حیرانی ختم کرنے کا شکریہ۔''

فخر حیات نے اس طویل جملے میں ایک اہم لفظ کی ردوبدل کی تھی، اس نے پریشانی کی جگہ لفظ حیرانی سیٹ کر دیا تھا۔ سچ تو یہ تھا کہ اس لڑکے کے ایک میسج نے اسے سالوں سے اک اضطراب میں ڈال رکھا تھا۔

مسز ولید جانتی تھیں کہ وہ جہاں بیٹے کا رشتہ ڈالنے آئی ہیں، ان کے نزدیک ولید فیملی کی پوزیشن کیا ہے۔ وہ یہ بھی جانتی تھیں کہ انہیں کبیدہ اور سنجیدہ نگاہی سے گھورتا فخر حیات، صہیب کے اس پرپوزل کو کس نظر سے دیکھ رہا ہوگا۔ اس متکبر شخص کے گھر صہیب کا پرپوزل آنا ان کی بے عزتی کے مترادف تھا۔ انہوں نے بات کرتے وقت نگاہ نیچی نہیں رکھی تھی، انہوں نے یہ رشتہ بالکل روایتی انداز میں مانگا تھا۔ اس گھر میں چائے پیتے ہوئے ان کا دل بھی جلا تھا مگر یہ قسمت کا چکر تھا کہ ان کے بیٹے کا دل اسی لڑکی پہ آنا تھا، یقیناً اللہ ان کے بیٹے کا دل اس اک بشر کی نفرت سے بھی پاک رکھنا چاہتا تھا۔

انہوں نے مسز فخر سے مسکرا کے اجازت طلب کی تھی۔ انہوں نے پروقار اور ہموار چال کے ساتھ دروازہ عبور کیا۔ وہ یہ بھی جانتی تھیں کہ ان کے اوجھل ہوتے ہی یہ پرپوزل پس منظر میں چلا جائے گا پھر یہاں فخر صاحب اپنے الفاظ میں صہیب کی ہمت اور ان کی جرأت کی دھجیاں اڑائے گا اور وہی ہوا۔

''آپ اس بات پہ اتنا ہائپر کیوں ہو رہے ہیں۔ جس گھر میں بیٹیاں ہوتی ہیں، وہاں رشتے آتے رہتے ہیں۔'' جب خاصی دیر تک اس کی زبان ٹھنڈی ہوئی، نہ دماغ تو سیرت کو ناچار ٹوکنا پڑا۔

''یہ اچھا رواج ہے کہ بیٹیوں والے گھروں میں بھلے چور ڈاکو اور دہشت گرد منہ اٹھا کر چلے آئیں۔''

جب وہ قدموں کی غضب ناک دھمک کے ساتھ کمرے کی طرف جا رہا تھا، اسی وقت سارہ اور تاشیہ اندر آ رہی تھیں۔ آج یونی کے فنکشن میں تاشیہ کے ساتھ سارہ بھی گئی ہوئی تھی۔ ماں کی شکل اور باپ کے مزاج

سے ظاہر ہو رہا تھا کہ یہاں کوئی گڑبڑ ہو چکی ہے۔
''اب کیا ہو گیا؟'' سارہ نے جوتا اتارتے ہوئے ماں سے پوچھا جبکہ تاشیہ ماں کو سلام کرنے کے بعد اب سیڑھیاں پھلانگ رہی تھی۔
''کچھ بھی نہیں ہوا۔ آج مسز ولید، صہیب ولید کا پرپوزل لے کر آئی تھیں۔'' سیرت کے لہجے میں ابھی بھی حیرت نمایاں تھی۔
''کیا.....؟'' سارہ کی آنکھیں باہر کو آئیں۔
اس نے چہرہ اٹھا کے زینہ طے کرتی تاشیہ کو دیکھا، جو مرمریں زینے پہ جیسے پتھر کی ہو چکی تھی۔ یہ سب اس کے لیے غیر متوقع تھا۔

☆☆☆

وہ آج چار دن بعد یونی آئی تھی۔ وہاں آج بھی کلاسز بنک تھیں۔ وہاں آج بھی یونی کا فنکشن زیر بحث تھا۔ کہیں جوشیلی آوازوں میں شعر دہرائے جا رہے تھے۔ کہیں کسی پلے کی مکالمہ بازی ہو رہی تھی۔ کچھ شرارتی لڑکے گل سیمیں اور مشک بادہ کا انٹرویو کر رہے تھے۔ چند ایک لڑکوں نے اسے دیکھ کے آواز لگائی۔
''دسمبر ٹھہر جاتا ہے۔''
وہ جواب میں بس پھیکا سا مسکرائی۔ اس نے دسمبر کے حوالے سے غزل سنائی تھی، تو اول انعام اس نے جیتا تھا جبکہ نیرہ دوسرے نمبر پہ آئی تھی لیکن چار دن پہلے اس خوب صورت دن کا انجام بہت برا ہوا تھا کہ گھر جاتے ہی اس کی غزل کے سارے شعر ٹوٹ پھوٹ گئے تھے۔ صہیب کے پرپوزل نے اس کے باپ کا جما جمایا چین و سکون ہلا کے رکھ دیا تھا۔ اسے یوں لگتا تھا کہ فخر حیات صہیب کو کسی گہری کھائی میں پھینکنے والا تھا۔ وہ بہت ہراساں تھی۔
مگر یونی میں آج بھی زندگی پہلے کی طرح سانس لے رہی تھی، گویا باقی سب کی زندگی میں سب ٹھیک تھا۔ اس نے پلکیں جھپکیں، جو گیلی ہو رہی تھیں۔ وہ تیز قدموں سے چلتی دوسری جانب آئی۔ اب وہ مسکراتی آوازیں پیچھے رہ گئی تھیں، جب مائدہ نے اسے عقب سے پکارا۔
''اتنے دنوں سے کہاں ہو تاشی! گھر میں سب ٹھیک ہے ناں۔'' وہ رک گئی۔ وہ مائدہ کی شادی اٹینڈ نہیں کر سکی تھیں لیکن وہ بعد میں خالہ کے گھر گئی تھیں۔ اس نے رخ پھیرا تو مائدہ اسے دیکھ کے ٹھٹکی، گویا خالہ کے گھر میں کچھ مسئلہ تھا، کچھ غلط ہو رہا تھا۔
''ایک تو تم اور صہیب اچانک غائب ہو جاتے ہو اور پھر عجیب حالت میں نمودار ہوتے ہو۔'' اس نے تیزی سے بات بنائی، وہ دونوں ایک پرسکون جگہ پر بیٹھ چکی تھیں۔
''میں واقعی عجیب سی ہو رہی ہوں۔'' اس نے اپنا چہرہ چھوا۔
''صبح جب میں آئینہ دیکھ رہی تھی تو مجھے اپنا چہرہ بالکل سارہ کے چہرے کی طرح نظر آ رہا تھا، بجھا بجھا سا اور پھیکا سا.....'' مائدہ نے اسے حیرت سے دیکھا۔ ''میں نے اس کی غزل پڑھی تھی نا.....تو شاید کوئی شعر میرے چہرے پہ رہ گیا ہو۔ کیا میں تمہیں گل سیمیں لگ رہی ہوں۔''
''تاشیہ! کیا ہوا ہے؟'' مائدہ کی آواز سرسرائی۔
''تمہیں پتا ہے، اس نے کیا کیا ہے۔ جو اچانک غائب ہو جاتا ہے پھر سامنے آ کر بردباری سے کھڑا رہتا ہے اور اپنی ذات سے سارے دیوانے نکال کر میرے راستوں پہ چھوڑ دیتا ہے.....اور تمہیں پتا ہے، اب بابا اس کو برباد کر دیں گے۔'' وہ مائدہ کے کندھوں پر سر رکھ کے پھوٹ پھوٹ کے رو دی تھی۔

☆☆☆

''میں اپنے باپ کا حب ہوں۔ میں آپ کے ساتھ وہی کام کرنا چاہتا ہوں جو میرے بابا کرتے تھے۔'' وہ ان کے سامنے بردباری سے کھڑا تھا۔ انہوں نے لمحہ بھر کو ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر اس بت نما لڑکے کو دیکھا۔
''تمہارے بابا ہمارے ساتھ کچھ کاروبار نہیں کرتے تھے۔ ہم صرف دوست ہیں۔'' انہوں نے اسے نرمی سے ٹالنا چاہا۔
''میں سب جانتا ہوں۔'' وہ ایک قدم آگے

بڑھا۔

''کیا جانتے ہو؟'' سامنے والے نے سوال کیا۔

وہ ایک قدم اور آگے بڑھا اور وہ جو جانتا تھا، وہ سب بتا دیا..... کہ اسے سننے والے وہ چار اشخاص اسے آگے بڑھنے سے روک نہیں پائے تھے۔ ایک دو تین..... جب وہ بائیسویں پائیدان تک پہنچا تھا منظر بدل گیا تھا۔

اسے ایک مرمت شدہ سیڑھی نے ستاروں سے آگے کے جہان بھی دکھا دیے تھے۔ وہ حب نہیں اک چھلاوا تھا، وہ جہاں سے چاہتا راستہ نکال لیتا تھا۔ جب نما وہ چھلاوا اس وقت جہاں کھڑا تھا، وہاں سینکڑوں لوگوں کی گیدرنگ تھی۔ وہ تمام گیدرنگ ایک دوسرے میں مگن تھی۔ اپنی اپنی کمپنی انجوائے کر رہی تھی، وہاں ایک شخص ایسا تھا جو اس وقت صرف اسے دیکھ رہا تھا، اسے دیکھتے ہوئے فخر حیات کی پیشانی بدنما شکنوں سے پر ہو چکی تھی۔

پھر اچانک کچھ ایسا ہوا کہ فخر حیات نے جب اس پہ دوبارہ نگاہ ڈالی تو اس کو سوائے حب کے کسی کی شکل دکھائی دے رہی تھی نہ کسی کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ گیدرنگ، وہ سینکڑوں کا مجمع، اس کے کلاس ایبل دوست، وہ اونچے عہدے دار، وہ سب غائب ہو چکے تھے۔ صرف ایک چہرہ دکھائی دے رہا تھا، ایک حقیقت دکھائی دے رہی تھی۔

وہ ان لوگوں کے ساتھ کام کر رہا تھا جو کشمیر کی آزادی کے لیے کام کر رہے تھے۔ اس کا باپ طیب مجاہد بھی اسی راہ کا مسافر تھا اور صہیب ولید بھی ان کے ساتھ کام کرتا تھا۔

ایک ایسی حقیقت جو اس کے وجود میں، برچھیوں کی صورت کھب رہی تھی۔ اسے زندگی میں دوسری بار اندازہ ہوا کہ سانس لینا بھی ایک مشکل عمل ہے۔ پہلی بار اس کی سانسوں کو حب کے پیغام نے اکھاڑا تھا اور دوسری بار بھی اس کی سانسیں اکھاڑنے کا موجب وہی تھا۔

اچانک اس کے قریب آ کر یاور نے اس کے کان میں سرگوشی کی تھی۔

''ان سے ملو فخر! یہ حب مجاہد طیب.....'' کاش وہ دھواں ہو سکتا، وہ پانی ہی بن جاتا۔ وہ خاک ہی ہو جاتا، وہ کچھ بھی نہ ہوا۔

وہ اس شرف کے قابل ہی نہیں تھا کہ طیب مجاہد کا جنازہ پڑھاتا۔

''کبھی کبھی بہت اچھا بننے کے لیے بہت برا بننا پڑتا ہے سر!'' حب نے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے یہ ایک جملہ ادا کیا تھا۔ اس کی ملائم مسکراہٹ میں طنز تھا نہ کینہ۔ اس کے باوجود بھی وہ مجسم پچھتاوا بن چکا تھا، ایک طویل العمر پچھتاوا۔

اسے آج یاور کی بات بھی یاد آئی۔

''کچھ کام اللہ کی خوشنودی کے لیے بھی کر لیا کرو، ہو سکتا ہے اللہ کا جو حکم تم انجانے میں بجا لاؤ، وہی تمہارا حاصل بن جائے۔''

☆☆☆

انہوں نے دور سے ہی ایک دوسرے کو دیکھ لیا تھا۔ لائبریری کی سیڑھیوں پر بیٹھی تاشیہ نے اسے دیکھ کے چہرہ جھکا لیا۔ اس نے اس شخص سے کوئی بات نہیں کرنی تھی۔ آنے والے کو بھی ان سیڑھیوں پہ بیٹھنے کے لیے اجازت درکار نہیں تھی۔ اب وہ دونوں خاموشی، خاموشی کھیل رہے تھے مگر صہیب جلد ہی اس کھیل سے اکتا گیا۔

وہ میرے ذکر کی شمعیں بجھا دیتا ہے جس لمحے
تو اس کی خنک سانسوں میں دسمبر ٹھہر جاتا ہے

صہیب کے سیل فون سے تاشیہ کی آواز ابھر کے معدوم ہوئی۔ اسے مائدہ پہ غصہ آیا۔

''یہ آڈیو اسے اس کے سوا کون وائس ایپ کر سکتا تھا۔

''میں شاعری کو تو زیادہ نہیں سمجھتا مگر پڑھنے والی نے یہ کلام کمال لہجے میں پڑھا ہے۔'' وہ معنی خیزی سے مسکرایا۔ تاشیہ نے اسے بہت دھیان سے دیکھا۔

''آپ کو یہ پرپوزل بھیجنے سے پہلے مجھ سے بات کرنی چاہیے تھی۔'' وہ ایک گہرے شکوے کے ساتھ بولی۔ وہ ایک دم سنجیدہ ہوا۔

"تمہیں مجھ پہ اعتبار کرنا چاہیے" وہ پر یقین ہو کے بولا۔

"تمہارے گھر میں کچھ بھی نہیں بدلا وہ ہر چیز، ہر موسم ایک سی ہے" جشن کی آواز بھرا گئی۔

"اگر میں کم ہمت نہ ہوتی تو سارہ کی شاعری تھا اس کی زندگی میں ٹھہر چکے دسمبر کو سرکا سکتی تھی۔" آج پھر اس کے ہاتھ برف ہو رہے تھے۔ دسمبر کے ان آخری دنوں میں سردی نے سکتہ سا دیا تھا۔ یونی کے کچھ خراب اسٹوڈنٹ اس سردی کو تاشیر کی غزل سے منسوب کر رہے تھے۔

"زندگی میں کچھ بھی نہیں ٹھہرتا" وہ دھند کے سرخ گولے کو دیکھتے ہوئے بنا کچھ بات کو بڑھاتے ہوئے بولا۔ "میری پیشانی پہ بھی ایک شام دسمبر ٹھہر گیا تھا۔ پھر یونی میں جب تم سے پہلا سامنا ہوا تو میں نے تمہارے چہرے پہ کرب اور بے بسی کی ان ہی لکیروں کو دیکھا۔ اس دن تم نے میری پیشانی کا بوجھ بانٹ لیا تھا۔ کبھی کچھ ایسا ہوگا کہ سارہ کی زندگی پہ ٹھہرا ہوا موسم بھی راہ بدل لے گا۔"

اس کا لہجہ اور اس کی نگاہ موسم بدلنے کا یقین دلا رہے تھے لیکن وہ اپنے باپ کو جانتی تھی۔

"آپ وعدہ کریں، آپ کی امی دوبارہ نہیں آئیں گی۔" وہ آنکھوں کی سطح سے نمی ہٹا کے بولی۔ وہ چند لمحے اسے دیکھتا رہا۔

"کل تمہارے بابا ہمارے گھر آئے تھے۔" وہ سرسری سا لہجہ اپناتے ہوئے بولا اور اس لڑکی کو سناٹے میں جھونک گیا۔

"انہوں نے کہا کہ اس جمعہ کو مسجد میں آنا۔" وہ رکا کسی تاثر کے بولا۔ اس کے پیروں تلے سے زمین کھسکی۔ جمعہ کو سارہ کا نکاح تھا جو مسجد میں ہی ہونا تھا مگر فخر حیات نے صہیب کو کیسے انوائٹ کر لیا۔ وہ وہاں اس کے ساتھ کیا کرنے والا تھا، وہ اسے سن حواسوں کے ساتھ دیکھتی رہ گئی۔

"انہوں نے اگر یہ کہا تھا تو آپ نے پوچھا نہیں کہ کیوں؟" وہ جانے اس سے کیا پوچھنا چاہتی تھی۔

"میں نے پوچھا تھا کہ جو بھی کہنا ہے یہاں کہہ دیں مگر ——" وہ بات ادھوری چھوڑ کے خاموش ہوا۔

"مگر کیا ——؟" وہ بے چین ہوئی۔

"کہہ رہے تھے، پھر مجمع میں تمہارے ہاتھ چوموں گا۔" وہ بے ہوش ہونے کے قریب ہوئی۔ وہ چبا چبا کے مسکرا رہا تھا۔

"ہاتھ چوموں گا، مگر کیسے ——؟" اس نے الجھن سے بتلا ہو لیا۔

"ہاتھوں چوموں گا اور ایسے ——" صہیب نے اس کا ہاتھ تھام کے لبوں سے لگانا چاہا۔ وہ اپنی مسکراہٹ سمیٹ نہیں پا رہا تھا۔ اس نے حواس باختہ سی ہو کے ہاتھ چھڑا لیا۔

ہمارے ہاتھ کی خوشبو ذرا سا رخ بدلتی ہے
تو اس کی گرم پوروں پہ دسمبر ٹھہر جاتا ہے

یونی کا ایک منچلا اسٹوڈنٹ وہاں سے گزرا تو یہ شعر دیکھ کے اسے چھیڑنے سے باز نہیں آیا۔ وہ اس قدر گھبرائی تھی کہ اسے گھور بھی نہیں سکی —— اگر وہاں صہیب اسے بتا دیتا کہ فخر حیات نے اس سے کہا تھا۔

"اس جمعہ کو میری بیٹی کا نکاح ہے۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو میں چھوٹی کا بھی ساتھ ہی کرنا چاہتا ہوں۔" اسے یقین تھا کہ وہ وہیں ڈھیر ہو جاتی۔

"جب گل بیگم نے مشک بادو کو حقیقت بتائی تھی کہ وہ محبوبہ نہیں بلکہ یاقوت کی سوتیلی ماں تھی اور اس کی گمشدگی سے یاقوت کو کچھ فرق نہیں پڑتا۔"

"یہ حقیقت جاننے کے بعد مشک بادو کی زندگی میں پچھتاوا رہ گیا تھا۔ پچھتاوا ایک ایسا موسم ہے جو کبھی نہیں گزرتا تاثیر! دسمبر تو صرف بچھڑنے والوں کے لیے ٹھہر جاتا ہوگا مگر پچھتاوا تو کسی بلا ہے جو موسم و سال پہ بھی ٹھہر جائے تو نگاہیں تک نہیں اٹھانے دیتا۔"

اسے فخر حیات کی جھکی نگاہ یاد آئی۔ وہ جانے اسے کیا کہانیاں سنا رہا تھا لیکن اس نے جس مضبوطی سے وہ ہاتھ تھام رکھا تھا تو وہ یقین کی منزلیں طے کر چکی تھی کہ یہ شخص اب اس کا ہاتھ کبھی نہیں چھوڑ سکتا۔

☆

آسمان کی تاریکی زمین کے نور پر حاوی ہوتی جارہی تھی۔ گرجتے بادلوں کی چمکتی بجلیاں، انسانوں پر آسمانی طوفان کی ہیبت طاری کررہی تھیں۔ جہازوں کے بادبان پھڑپھڑا رہے تھے اور جہاز رانوں کے دل..... ایسے طوفانوں میں جہاز ران، اللہ کی پناہ مانگا کرتے ہیں..... ایسے طوفانوں میں زمین کے مسافر پناہ گاہ ڈھونڈا کرتے ہیں.....

زمین کے مسافر..... مشقت سے خود کو آگے بڑھاتے اور ہوا کی طوفانی قوت انہیں گھسیٹ کر پیچھے لے جاتی تھی۔ وہ اپنا مال، اسباب مشکل سے سمیٹے ہوئے تھے، اپنے چوغے، سر کے عمامے اور ''منزل'' کی سمت.....

منزل جو انہیں زمانوں تک لے جانے والی ہے..... ان کا ذکر آسمانوں سے زمین پر آنے والا ہے.....

سرزمین بنی اسرائیل کے تین مسافر.....

سمیرا حمید

اسم اعظم

''وہ سامنے چٹان میں پناہ دکھائی دیتی ہے، ہمیں اس غار میں چلنا چاہیے۔''

ان میں سے ایک نے نشان دہی کی اور وہ تینوں چٹان کی سمت چل پڑے۔

غار کا دہانہ چھوٹا تھا اور غار بھی۔ انہیں کھڑا ہونے میں مشکل تھی، انہیں بیٹھ جانے میں مشکل تھی، انہیں کمر ٹکا لینے میں بھی مشکل ہوتی۔ پہاڑ کی نوکیلی شاخیں ان کے ہر عمل میں مانع تھیں۔ انہیں طوفان کے رکنے اور روشنی کے نمودار ہونے تک یہاں رکنا تھا۔ وہ اپنے قصے کہانیاں شروع کرتے تو شاید غار بھی ان سے مانوسیت پیدا کر لیتا اور وہ پناہ گاہ سے آرام گاہ میں بدل جاتا۔

''اللہ مسافروں پر رحم کرے، انہیں روشنی، راہنما اور پناہ میسر کرے.....'' ایک مسافر نے ان مسافروں کے لیے دعا کی جو طوفان سے نبرد آزما ہوں گے اور پناہ گاہ سے دُور۔

''مسافر کا سفر بعد میں شروع ہوتا ہے اور زادِ راہ کا انتظام پہلے ہی ہو جاتا ہے۔ سر چھپانے

کے لیے اس غار کا دکھائی دے جانا اتفاق نہیں معجزہ ہے....." دوسرے مسافر نے کہا جو ان میں سب سے زیادہ بردبار اور عاجز معلوم ہوتا تھا۔

"معجزوں کے سب سے زیادہ گواہ مسافر ہی تو ہوتے ہیں....."

"معجزے سب سے زیادہ مسافروں کے ساتھ ہوتے ہیں، ایسے کہو۔" تیسرے مسافر نے کہا، اور دونوں نے تائید کی۔

"اللہ کو سفر پسند ہے، حالت سفر پسند ہے، عملی، باطنی، روحانی، اعمال سفر پسند ہیں۔ عالم ارواح سے عالم جہاں، عالم جہاں سے عالم سزا وجزا..... سفر در سفر....."

سفر در سفر..... مسافت در مسافت..... منزل در منزل.....

جیسے تیسے تینوں بیٹھنے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ غار کی اجنبیت البتہ قائم رہی۔ آسمان کی روشن منتشر لہریں، ان کی پناہ گاہ کو روشن کرتی رہیں۔ ان کی باتیں ابھی حکایتوں اور روایتوں کی طرف مبذول ہوا ہی چاہتی تھیں کہ طوفانی ہواؤں اور بادلوں کی زوردار گرج کے درمیان انہیں کسی وزنی چیز سرکنے کی گونج سنائی دی، وہ چونک کر اٹھے جیسے پہاڑ زمین میں دھنس جانے والا ہو کہ آسمانی بجلی سے جلتا بجھتا غار، شعلے کی طرح جل کر بجھ گیا..... گھپ بحر میں کود گیا..... وبال کی تاریکی غار کی زندگی پر غالب آئی۔ چٹان کی بلندی سے لڑھکڑا کر گرا ایک بڑا پتھر غار کے منہ کو بند کر گیا.....

اب تک ان کی زندگی میں تاریکی ایک "لفظ" رہی تھی اور اب یہی لفظ پورا کلام بن کر ان پر وارد ہوا تھا..... تاریکی کچھ ایسی شکل میں بیان ہوئی تھی جیسے سارا جہاں روشنی گل کر بیٹھا ہو..... ہستی بستی دنیا سارے گلستاں لٹا بیٹھی ہو..... زندگی ایسے غاروں کے تابوت میں آنکھ کھولے تو موت کو آستین کا سانپ سمجھتی ہے..... زندگی کی بہادری پر بزدلی کا وار..... پیٹھ میں خنجر.....

"والدہ....." منہ سے بے ساختہ نکلا۔ "اس ضعیف پر کیسا قہر ٹوٹے گا۔" خیال آیا۔

کئی ساعتیں گزر گئیں اور انہیں یہ سمجھنے میں کچھ ہی وقت لگا کہ پتھر نے غار کا دہن مکمل طور پر بند کر دیا ہے۔ یہاں سے باہر جانے کے لیے انہیں اس پتھر کو گرانا ہوگا۔ تینوں نے اپنی ہمت کو طاقت کیا اور پتھر پر ہاتھ جما کر اسے کھسکانا شروع کیا۔ لیکن وہ تنومند تھے اور پتھر میخ..... جہاں گڑا وہیں نصب ہو گیا۔ جیسے چٹان کا حصہ اور کھوہ کا ہم زاد ہو۔ ہاتھوں کے بعد انہوں نے اپنی پشتیں پتھر کے ساتھ جوڑ دیں اور قوت لگانے لگے۔ ان کی سانسیں کھنچ گئیں، رگیں تن گئیں، پشتیں نوکیلے کناروں سے چھل کر خون آلود ہو گئیں لیکن پتھر اپنی جگہ پر قائم رہا۔ عمامے اُتار کر، ہتھیلیوں پر لپیٹ کر انہوں نے اپنی جان لگا دی لیکن غار کے دہن سے لگی چٹان نے اپنی جگہ نہیں چھوڑی۔

آسمان..... یہ مشیت ایزدی کا راز دار ہے.....

آسمان..... یہ احکامات کا قرب دان ہے.....

انہیں اس آسمان کو ایک نظر دیکھنے کی تمنا شدت سے ہوئی۔ وہ اپنے اندر ایسی قوت جگا چکے تھے جو آج سے پہلے کبھی نہیں جگا پائے تھے۔ انہیں یہ خیال بھی آتا رہا کہ وہ اس زمین کے نہیں اس جہان کے مسافر ہیں، ایک پتھر انہیں قید نہیں کر سکتا۔ ایک چٹان ان کی حیات کو بے خبری میں تہہ و بالا نہیں کر سکتی۔ غار کے اندھیرے میں سر اٹھا کر دیکھا تو آسمان دکھائی دیا۔ وہی آسمان جو بچپن میں دکھائی دیتا تھا، جب وہ مٹی سے کھیلا کرتے اور یہ یقین رکھتے کہ خدا صرف آسمانوں میں رہتا ہے۔

"یہ اندھیرا ہماری بینائی پر غالب ہے لیکن یہ ہمیں اللہ سے پوشیدہ نہیں کر سکتا، وہ ہمارا مددگار ہے۔" کم عمری میں بے ریا دل اور معصوم نظروں سے اللہ کو دیکھنے والے نے، اس کی ہر قدرت کا اعلان کیا۔

"بے شک! لیکن پتھر بے زبان ہے اور بہرا بھی، وہ ہمارے ہاتھوں کی التجا اور دلوں کا کلام

سمجھنے سے قاصر ہے۔"

"ہم اس چٹان پر اپنی طاقت آزما چکے ہیں....."

وقفے وقفے سے کئی بار کوشش کرنے کے بعد وہ اس یقین پر قائم ہو گئے کہ پتھر کھسکانا ان کے بس میں نہیں۔ تدبر خاموش تھا اور طاقت کا زور ختم ہو چکا تھا۔ نوکیلی دیواروں سے پشت جوڑ کر بیٹھے انہیں سرسبز بستیاں یاد آئیں، بہتے پانی، لہلہاتے کھلیان، جھلمل سنہری بالیاں، صبح صادق کی خوش نمائی اور اس میں مخلوق خدا کی چہکاریں.....

انہیں اپنے اہل وعیال یاد آئے، ان کی ہنسی، ان کی باتیں، ان کی چمکتی آنکھیں، زوجہ کی خوش آمدیدی مسکان، والدہ کا دعائیہ انداز، والد کا دعائے خیر دیتا الوادعی ہاتھ..... یاد آیا کہ کیسے سورج کا غروب انہیں کبھی ہلکان نہ کرتا تھا اور رات کی تاریکی ان کی تھکان اُتار دیا کرتی تھی۔

وہ زندگی کی مسیحائی یاد کرنے لگے جو ہر زخم کی دوا رکھتی ہے اور اپنی سانسوں کی بے فکری جو سارے جہاں کی بے نیازی رکھا کرتی تھی۔ پھر انہیں زندگی کے وعدے یاد آئے جن کے ایفا ہونے تک انہیں زندہ رہنا تھا۔

لیکن.....

سارے منظر دن کے تھے اور تاریکی سارے جہاں کی۔ ان کے شجاع دل، ان کے کمال ایمان، ان کے تفسیر اعمال، اس کلام سے بہرہ ور ہوئے جو انہوں نے اب تک سنا ہی نہیں تھا۔ وہ ایسی کیفیت سے گزرے، جس سے غار سے باہر نہیں گزر سکتے تھے۔

"اب صرف اللہ ہی ہمارا مددگار ہے دوستو....." اس حقیقت پر وہ سب متفق تھے۔

"اللہ..... اللہ..... اللہ.....

"اس اللہ نے ہی تمہیں یہاں لا پھنسایا ہے، یہ تمہاری زندہ روحوں کی مردہ قبر ہے....."

بے آواز الفاظ کا، بے نشان کلام ان کے غار دلوں میں گونجا۔ پلٹ کر دیکھا تو وہ اندھیرے سے نمودار ہوا..... وہ جو ہر نفس کے ساتھ موجود ہے، اور ہر روح میں بے یقینی کا سوراخ کھود رہا ہے..... ابلیس..... اس کے وسوسوں کی کاری ضرب نے ان کے دل سکیڑ دیے۔ پشت پر پڑنے والے وار نے ان کے یقین سمیٹ لینے چاہے.....

"یہ اللہ کا قہر ہے....." ایک نے کہا۔

دوسرا چونکا اور تیسرا بھی کیونکہ یہی خیال ان دونوں کو بھی آیا تھا۔ ان میں سے ہر ایک شیطان سے اپنی اپنی جگہ پر ہم کلام تھا۔ یہ شر رتب بھی ان سے ہم کلام ہوا تھا جب وہ دودھ کا پیالہ لے کر والد، والدہ کے سرہانے کھڑا تھا۔ ایک فرق چاول کے عوض، کئی گنا مال اسباب اٹھوا دینے کے طوفان میں گھرا تھا..... اور چچا زاد کے عشق میں دونوں جہاں لٹا دینے پر تیار تھا..... تب بھی..... یہی..... ان کی پشت پر کھڑا تھا۔ وقت انعام کا ہو، الہام کا یا امتحان کا شیطان وار کرنے میں دیر نہیں کرتا۔ جسے سب میسر ہوا سے فرعون، خالی ہاتھ کو چور، طاقت ور کو ظالم، اعلا کو مغرور اور ادنیٰ کو ناشکرا بنا ڈالتا ہے..... یہ شریر کبھی دیر نہیں کرتا.....

"ہمارے پہاڑ گناہ..... ہماری سمندر کوتاہیاں....." ایک بڑبڑایا۔

"ہماری رائی نیکیاں....." دوسرے نے یاد دلانا چاہا۔

"رائی نیکیوں پر، یہ چٹان تمہارے سروں پر آگری ہے۔ ان نیکیوں کی مقبولیت کی یہی حیثیت ہے۔ تم اصحاب کہف نہیں ہو جو نیند سے بیداری پر نیا عہد پاؤ گے..... غار میں جانے والا ہر انسان "صحابی" نہیں ہوتا۔"

غار میں جانے والا ہر انسان صحابی (اللہ کا ساتھی) نہیں ہوتا.....

لیکن.....

اپنی رائی نیکیوں کی مقبولیت کا میزان ان کی روحوں میں ترازو ہو گیا۔ ان کی چٹان کوتاہیاں، ان کی نیکیوں کو بے حیثیت کرنے لگیں۔ انہیں شیطان کے طنز برے لگے، انہیں ان وسوسوں سے

تکلیف پہنچی۔ان کی حکمت ضعیف ہوئی، اور ان کے تدبر کے چراغ گل ہونے لگے۔ان کی آنکھیں نم ہوئیں..... انہیں زندگی کی کیا پرواہ رہی ہوگی جو اس امر کی تھی کہ وہ اللہ کی توجہ کے نہیں، قہر کے مستحق ہیں۔وہ اللہ کو پکارنے کے حق سے دستبردار نہیں ہونا چاہتے تھے..... رائی ہی سہی..... اللہ کے رحم سے معتبر اپنی نیکیوں کی مقبولیت، چٹان سے بلند چاہتے تھے.....

گناہ پر توبہ مطلوب..... نیکی پر پکار ''مقبول''.....

اگر ان کی رائی نیکیاں مقبول رہی ہیں تو اللہ کا رحم یہ چٹان پاش پاش کردے گا.....

اگر..... اگر.....

☆☆☆

مسافر کو یاد آیا رات کے بینا چراغ کے سیاہ کار ہونے سے پہلے.....

بہت پہلے.....

وہ حسین تھی اور اسے دنیا کی ہر شے سے زیادہ مطلوب تھی۔اس عشق میں ہر پہلو سے اس کا دل اس پر فدا تھا۔وہ جان عزیز تھی اور اس کے عین سامنے موجود تھی۔چچازاد نے اپنے رخ کا نقاب نہیں الٹا تھا پھر بھی وہ احرام حسن پر چمکتی کرنیں دیکھ سکتا تھا۔قحط کی بدحالی، اسے اس کے پاس لے آئی تھی۔اس کی کھال قحط سالی سے خاک ہونے کو تھی پھر بھی اس کا حسن آفریں تھا۔اس کی پلکوں کی جنبش اس کے دل پر سوار کناں تھی۔وہ جب چاہتی اس کی لگامیں کھینچ کر اس پر حکم چلاتی، اسے غلام بنا ڈالتی.....

وہ دن کی روشنی میں آئی تھی، وہ رات کے چراغ کی طرح اس کی طرف بڑھا تھا۔اس کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر اسے نشست پر بٹھانا چاہا کہ وہ جھجک کر پیچھے ہٹ گئی۔

''مجھے ضرورت یہاں کھینچ لائی ہے۔'' اس نے کتنی کمزوری اور بے بسی سے اپنا رخ پھیرا تھا۔

''میری ہر چیز حاضر ہے.....''

وہ جانتا تھا، قحط نے کیا قہر ڈھایا ہے، ہر غیرت مند، ضرورت مند بن چکا تھا۔وہ صاحب حیثیت تھا، اس کی کئی ضرورتیں پوری کرسکتا تھا..... لیکن.....

چچازاد کی نظریں اس پر آکر ٹھہر گئیں۔پھر بھی اس نے اپنا نقاب نہیں الٹا۔وہ نشست گاہ کے کواڑ کی آڑ میں ایسے مسافر کی طرح کھڑی رہی، جس کی منزل..... نارسا ہو۔

''قحط نے ظلم ڈھایا.....'' کیا وہ اس ظلم کی بات کررہی تھی جس نے جسم سے جان کھینچ لی تھی اور روح سے ایمان؟

''مجھے خبر ہے.....'' کیا وہ اس قحط کی خبر رکھتا تھا جس نے اسے یہ قربت نصیب کی تھی اور اس پر عمل کی طاقت بھی؟

سکے اس کے حوالے کرتے ہوئے وہ اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر آنکھوں سے لگانا ہی چاہتا تھا کہ وہ بدک کر پیچھے ہٹی اور لرزتے ہوئے کواڑ سے ٹکرا گئی۔اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے چمکے اور اس نے جھٹکے سے آزاد کروالیا۔ہاتھ کو سکوں کے بوجھ سے..... خود کو گناہ کی ترغیب سے.....

ایسے منتشر ہنگامے پر بھی وہ اس کے قریب آیا، لیکن وہ اتنی تیزی سے بھاگی کہ اس کی چادر، اس کے سر سے پھسل کر گر گئی۔وہ اس شدت سے اس کی طلب نہ رکھتا تو خیرات کردیتا۔عمل میں نیت کے بیج کی طرح، اس کا ارادہ چٹان رہا۔وہ ہدایت کی بینائی سے محروم ہوکر، عشق کی طلب میں کامل اندھا ہو چکا تھا۔ایمان کی سرزمین کا سورج، بے ہدایتی کی سمت غروب ہورہا تھا.....

''میرے بچے بھوک سے مر رہے ہیں، میں اپنی جان لٹانے کے لیے تیار ہوں.....''

وہ اتنی بے بس تھی کہ اسی کے پاس دوبارہ آنے پر مجبور ہوئی تھی۔جان کا واسطہ دے کر جان سے پیاروں کی جان بچانے آئی تھی۔عورت ماں بن جائے تو اپنا دل اولاد میں تقسیم کردیتی ہے۔چوٹ اولاد کو پہنچتی ہے، تکلیف ماں کا دل سہتا ہے۔

''تمہاری جان مجھے عزیز ہے اور تم بھی.....''

وہ اس سے تجارت نہیں کر رہا تھا، وہ تو عشق کے عہد کی پاس داری چاہتا تھا..... چاہت..... وہ اس کی تکمیل کی طاقت رکھتا تھا۔ وہ با اثر تھا، اور اتنی دولت رکھتا تھا کہ عشق کی محراب پر گری زلفیں اپنی ہتھیلیوں سے سمیٹ سکے۔ وہ سب کچھ اس جان عزیز کے قدموں میں نچھاور کر دینے کے لیے تیار تھا، لیکن اس کے بدلے میں وہ بھی کچھ چاہتا تھا۔ وہ مجبور آئی تھی، مجبور ہی واپس چلی گئی۔ جان بچاتے بچاتے وہ ایمان کیسے جانے دیتی.....

لیکن.....

اگلی بار وہ اتنی مجبور ہو کر آئی کہ چادر سر سے ڈھلکی تھی اور شانے کی ہڈی دکھائی دیتی تھی۔ اس کی سسکی غار میں صاف سنائی دی تھی۔ وہ ماں تھی، بھوک سے بلکتے بچوں کے لیے اپنی حیا کی تجارت کرنے آ گئی تھی۔ وہ اس پر ہزار جان سے فدا تھا، اس تجارت پر حکمران بن بیٹھا تھا۔ رات کے سب چراغ گل کر دیے، اور طاق پر رکھا صرف ایک چراغ اپنی بینائی پر پشیمان رہا۔ وہ دیکھ سکتا تھا کہ اس کی ساری طاقت ایک خواہش کے قدموں میں تڑپ رہی ہے۔ مسافر کی انگلیاں اس کی گردن سے شانے کی ہڈی پر مچل رہی تھیں۔

ہر عمل ہلکا تھا..... ہر جنبش شرم و حیا سے مبرا تھی..... ایک صرف چچازاد کی آنکھ کا آنسو بوجھل تھا۔ اس نے ڈھلکی ہوئی چادر کو ڈھلکا رہنے دیا۔ اپنا دل تقسیم کر چکی ماں، اپنا ایمان منتشر کر دینے پر کپکپا رہی تھی.....

''تمہیں کیا ہوا.....؟''

''میں اللہ سے اس حیا کے لیے ڈرتی ہوں..... تم بھی ڈرو.....''

وہ اللہ کے خوف میں اب تک بینا تھی۔ وہ اللہ کے بندے کے عشق میں اب تک اندھا تھا۔ اس کے شانے پر رکھا ہاتھ ''میخ'' ہوا۔ جہاں تھا وہیں ثابت رہا۔ اس ہاتھ کی میخ کو وہاں سے اکھاڑ لینا بڑا معرکہ تھا۔ چراغ گل تھے، محبوب پاس تھا، اس کے قرب سے رخ موڑ لینا جرات طلب تھا۔ اس کے لیے چٹان طاقت چاہیے تھی۔ اس کے لیے ایمان سمندر درکار تھا۔

اس کے لیے اللہ کا خوف مطلوب تھا.....

اللہ کا خوف غار کے اندھیرے میں ''چراغ'' ہوا..... مسافر نے چچازاد کی طرف سے اپنا رخ پھیر لیا۔ اس کے شانے پر گڑا اپنا ہاتھ پورا ایمان لگا کر اکھاڑ لیا۔

''تم مجبور ہو کر اللہ ڈرتی ہو، اور میں با اثر ہو کر بھی نہیں ڈرا.....''

مسافر نے طاق کی طرف اشارہ کیا۔ ''جو لینا ہے لے جاؤ اور جاؤ..... جس سے تم نے خوف کھایا، اس اللہ سے میں بھی ڈرا۔ جس سے تمہیں حیا آئی، اس سے میں نے بھی شرم کی.....''

اس نے اللہ سے خوف کھایا، اپنا عمل مقبول ٹھہرایا.....

''اے اللہ! میں نے اپنے نفس کو اس وقت قابو میں کیا جس وقت وہ منہ زور تھا۔ بعض لوگ عافیت کے لیے اطاعت کرتے ہیں، میں نے عافیت کے لیے نہیں، تیرے لیے اطاعت کی..... میں نے تجھ سے شرم کی۔ میں نے گناہ پر اپنے اختیار کو سلب (ختم) کیا، آج تو ہماری مصیبت سلب کر..... تیری بڑائی اور بزرگی پر اپنی طلب کو چھوڑا، آج تو مجھے اکیلا نہ چھوڑ..... اس لمحے میں نے تیرا خوف کھایا، اے میرے پروردگار! آج تو مجھ پر رحم کھا..... اس پتھر کو گرا دے کہ نیکی رائی ہو یا پہاڑ، وہ تیرے حضور مقبول ہو کر اتنی طاقت رکھتی ہے کہ ایسے پتھر پاش پاش کر دیتی ہے۔ میں نے تاریکی میں تجھے سامنے پایا اور اپنے قدم پیچھے ہٹا لیے..... آج میں تیرے حضور آیا ہوں، اپنی رحمت کو میری طرف پیش قدمی کرنے دے۔ تیری عظمت کو میری اطاعت کی ضرورت نہیں، تو بے نیاز ہے، تیرے خوف سے میں نے خود کو

روکا.....آج تو اپنے رحم کو ہم تک آنے سے نہ روک.....''

اس کے رب کے رحم نے جوش مارا.....پتھر اپنی جگہ سے کھسک گیا.....

تاریکی نے اپنا کلام بدل دیا، اب اس کے الفاظ روشن تھے، اور اس کی تختی پر ایک تحریر نمایاں تھی.....

جس نے اللہ کا خوف کھایا، اللہ کے رحم کا انعام پایا.....

اور.....

غار میں جانے والا ہر انسان صحابی نہیں ہوتا، لیکن وہ جو اللہ سے شرم کرے، اس کا خوف رکھے، گناہ کی طاقت پر بھی گناہ سے بچے، اور جو عافیت کے لیے نہیں ''اطاعت'' کے لیے بندگی کرے..... وہ صحابی بن کر ضرور نکلتا ہے.....

کیونکہ.....

زندگی کے غار میں، اعمال کے چراغوں میں، سب سے روشن چراغ ''اللہ کے خوف'' کا ہے۔

☆☆☆

اہل غار کو آسمان کا کنارا نصیب ہو چکا تھا.....اب وہ اسے دیکھ سکتے تھے۔ پتھر درز بن چکا تھا لیکن ''در'' بننے سے دُور تھا۔ رات اپنا پہر بدل رہی تھی۔ دل اپنا میزان، روح اپنا مقام.....ارادہ اپنی راہ اور شیطان اپنی چال.....

''زندگی کی جھلک دکھا کر، زندگی کھینچ لینا، قہر کی سب سے بڑی نشانی ہے.....'' دکھائی دینے والے آسمان کی طرف اشارہ کر کے ابلیس کہہ رہا تھا۔

دکھائی دینے والا آسمان.....اس کا ایک کنارا قہر ہو سکتا ہے، سارا آسمان ''رحم'' سے نبرا کیسے ہو سکتا ہے؟ رحم کے طلب گار مسافروں میں سے ایک مسافر نے پتھر کی طاقت کو اس طاقت سے منتشر کرنا چاہا، جس طاقت سے اس نے رات کا سفر کاٹا تھا اور اس عبادت کو پایا تھا جو بوڑھے والدین کے صدقے اسے نصیب ہوئی تھی.....

''والدہ رات کی دعائیں پڑھے بغیر نہیں سوئی ہوں گی۔'' وہ مسکرایا تھا لیکن اسے رونا بھی آیا تھا کہ کیا آج والدہ سفر خیر کی دعا دیے بغیر سوئی ہوں گی۔ کیا کسی وجہ سے وہ اس سے ناراض رہی ہیں۔

''دنیا میں دو ہی پھول ایسے ہیں جو کبھی نہیں مرجھاتے.....ماں اور باپ.....اور یہی وہ پھول ہیں جن کی خوشبوئیں ہمیشہ اولاد کی روحیں معطر رکھتی ہیں۔ میں نے والدین کی فرماں برداری کرنے کی اپنی سی کوشش کی، جو مجھ پر بوجھ نہیں بنی بلکہ مجھے عزیز رہی۔ میرا جہاں میری والدہ اور میری حیات والد ہیں۔ جس مشقت سے انہوں نے میری پرورش کی، اس محبت سے میں ان کی خدمت نہیں کر سکا۔ میں وہ حق کبھی نہیں ادا کر سکتا جو اولاد ہو کر، والدین کا کیا جا سکتا ہے۔ مجھے اپنے گناہ یاد آتے ہیں اور جب ان کے بوجھ سے میرا دل بوجھل ہو جاتا ہے تو والدہ کی صورت دکھائی دیتی ہے، جیسے اپنا رخ دکھا کر مجھے ڈھارس دیتی ہوں۔ آخرت کا حساب انصاف پر مبنی ہے، لیکن مجھے یہ گمان ہوتا ہے کہ والدہ، مجھے لیے بغیر جنت میں نہیں جائیں گی، وہ اللہ سے ضد ضرور کریں گی۔''

اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گیا اور.....

اس کے ماں باپ بوڑھے اور ضعیف تھے۔ بچے چھوٹے چھوٹے تھے۔ بیوی تھی۔ وہ بھیڑ بکریاں چرایا کرتا تھا جب وہ شام کے قریب چرا کر لاتا تھا تو ان کا دودھ دوہتا تھا۔ پہلے ماں، باپ سے شروع کرتا تھا تو اور ان کو اپنے بچوں سے پہلے پلاتا تھا۔ ایک دن چارہ بہت دور ملا۔ گھر پہنچتے پہنچتے رات کے چراغ طاقوں پر جلتے ہوئے ملے۔ بچے بھوکے تھے، اس کے انتظار میں تھے، بیوی بھوکے بچوں کو سنبھالنے میں ہلکان تھی، پریشان تھی۔ وہ سخت پشیمان ہوا۔ اس رات ہر فرد بے قرار تھا، کچھ بھوک سے، کچھ انتظار کی تکلیف سے.....

وہ جلدی جلدی بکریوں کا دودھ دوہ کر، پیالہ والد، والدہ کے پاس لایا، لیکن وہ دونوں سو چکے تھے۔

اس کی آنکھیں نم ہوئیں۔ وہ دونوں سو گئے۔ اس کے دل پر قطرہ قطرہ افسوس برس رہا تھا۔ وہ وقت کا حساب کر رہا تھا کہ کہاں دیر ہوئی۔ کیا صبح بیداری میں؟ یا شام واپسی میں؟ کیا اس نے سستی دکھائی اور غفلت کا مظاہرہ کیا۔ جب وہ چھوٹا تھا تو اس سے پہلے کہ بھوک سے بلک بلک کر روتا، والدہ پہلے ہی دودھ پلا دیا کرتی تھیں، یہ وصف اس نے کیوں نہیں اپنایا۔

دُودھ کا پیالہ اس کے ہاتھ میں تھا..... دودھ پینے والے دونوں سو چکے تھے..... اسے برا لگا کہ ان سے پہلے بچوں کو پلائے۔ بچے بھوک کے مارے شور کرتے تھے، اس کے پیروں سے لپٹتے تھے، اس نے نہ خود پیا نہ بچوں کو پلایا۔

جنگل بیابانوں میں رزق کی تلاش میں، اس نے ہمیشہ والدہ کی دعاؤں کے معجزوں کو زندہ پایا۔ گھنے جنگل گلستاں بنتے رہے، اس کے لیے رزق کا اہتمام کرتے رہے، پھر اس سے دیر کہاں ہوئی..... والد کا چہرہ کیسے ضعیف اور لاغر تھا۔ وہ سخت جاں تھے اور دانہ دانہ رزق اکٹھا کیا کرتے تھے۔ اسے سینے سے لگاتے، شانوں پر اٹھاتے، اس کی تکلیفوں پر لپکتے، اس کے لیے اللہ سے ہر نعمت مانگ لاتے.....

پیالہ ہاتھ میں لے کر وہ ان کے سرہانے کھڑا رہا..... کھڑا رہا کہ اولاد کی محبت تو دودھ کے ایک قطرے کے برابر نہیں اور والدہ کی محبت دو جہاں ہے..... والد کی شفقت، ایسے جیسے اللہ مہرباں ہے.....

وہ کھڑا رہا..... مشرق و مغرب کے ان کناروں پر جو گواہ ہیں کہ جنت میں پہلا رشتہ میاں بیوی کا بنا، اور زمین والوں کو اولین رحم "ماں باپ" کی صورت نصیب ہوا۔ رات کی بیداری میں ماں ہمیشہ متوجہ ملی۔ طبیعت کی خرابی میں، وہ سرہانے جمی رہی۔ والدہ کے چہرے کی ساری جھریاں، اس کی جوانی میں ڈھلی تھیں۔ ان کی جان، اس کی سلامتی میں اٹکی تھی۔ وہ اس ماں کے دل تک رسائی نہیں رکھتا تھا، جس کی روح، اس سے محبت میں شاد تھی، لیکن وہ اس کی خدمت تک رسائی رکھنا چاہتا تھا۔

"والدہ....."

دودھ کا پیالہ ہاتھ میں لے کر وہ موجود رہا اور یہ جان گیا کہ زمین پر فرشتوں کی پسندیدہ جگہ، ماں کے قدموں تلے کی خاک ہوگی۔

اس نے سوچا کہ رحمت کے فرشتے ماں کے قریب سے گزرنا پسند کرتے ہوں گے جس کا دل محبت سے لبریز رہتا ہے اور جس کے لب دعا دیتے نہیں تھکتے۔ یہ دل اللہ کے رحم کا وسیلہ اور اس کے قہر میں رکاوٹ بنتا ہوگا۔

اس نے اس دل کے سرہانے کھڑا ہو کر عبادت کرنا فرض جانا.....

"اے میرے رب! تو جانتا ہے کہ میں نے والدہ، والد سے بڑھ کر کسی کو محبوب نہیں پایا، انہیں اپنا محبوب بنایا، ان کی خدمت کی، ان سے محبت کا دعوا سچ کرنا چاہا..... وہ مجھ سے محبت میں آگے رہے، وہ مجھے نفع پہنچانے میں اولین رہے..... میں کبھی ان کا حق نہیں چکا سکتا، لیکن ایک دن میں نے محبت کے دعوے کو سچ کر دکھانے کی جرات کی، میں اس وقت تک ان کے سرہانے موجود رہا جب تک وہ نیند سے بیدار نہیں ہو گئے، میں اس وقت تک خود بھی بھوکا رہا اور اپنے بیوی بچوں کو بھی رکھا جس وقت تک دونوں نے دودھ کے پیالوں کو لبوں سے نہیں لگا لیا۔ اے میرے رب! میں عاجز اور گناہ گار انسان ہوں، لیکن اپنے والدین کو نیند سے بیدار کرنا مجھ پر گراں رہا، ان سے پہلے اپنا پیٹ بھر لینا مجھے گناہ لگا..... میں اس سختی سے دور رہا کہ انہیں جگا دوں، اور اس شفقت پر قائم رہا کہ ساری رات انہیں دیکھتے، ان کے انتظار میں موجود رہوں۔ اے پاک ذات! میں نے اس دل کی قدر کی، جس میں تو نے اپنا رحم رکھا..... ماں کی.....

میں نے اس سے عقیدت کی، جس میں تو نے شفقت رکھی---- والد کی---- اے میرے رب! میں نے والدین سے محبت کی۔ یہ عبادت میں نے تیرے لیے کی کہ تو راضی رہے، مجھ سے بھی اور میرے والدین سے بھی اور اگر تو میرے اس عمل سے راضی ہوا، یہ عبادت تیری بارگاہ میں مقبول ہوئی ہے، تو اس پتھر کو ہمارے راستے سے ہٹادے۔"

والدین سے محبت کی عبادت، دونوں جہاں میں مقبول رہتی ہے---- پتھر اپنی جگہ پر قائم نہ رہ سکا----

اور----

غار میں جانے والا ہر انسان صحابی نہیں ہوتا، لیکن وہ جو محبت سے لبریز دل سے محبت کرے---- ماں سے اور باپ سے----ان کی قدر شناسی کی عبادت کرے، اوران کے سرہانے عقیدت کا پیالہ لے کر کھڑا رہے----

☆☆☆

غار زمین پر قائم رہا، چٹان کا پتھر اس کے دہن پر اور آسمان ان سب پر----

سر کو نیچے جھکا کر منتشر آسمانی شعلے دکھائی دیتے تھے، لیکن وہ وہاں سے نہیں نکل سکتے تھے۔ تینوں نے مل کر ایک بار پھر پتھر پر قوت لگائی تھی لیکن پتھر اپنی جگہ سے سہہ پارہ نہیں ہلا تھا۔ دو مسافر جو اپنی کیفیات بیان کر چکے تھے۔ اپنی نیکیوں کے اسم اعظم سے اپنے رب کو پکار چکے تھے، اب وہ عجز کی مشقت میں مشغول تھے۔ ابلیس انہیں تکبر کی طرف راغب کرنے میں مشغول تھا۔ ان کی نیکیوں اور ان کی مقبولیت پر وہ انہیں فرعون بنا ڈالنا چاہتا تھا۔ تیسرا مسافر خاموش تھا----اسے وہ ضعیف مزدور یاد آتا تھا جس پر اس نے اپنی نیت کا پھل ظاہر کیا تھا----

وہ----

جس کی آنکھیں تند تھیں اور جو غصے میں تھا۔ اسے تیز تیز بولنے میں عار نہیں تھا۔

"یہ نصف دن مزدوری کے لیے آیا ہے، اسے میرے برابر اجرت نہیں دی جا سکتی۔" وہ اس مزدور کی طرف اشارہ کر کے کہہ رہا تھا جو دن چڑھے مزدوری کے لیے آیا تھا اور پوری اجرت لے رہا تھا۔

"بھلے انسان! بے شک یہ انسان نصف النہار پر آیا تھا اور میں نے اسے کام سے لگا بھی لیا تھا، پر یہ طے تھا کہ اسے نصف اجرت ہی دوں گا۔ لیکن اس نے نصف دن میں اتنا کام کیا، جو دوسروں نے پورے دن میں کیا۔ اس نے اپنے کام میں پوری محنت کی، تو میں اس کی اجرت دینے میں زیادتی کیوں کروں۔ میں اسے اس کا پورا حق دے رہا ہوں۔"

"تم ظلم کر رہے ہو....."

"یہ ظلم نہیں انصاف ہے، میں تمہیں تمہاری پوری اجرت دے رہا ہوں، تم کسی دوسرے کی اجرت کی فکر نہ کرو۔"

"تم نا انصاف ہو.....اگر عہد کے پاس دار ہو تو پھر تمہیں اللہ آزمائے....."

"اللہ کی آزمائش تک بات کیوں لے کر جاتے ہو، اپنی پوری اجرت لو اور جاؤ....."

لیکن وہ اپنی اجرت اور اس کا امتحان چھوڑ کر چلا گیا۔ ایک وقت تک یہ اجرت امانتاً رکھی رہی۔ پھر ایک دن اس سے ایک بچھڑا خرید لیا گیا۔ بچھڑے سے نسل بڑھی اور مال مویشیوں میں اتنی برکت ہوئی کہ چرواہا رکھنا ضروری ہو گیا۔ گائیں، بیل، بکریوں اور اونٹوں کے لین دین سے تجارت ہوئی، فصلیں کھڑی ہوئیں، اناج کے ڈھیر لگے، خادم اور ضرورت کی اشیاء آئیں۔ ایک فرق اجرت میں خیر و برکت بڑھتی رہی.....وہ اتنی بڑھ گئی کہ ایک دن اس کے لیے آزمائش بن کر چٹان کی طرح کھڑی ہو گئی.....

"اللہ سے ڈر اور مجھے میری اجرت لوٹا دے، میں ضرورت کے ہاتھوں مجبور ہوں۔" دن کی روشنی میں آنے والا مزدور لاغر اور ضعیف ہو چکا تھا کہ اس کی پیشانی کے بل خستہ ہو چکے تھے۔

"تمہاری اجرت؟" مسافر اس سے نہیں خود

سے پوچھ رہا تھا کہ اس کی اجرت دراصل ہے کہاں؟

"ہاں ——— وہ تجھ پر بھاری ہے ——— مجھے لوٹا دے ———"

وہ مسافر پر بھاری تھی ——— بہت بھاری تھی ———

حق، اس دنیا کے ہر مسافر پر بھاری ہوتا ہے۔ ایک فرق جاوداں، یہاڑ اجرت بن چکی تھی، اسے چکانا آسان نہیں رہا تھا۔ مسافر نے حرددور کی طرف دیکھا اور یہ جانا کہ وہ اسے کھنچی میں جوت کر اب کھل لینے آ گیا تھا۔ ایک فرق جاوداں پر وہ اس کی جت لینے آیا تھا۔ یہ اس کی ہوا ہی کا قصور تھا یا اس کی نیک دلی کہ اپنی ہی اجرت، اس کے نفس پر چٹان کی طرح وزنی تھی۔ جانوروں میں کئی جانور اس کے دل کے قریب ہو چکے تھے۔ کھڑی فصلوں میں اس نے حیات آفریں سانسیں لی تھیں۔ اناج کی خوشبو اس کی شامہ پر چھا گئی تھی۔ ہر شے اس کے مقام و مرتبے کو بلند کرتی تھی۔

"یہ اپنی اجرت خود چھوڑ کر گیا تھا، کہہ دو کہ تم اسے نہیں پہچانتے ———" دن کی روشنی میں ابلیس کی چال نے راہ نکال لی تھی۔ ہمدردی آواز تھی جواب غار میں سنائی دیتی تھی۔

"میں تمہیں اور تمہاری اجرت دونوں کو پہچانتا ہوں ———" مسافر نے عجلت سے کہا۔

"جو اجرت طے پائی تھی، وہ اس کے حوالے کرو اور اسے چلتا کرو۔ مزدور تمہاری نیت کے عمل سے لاعلم ہے، یہ نہیں جانتا کہ اجرت پھل پھول کر بال موتی اور اناج کے ڈھیر میں بدل چکی ہے۔ تمہاری محنت و مشقت، توجہ اور ارادے نے بیج کو انبار میں بدل دیا ہے، اس کا حصہ صرف اجرت ہے، باقی سب تمہارا ہے ———"

مسافر نے مزدور کے لاغر پن کی طرف دیکھا، وہ ضعیف تھا۔ غربت اور بڑھاپا دونوں قیامت ڈھاتے ہیں۔ مسافر اسے جھڑک کر بھگا سکتا تھا۔ وہ ایک فرق اجرت بھی نہ دیتا تو وہ کیا کر لیتا ——— کمزور سے چھین لینا آسان اور اسے "دے دینا" مشکل ہوتا ہے۔ جبکہ نہ عہد ہو نہ گواہ، نہ زبان اور نہ زمانے کی تکرار ——— جب سب لاعلم ہوں اور صرف "ایک" کو خبر ہو تو اس "ایک" کے لیے حق پر استقامت بڑا معرکہ ہے ———

وہ حرددور ——— یہ مسافر ———

وہ ایک فرق اجرت کا تقاضا رکھتا تھا ——— ایک فرق اجرت پر ایک زمانہ کمر بستہ ہو رہا تھا۔ مسافر نے آسمان کی خبر دینے کو حرددور کی اجرت میں سمایا ہوا سارا جہاں اس میں مقید ہوتے دیکھا۔ دور تک پھیلی فصلیں، اور شور کرتے جانور، اس ایک فرق میں کیسے سمٹ گئے۔ اس کی جت اور اس کے دل کا سکون بھی ———

"یہ تمہارا کمال ہے کہ تم نے چند انسانوں کو اپنی محنت و مشقت، حکمت و تدبیر سے انبار میں بدل دیا۔ وہ انبار تمہارا ہے، حرددور اس پر کوئی حق نہیں رکھتا ——— حرددور اس سے لاعلم بھی تو ہے ———"

حرددور لاعلم تھا ——— لیکن جو علم رکھتا تھا وہ اس کی حرددوری کے پھلتے پھولتے کا کوئی گواہ نہیں تھا اور جو گواہ تھا وہ ——— ؟

"میری اجرت تم پر بھاری ہے ——— مجھے لوٹا دو ———" مسافر کو گم صم دیکھ کر حرددور نے پھر درخواست کی۔

اس کی زبان، اس پتھر کی طرح بھاری تھی جس نے غار کا منہ بند کر دیا تھا۔ حق لینا آسان اور دینا مشکل ہے۔ حق کے لیے لڑنا سہل اور اسی حق کے لیے نفس کو کچل دینا مشکل ترین ہے۔ ایک والے کے بدلے میں سارا جہاں اٹھوا دینا، بڑا بھاری ہے۔ بھاری ہی وہ نفس ہے، جو انسان کی عظمت کی راہ میں رکاوٹ ہے۔ چٹان ہے وہ انسان جو حق کی تقسیم پر قائم ہے، راکھ ہے وہ انسان جو "حق" کی پہچان پر قائم ہے، نہ اس کی تقسیم پر ———

مسافر نے اپنی نظر کو آسمان کی سمت بلند کیا، وہ جانتا تھا کہ بس ایک گواہ ہے، اور وہ وہاں ہے ——— اور اس کے لیے ——— صرف اس رب کے لیے، مسافر

نے خادم کو آواز دینے کے بجائے، مزدور کا ہاتھ پکڑا اور اسے مویشیوں کے باڑے کی طرف لے آیا۔

"یہ ہے تمہاری اجرت..... یہ سب تمہارے ہیں....."

اور پھر اس نے اناج کے ڈھیر کی طرف اشارہ کیا۔" اور یہ بھی.....اور پھر چند اشیاء کی سمت....."اور یہ بھی..... یہ سب تمہارا ہے، ان پر صرف تمہارا "حق" ہے....."

مزدور کی پیشانی کے بل خائف ہوئے۔

"غریب آدمی کا مذاق اڑاتے ہوئے تجھے شرم آنی چاہیے۔ اللہ سے ڈر....."

"اللہ سے ہی ڈرا ہوں، وہ میرے عمل کا گواہ ہے.....ایک صرف وہی گواہ ہے.....کوئی انسان گواہ ہوتا تو شاید میں مکر جاتا، اب کیسے مکروں۔ تمہاری اجرت سے میں نے ایک بچھڑا خریدا، اس کی نسل بڑھتی رہی، ان کی تجارت سے نفع پایا، یہ اشیاء اور یہ اناج کمایا۔ یہ گائیں، بیل، بکریاں، اونٹ ، مال اسباب اور اناج، یہ سب تمہاری اجرت کا نفع ہے، انہیں لے جاؤ اور میرے اعمال کھوٹے ہونے سے بچا لو..... یہ سب رکھ لیا تو سب کھو دوں گا.....اپنا رب کھو دوں گا....."

"لیکن عمل تمہارا تھا، محنت اور نگرانی تمہاری تھی، ایک فرق چاول کونے میں پڑے رہتے تو یہ سب کیسے حاصل ہوتا۔ اس سب پر صرف تمہارا حق ہے....." یہ آواز اس کے دل میں گونجتی رہی۔

"میں نے ہر شے پر اپنا حق ضبط کیا، جلدی کرو، یہ سب لے جاؤ.....جلدی کرو....."

مزدور نے دیر نہیں کی اور وہ ایک ایک دانہ اٹھا کر لے گیا۔ ایک ایک جانور ہانک لیا۔ ایک فرق چاول میں وہ اس کا جہاں لے گیا.....اسے دو جہاں کا حق دار چھوڑ گیا.....مسافر کی آنکھیں نم تھیں۔ عمل کی حدت نے اس کی روح کو پُرنم کر دیا تھا۔ وہ آبدیدہ تھا، اس لیے کہ اس نے سب دے کر، سب پا لیا تھا۔

"میں نے دنیا کے مال سے رخ موڑ کر تیری محبت کی طرف رخ پھیرا تھا میرے رب! آج تو میری مصیبت کا رخ پھیر دے، میری یہ نیکی صرف تیرے لیے تھی، تیری محبت کے لیے، میں نے خالی ہاتھ ہونا پسند کیا لیکن تیری رضا سے خالی دل نہیں، میں نے اسے سب لے جانے دیا، لیکن اپنے ایمان کو بچا لیا، آج تو مجھے بچا لے.....

ایک فرق اجرت پر سب دے کر میں نے تیری محبت پا لی۔ میرا یہ عمل میری طاقت کی آزمائش تھا، وسوسے مجھے بہکاتے تھے، میرا دل دنیا کی طرف کھنچتا تھا لیکن میں نے اپنے نفس کی لگامیں کھینچ کر انہیں تیری محبت کی سمت موڑ دیا۔ اے میرے رب! اس عمل نے مجھے کمزور کرنا چاہا لیکن میں نے کمزور ارادے پر غلبہ پا لیا، ایمان کی طاقت سے اسے پچھاڑ دیا.....آج تو اس مصیبت کو پچھاڑ دے۔

جس عمل میں جتنی مشکل درپیش ہو، اس پر اتنی ہی بڑی آسانی نصیب ہوتی ہے، یہ رکاوٹ ہٹا کر مجھے وہ آسانی عطا کر۔ ایک فرق اجرت پر مزدور کو سب لے جانے دینے کی طاقت رکھتا ہوں، میرے رب تو اس سے کہیں زیادہ عظیم طاقت کا مالک ہے.....تو اس چٹان کو غار سے ہٹا کر میری عاجز نیکی پر، اپنی محبت کا بلند اجر دے.....اس جہاں کے مسافروں کو، ہر جہاں میں اپنے قرب کی منزل دے....."

غار کے صحابی کو اس کے رب کا قرب نصیب رہا۔ پتھر اپنی جگہ قائم نہ رہ سکا، وہ لڑکھڑا کر نیچے جا گرا۔ غار کا دہین صبح صادق کی روشنی سے منور ہو گیا۔ رب کو ساتھی مان کر کون اکیلا رہا ہے.....

کہ.....

زندگی کے غار میں، اعمال کے چراغوں میں، سب سے بلند چراغ "حق" کا ہے.....

اور.....

اللہ کی قربت کا اسم "نیک عمل" ہے، اور یہی اسم اعظم.....

☆

نعیمہ ناز

عالیہ بیگم اپنی بیٹی حمنہ کے رشتے کے لیے خاندانی لوگوں کی تلاش میں تھیں۔ جب کہ ان کی ساس کا کہنا تھا کہ رشتہ کے لیے دین داری اور شرافت کو ترجیح دینی چاہیے۔

عائشہ اپنی والدہ اور بھائی کے ساتھ ایک چھوٹے سے گھر میں رہتی تھی۔ رشتوں کے نام پر اس کی ایک خالہ تھیں جن کے دو بچے فہد اور علیزے تھے۔ فہد اپنے باپ کے پاس امریکہ میں پڑھنے گیا تھا۔ اس کی والدہ سلائی کر کے اپنے بچوں کو پڑھا رہی تھیں۔ عائشہ کی سہیلیاں اس کی بے پناہ خوب صورتی کو سراہتی تھیں۔

سید صاحب کو مسجد کمیٹی کا صدر منتخب کیا جا رہا تھا۔ ان کی بیٹی نائلہ ایک خود سر لڑکی تھی، اس کی اپنے شوہر سے بالکل نہیں بنتی تھی۔ وہ آئے دن اپنے شوہر سے لڑ جھگڑ کر باپ کے گھر آ بیٹھتی۔ اس میں ماں کے مزاج کی جھلک تھی۔ اسے اپنی خوب صورتی پر بہت ناز تھا۔ سید صاحب اس کی طرف سے بہت پریشان تھے۔ نائلہ کے شوہر سرمد کا دوست جمال اس پر مرمٹا ہے۔

چنبلی کا تعلق بازارِ حسن سے ہے طلال شیخ ایک نامور سیاست دان اور جاگیردار کا بیٹا ہے جو چنبلی کے حسن پر مرمٹا ہے۔

شاہ میر رسول بخش کا سب سے چہیتا شاگرد تھا، جوان کے ساتھ ہی رہائش پذیر تھا۔

احمد فجر کے بعد جلدی جلدی گھر سے نکلا۔ آج ڈبل سواری پر پابندی کی وجہ سے پڑوس کے کامران انکل اسے اپنی موٹر سائیکل پر لفٹ نہیں دے سکے۔ اسے کافی انتظار کے بعد بس کی کھچا کھچ بھری چھت پر جگہ ملی۔ انتہائی تیز رفتاری سے موڑ کاٹتے ہوئے کچھ مسافر نیچے جا گرے جن میں احمد بھی شامل تھا۔

سرمد سو رہا ہوتا ہے تو جمال کا فون آتا ہے۔ اپنی بدقسمتی پر کڑھتی نائلہ کو جمال کی کال ایک نعمت لگتی ہے۔ جمال اپنی چکنی چپڑی باتوں سے اسے پھر سبز باغ دکھاتا ہے۔ اچانک نائلہ کی نظر اٹھتی ہے تو سامنے کھڑا سرمد اسے عجیب نظروں سے دیکھتا نظر آتا ہے۔

طلال چنبیلی کے شادی پر اصرار کرنے پر ہامی بھر لیتا ہے اور کہتا ہے کہ وہ جلد مہک جان سے بات کرے گا۔ مہک جان سے بات کر کے وہ اس کی شرائط مان کر چنبیلی سے نکاح کر کے لے جاتا ہے۔

احمد کے انتقال کے بعد عائشہ اور اس کی امی بہت سارے مسائل کا شکار ہوتی ہیں لیکن اپنی غیور طبیعت کی وجہ سے کسی سے قرض ادھار نہیں لیتیں۔

ایک سلائی کے سوٹ کے لیے لیس اور دھاگہ خریدنے کے لیے عائشہ کو بازار جانا پڑتا ہے۔ شام زیادہ ہو جاتی ہے، وہ بس کے انتظار میں کھڑی ہوتی ہے مانی بصد اصرار اسے لفٹ دیتا ہے۔ مانی کی امی اور بہن ماریہ گاڑی میں مانی کے ساتھ ایک لڑکی کو دیکھتی ہیں لیکن پہچان نہیں پاتیں۔ مانی پوچھ گچھ پر ماریہ کے سامنے عائشہ کا نام لے دیتا ہے۔

جمال دوپہر میں فون کر کے نائلہ کو ہوٹل لے جانے کی بات کرتا ہے۔ دروازہ بجنے پر وہ باپ کو دیکھ کر وہ حیران رہ جاتی ہے۔ سید صاحب اس کا فون اٹھاتے ہیں۔ سید صاحب کے جانے کے بعد نائلہ جمال سے ملنے چلی جاتی ہے جہاں وہ ایک دوسرے سے التفات کا اظہار کرتے ہیں۔ جمال اسے اپنے نوتعمیر شدہ بنگلے میں لے جاتا ہے اور اسے کہتا ہے کہ یہ تمہارا گھر ہے۔

چنبیلی طلال کے ساتھ شادی ہو جانے پر بہت خوش ہے۔ طلال اسے بتاتا ہے کہ ہر چیز جو اسے پسند آ جائے وہ قید کر لیتا ہے اور اس قید سے رہائی اس کی مرضی کے بغیر ممکن نہیں۔

سید صاحب اپنے بیٹے فرحان سے اس کی شادی کی بات کرتے ہیں تو وہ پھر ٹال دیتا ہے حمنہ کے نکاح والے دن مانی، عائشہ کا انتظار کرتا ہے۔ ماریہ جو اس کی ہے اس سے پوچھتا ہے تو وہ بتاتی ہے کہ وہ اپنی امی کو اکیلا چھوڑ کر نہیں آ سکتی۔

عائشہ کی خالہ کا فون آتا ہے وہ عائشہ کی امی سے کہتی ہے کہ جوان بچی کے ساتھ اکیلی کیسے رہو گی میرے پاس آ جاؤ، عائشہ کی امی انکار کر دیتی ہیں اور سوچتی ہیں کہ کب تک بہن کو انکار کروں گی اگر مجھے کچھ ہو گیا تو عائشہ کا کیا ہو گا۔ وہ عائشہ کے رشتے کی بات کرتی ہیں۔

جھمکا جان بڑی بی کو ڈانٹتی ہے کہ تم اس انتظار میں رو رو کے کیوں مر رہی ہو، وہ نہیں آئے گا۔ پتا نہیں زندہ بھی ہے یا مر مرا گیا۔ تارا جھمکا جان کو کبیر صاحب کے آنے کی اطلاع دیتا ہے۔

نائلہ جمال کے گھر سے آنے کے بعد بھی اسی تصور میں کھوئی ہوئی تھی۔ سرمد آتا ہے تو اسے بخار ہوتا ہے۔ وہ نائلہ سے چائے بنانے کا کہتا ہے نائلہ منع کر دیتی ہے اور گلی کے نکڑ سے اسے چائے لانے کا کہتی ہے۔ واپس آ کر سرمد، نائلہ سے پوچھتا ہی ہے کہ وہ آج دن میں کہاں گئی تھی۔

چنبیلی طلال کو ماں بننے کے متعلق بتاتی ہے تو وہ ناراض ہوتا ہے کہ ہم خاندانی لوگ ہیں ہمارے یہاں خاندانی بیوی سے بچہ پیدا ہوتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ وہ کہتا ہے کہ ہم چھ بھائی ہیں اور چھٹا بھائی لاڈلا چہیتا یہ شادی کے چھٹے مہینہ پیدا ہوا تھا۔

ماریہ، عائشہ کو فون کرتی ہے تو پتا چلتا ہے کہ اس کے رشتے کے لیے شام میں کچھ لوگ آ رہے ہیں۔ مانی اتفاقاً وہاں سے گزرتے ہوئے سن لیتا ہے۔

ظفر صاحب کی بیٹی کو فائرنگ کے ذریعے ڈرا کر ان کو عملی دھمکی دی جاتی ہے۔

چنبیلی بیٹے کی پیدائش پر طلال کی توجہ پا کر پھر اپنا خیال رکھتی ہے لیکن طلال نشے میں چور گھر آ کر اس سے کہتا ہے کہ وہ اپنی محبوبہ کے پاس سے آ رہا ہے۔ چنبیلی کے سوال پر کہتا ہے کہ تو تو بیوی ہے محبوبہ تو وہ ہے جو فلیٹ میں رہتی ہے۔

جان محمد کی بیٹی کو ایکسیڈنٹ کے ذریعے مروا دیا جاتا ہے۔ اس کی بیوی بین کرتی ہے اور چلا چلا کے قاتلوں کے نام

لیتی ہے اس کی رشتہ دار اسے چپ کرانے کی کوشش کتی ہیں لیکن وہ اپنے حواسوں میں نہیں ہوتی۔ میڈیا کے لیے یہ بہت بڑی خبر تھی کیس کے اہم گواہ کی بیٹی کی ایکسیڈنٹ میں موت۔ میڈیا کی بڑی تعداد اس کے گھر جمع تھی۔

ماریہ، شاہ میر کے ہاتھ کا سلا سوٹ دیکھ اس کی تعریف کرتی اور اسے کہتی ہے کہ تم اپنے چاچا کو تنگ کیوں کرتے ہو۔ انہوں نے تمہاری شکایت کی ہے۔ نائلہ سب کچھ حاصل ہونے کے باوجود اپنی کیفیت خود نہیں سمجھ پاتی۔ وہ ڈرتی ہے کہ باہر جانے پر پہچان لی جائے گی۔ جمال اس کا یہ حل نکالتا ہے کہ اسلام آباد شفٹ ہو جائے۔

امداد بروہی پریس کانفرنس کر کے صفائی پیش کرتا ہے کہ جان محمد کی بیٹی کو مارنے میں اور ظفر صاحب کی بیٹی پر فائرنگ میں اس کا کوئی ہاتھ نہیں۔

جان محمد کے جیل میں سارے عیش و آرام ختم ہو چکے تھے، اسے انتہائی بدبودار اور غلیظ کوٹھڑی میں قید کر دیا گیا تھا۔ جب سے اس نے گولی نہ چلانے کا بیان دیا تھا اس پر شدید ٹارچر ہو رہا تھا۔

ترنم نے روتے روتے ارمانوں سے کرایہ پر لیا گھر خالی کیا، اماں دو ملازم ساتھ لائی تھی جو سارا سامان پیک کر رہے تھے۔ اسے تو ہوش نہ تھا ایک سوچ پریشان کر رہی تھی کہ ایسی کیا بات تھی جو اس نے دل پر لے لی اور دل دھڑکنا ہی بھول گیا۔

سامان لوڈ ہو گیا تو اماں نے اسے اور بچوں کو ٹیکسی میں بٹھایا۔ خلیل نے جاتی ٹیکسی دیکھ کر کہا، پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا حمیر تھا۔

ایک درمیانے درجے کے ریسٹورنٹ میں ایک عورت چاچا سے ملنے آتی ہے اور پوچھتی ہے کہ میری امانت ہے تمہارے پاس۔ کیسا ہے وہ۔ چاچو کہتے ہی کہ ٹھیک ہے۔ وہاں ماریہ بھی چاچا سے ملتی ہے، وہ اپنی دوستوں کے ساتھ وہاں آتی ہے۔ عورت اٹھ کر چلی جاتی ہے، چاچا کسی سوچ میں گم تھے۔ شاہ میر ایک یتیم خانے میں اپنی آمدنی کا بڑا حصہ خرچ کرتا ہے۔

عالیہ بیگم بیٹی کی شادی کے لیے زیورات نکالتی ہیں، شوہر مانی کے متعلق پوچھتے ہیں کہ اس کی پسند کی لڑکی کے گھر کب جانا ہے، وہ انکار کر دیتی ہیں۔

موحد کے کینیڈا جانے کا سن کر کشف موحد سے کہتی ہے کہ وہ بتا کر جاتا تو وہ اپنے باپ کا اتا پتا معلوم کروا لیتی اس سے۔ موحد کہتا ہے کہ تمہاری آنی کا بھی تو کینیڈا میں رابطہ ہے ان کے کزن ہیں وہاں۔ کشف کی حیرانی پر پچھتاتا ہے کہ زینب کی اجازت کے بغیر اسے نہیں بتانا چاہیے تھا۔ وہ کشف سے اس کے والد کا نام پوچھتا ہے اور منصور احمد کا نام سن کر پتھر ہو جاتا ہے۔

سلیمان کو دیکھ کر رمشا جلدی سے آگے بڑھتی ہے۔ وہ ردا کی چوٹ دیکھ کر استفسار کرتا ہے۔ رمشا اور ردا یہ جاننے کے لیے بے چین تھیں کہ کہیں سلیمان نے ان کی باتیں تو نہیں سن لیں۔

کشف زینب سے شکایت کرتی ہے کہ وہ اسے اکیلا چھوڑ کر کیوں گئی۔ زینب پریشان ہوتی ہے کشف کی حالت دیکھ کر۔ وہ اس سلسلے میں صالحہ بانو سے بھی بات کرتی ہے۔

ردا شاپنگ پر جانے سے انکاری ہے، ماں کے سمجھانے پر سلیمان اس کی والدہ رمشا اور سونیا کے ساتھ وہ چلی جاتی ہے، وہاں وہ لوگ کچھ دیر کے لیے سلیمان اور ردا کو بات کرنے کا موقع دیتے ہیں، فرحان اسے سلیمان کے ساتھ دیکھ لیتا ہے۔

منصور زرین سے کہتا ہے کہ اسے دس پندرہ دن کے لیے پاکستان جانا ہے، اس کی بھانجی کی شادی ہے۔

زینب کشف کی وجہ سے پریشان ہے کہ سونیا کے ہاں ایسا کیا ہوا جو وہ وہاں سے آ گئی۔ کشف کہتی ہے کہ وہ ایک شرط پر بتائے گی کہ زینب اسے بتائے کہ زینب منصور سے کینیڈا میں ملی ہے اور یہ بات اسے ڈاکٹر موحد نے بتائی ہے۔

سونیا نکاح والے دن زینب کو بتاتی ہے کہ منصور پاکستان نہیں آ رہا۔

چنبلی کی چیخ سن کر جب سب اس کے کمرے میں پہنچتے ہیں تو اس کا چہرہ تیزاب کی وجہ سے موم بتی کی طرح پگھل رہا تھا۔

ترنم کا بیٹا سپارہ پڑھنا شروع کر چکا ہے۔ ترنم بہت خوش ہے۔ اس کی ماں کہتی ہے کہ اپنے بارے میں بھی کچھ سوچو۔ وہ اسے شیخ صاحب کا بتاتی ہے۔ ترنم کہتی ہے کہ میں اپنے دونوں بچوں کو نہیں چھوڑوں گی۔

سومی، نائلہ کو بتاتی ہے کہ جمال پہلے یہاں ہی رہتا تھا۔ چھ مہینے پہلے گیا ہے اور وہ راکٹ کا بڑا بھائی اور اس کا جیٹھ ہے۔ راکٹ کے آنے پر بات ٹل جاتی ہے۔

جھمکا جان طلال کے خلاف ایف آئی آر درج کراتی ہے۔ چاچڑ اسے سمجھاتا ہے کہ پرچہ تو کٹ جائے گا مگر طلال کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔

عائشہ جس اسکول میں پڑھاتی ہے وہاں کچھ غنڈے آ کر ان کا سامان اٹھا کر پھینکتے ہیں اور انہیں ڈرا دھمکا کر جاتے ہیں۔

مانی کے لیے یہ بات انتہائی صدمے کا باعث تھی کہ شاہ زین کے گھر والوں نے اس کے قاتلوں سے مذاکرات کر کے کیس ختم کر دیا تھا۔

کھانا کھاتے ہوئے ذوہیب اپنی امی سے باتیں کر رہا تھا عائشہ خاموشی سے ان کی باتیں سن رہی تھی کہ اچانک ذوہیب ماں کی آواز پر چونکتا ہے وہ بتاتی ہیں کہ ان کے سینے میں شدید درد اٹھا ہے۔ ذوہیب عائشہ سے کہتا ہے کہ ڈرائیور سے کہو گاڑی نکالے۔ خالہ کی حالت پر عائشہ خود پریشان ہو جاتی ہے۔

سترہویں قسط

موت، ایک عجیب گورکھ دھندا کہتے ہیں جسے لوگ، اور کہا تو یہ بھی جاتا ہے کہ موت ہر شے کا خاتمہ کر دیتی ہے، مگر موت فقط وہ نہیں ہوتی جو بدن سے روح کھینچنے کا نام ہو، باطل کے آگے گھٹنے ٹیکنے کا نام بھی موت ہے، سچائی، حق اور انصاف کے لیے لڑتے لڑتے یک دم ہتھیار ڈالنا بھی موت ہے، شکست تسلیم کر لینا بھی موت کی ایک شکل ہے، دھونس، دھمکی اور رعب میں آ کر ڈر جانا بھی موت ہے، لالچ اور ترغیب کی زمین پہ ٹھہر جانا بھی موت ہے۔

مانی کا قلم تیزی سے کاغذ پہ چل رہا تھا۔ کہاں تو ذہن بالکل خالی خالی لگ رہا تھا اور کہاں اب خیالات کی ایسی یلغار ہوئی کہ وہ بنا رکے لکھتا ہی چلا گیا۔

انصاف، مردہ معاشروں کو ہی نہیں، مردہ افراد کو بھی زندہ کر دیتا ہے، اپنے دوست کے جانے کے بعد بھی مجھے اس کی زندگی کی، انصاف کی امید تھی مگر اب نہیں، آج اس کی حسرت ناک اور الم ناک موت پر میرا قلم اور آنسو دونوں بے اختیار ہیں۔

☆☆☆

زندگی کتنی ہی بے رنگ، لگی بندھی، خاموش اور اداسی کے دائرے میں قید ہو، فقط ایک مسکراہٹ، صرف ایک چہرہ، ذرا سی اٹھتی جھکتی پلکیں، کیسے ایک بے رنگ زندگی میں رنگ بھر دیتے ہیں۔ خاموشی اور اداسی کے لگے بندھے دائروں میں ایسی چمک سی آ جاتی ہے کہ آنکھیں خیرہ ہو جائیں اور اٹھتی جھکتی پلکوں کے رمز؟ ان کے اسرار جاننے کی جستجو کیسے آمادہ طلب کرتی ہے۔

دونوں ہاتھ سر کے نیچے رکھے اور سر کو تکیے پہ رکھے، آنکھیں بند کیے خوش کن تصورات میں گم تھا، دو روز قبل کا منظر آنکھوں اور دل کی دیواروں پہ چسپاں ہو گیا تھا، ایک خوش رنگ تصویر بن کر، اس تصویر کے دل لبھانے والے رنگوں کو دیکھ دیکھ کر وہ حیران ہو رہا تھا۔ تو زندگی یوں بھی تبدیل ہو جاتی ہے؟ ہو سکتی ہے؟ اور دل بھی، وہ

حیران ہو رہا تھا۔ سارے خوف، خدشات، اوہام سب بہت دور چلے گئے تھے جیسے شاعر مبالغہ آرائی نہیں کرتے، غلط نہیں کہتے، کبھی یوں ہوا ہوگا، اب بھی یوں ہوتا ہے کہ ویرانے میں چپکے سے بہار آ جائے، اتنی چپکے سے بنا آہٹ کیے کہ ویرانہ بھی ایک لمحے کو حیران رہ جائے، خود کو گل و گلزار دیکھ کر آنکھوں پہ یقین نہ آئے۔

کیا سب کی آنکھیں اتنی پیاری اور مسکراہٹ اتنی دلکش ہوتی ہے؟ جتنی کہ تمہاری ہیں، بے اختیاری کے عالم میں، دل ہی دل میں اسے مخاطب کر بیٹھا تھا اور احساس ہی نہیں ہوا کہ اسے کوئی آواز دے رہا ہے۔

''عارف.....'' ابا نے چوتھی بار اسے آواز دی تھی۔

''جی..... جی ابا۔'' وہ ہڑبڑا کے اٹھا۔

''کتنی آوازیں دیں تمہیں کوئی جواب نہیں، کیا سو گئے تھے اس وقت؟''

ابا حیران تھے، مغرب کے وقت سونا تو دور کی بات وہ لیٹتا بھی نہیں تھا۔

وہ پتا نہیں، شاید لیٹے لیٹے آنکھ لگ گئی ہو۔'' عارف گڑبڑا اٹھا۔

''مغرب کا وقت ہو رہا ہے، اٹھ کر بیٹھو۔''

''جی۔'' وہ پہلے ہی اٹھ بیٹھا تھا، ان سے یوں نظریں چراتا ہوا کھڑا ہو گیا جیسے وہ اس کے دل کا حال جان ہی لیں گے۔

☆☆☆

آئینہ — سامنے رکھے شیو بنانے کے دوران معمول کا شغل یعنی گنگناہٹ بھی جاری تھی۔

سانوں نہر والے پل تے بلا کے۔

چہرے کی کھال ڈھیلی ہوتی جا رہی تھی، اس پر اب شیو بھی ٹھیک سے نہیں بنتی تھی، ہر بار ایک سفید غبار سا رخساروں سے لے کر گردن کے وسط تک پھیلا ہوا نظر آتا تھا۔ اس بار بھی یہی ہوا۔ اپنی دانست میں تو کھرچ کھرچ کر شیو بنائی گئی تھی، مگر نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔

''لے بھئی، میں تو ہو گیا اب بڈھا کھوسٹ۔'' چاچا نے آئینے کے سامنے سے ہٹتے ہوئے اعلان کیا۔

شاہ میر نے سر اٹھا کر ایک نظر ان پر ڈالی اور دوبارہ اپنے کام میں منہمک ہو گیا۔ وہ دروازے پر رنگ کر رہا تھا۔

''سنا تو نے شہزادے، میں اب بڈھا ہو گیا ہوں، ہائے جوانی، ایک بار دیکھی، پھر دیکھنے کی ہوس ہے۔'' چاچا آہیں بھرتے ہوئے شیو کا سامان دھو کر جگہ پہ رکھنے لگے۔

''بار بار اعلان کرنے کا کیا مطلب ہے؟'' برش کو رنگ میں ڈبونے کے بعد اسے لٹکا کے رکھتے ہوئے شاہ میر کی توجہ اور نظریں برش پر ہی تھیں۔

''مطلب یہ ہے پتر کہ گھروں کی طرح ہمارے دل کی بھی دیواریں ہوتی ہیں۔ دروازہ ہوتا ہے انہیں بھی رنگ و روغن پالش والش کر کے کھول دینا چاہیے، کیا پتا کب کوئی نیا مہمان آ جائے۔'' بولتے ہوئے چاچا کی نظروں کے سامنے ایک شبیہہ لہرا گئی، نرم لہجے میں بولتی ہوئی ایک تصویر۔

''دنیا اور زندگی میں اپنے لیے ہی جگہ بنانی مشکل ہو رہی ہے، کسی مہمان کی گنجائش کہاں سے آئے گی۔''

شاہ میر نے بے تاثر چہرے کے ساتھ جواب دیا، اس کا برش والا ہاتھ اوپر سے نیچے حرکت کر رہا تھا۔ کواڑ کی رنگت اور شاید قسمت دونوں نکھرتی جا رہی تھیں۔

''اوئے کھوتیا، اکیلا بندہ روتے ہوئے بے وقوف لگتا ہے اور ہنستے ہوئے پاگل، کوئی ساتھ ہو تو غم خوشی

دونوں کو سہار بھی لیتا ہے سنبھال بھی لیتا ہے۔ رب نے آدم کو بنانے کے بعد پھر جسے بنایا وہ حوا تھیں، یہ آدم کی ضرورت ہی نہیں فطرت ہے کہ اسے حوا کا ساتھ چاہیے، کسی کی ایک مسکراہٹ ہی کبھی، بندے کے اندر کا سارا زہر چوس لیتی ہے۔'' چاچا بولتے تو بولتے ہی چلے جاتے تھے۔

''ان فضول باتوں میں کیا رکھا ہے، کیوں بلاوجہ اپنی انرجی ضائع کر رہے ہو چاچا۔''

شاہ میر نے ایک گہری سانس لی۔

''تجھے تو میں بھی فضول لگتا ہوں۔'' چاچا نے منہ پھلا لیا۔

''خود کو میری جگہ رکھ کر سوچو۔'' شاہ میر نے کواڑ کے نچلے حصے پہ برش پھیرتے ہوئے ہاتھ روکا اور ایک بے بس نظر چاچا پر ڈالی۔

''میں تیری جگہ ہوتا تو ہر وقت جلنے کڑھنے کے بجائے اپنے لیے خوشیاں تلاش کرتا۔'' چاچا جی تازہ تازہ شیو کیے اپنے گالوں پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے گویا ہوئے۔

''آپ کے لیے یہ کہنا آسان ہے۔'' وہ ایک لمحے کو رکا۔

''کیونکہ آپ میری جگہ نہیں ہیں۔''

شاہ میر نے کام مکمل کر کے برش کو دوسرے ڈبے میں پڑے مٹی کے تیل میں بھگو دیا۔ آئل پینٹ کا ڈبا بھی بس تقریباً خالی ہی ہو چکا تھا اور کواڑ کا رنگ بھی مکمل ہو چکا تھا۔

☆☆☆

وسیع و عریض محل نما بنگلے میں خوب چہل پہل تھی۔ شہر کی مشہور و معروف کیٹرنگ سروس کو آرڈر دے کر سینکڑوں دیگیں بنوائی گئی تھیں، ان میں سے بیشتر یتیم خانوں، رفاہی اداروں اور مدرسوں کو بھیجی گئی تھیں۔ قریبی گوٹھ اور کچی آبادی والے بھی ان دیگوں سے مستفید ہوئے اور بنگلے کے ملازمین کی تو عید ہی ہو گئی تھی۔ امداد بروہی نے کسی بادشاہ کی طرح اپنے خزانوں کے منہ کھول دیے تھے۔ اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا، اس کی واحد اولاد نرینہ اس کی آئندہ نسل کا امین، پھانسی کے تختے سے اتر کر واپس آیا تھا۔

آج جشن کا دن تھا، خوشی کا دن تھا، آج بہت دنوں بعد اسے سکون کی نیند آئی تھی، بہت عرصے بعد بے فکری اس کے چہرے پہ نظر آئی تھی، زندگی اور زندہ رہنے کی امید، شاید نہیں بلکہ یقیناً دنیا میں اس سے بڑی کوئی خوشی نہیں، جوانی کی سرحدوں کو چھوتا ہوا اس کا بیٹا بھی اس خوشی کو محسوس کر رہا تھا۔ دل و جان سے محسوس کر رہا تھا اپنے ایک ایک پور ایک ایک مسام میں دھڑکتی زندگی اسے محسوس ہو رہی تھی۔

اور یہ تو ہونا ہی تھا۔ بلکہ یہی تھا جو ہونا تھا انجام بخیر، ٹانگ پہ ٹانگ رکھے کرسی پہ بیٹھے امداد بروہی نے اپنی مونچھوں کو تاؤ دیا۔ اس دن کے لیے، اس خوش نصیب دن کے لیے کتنے پاپڑ بیلے تھے اس نے، جھوٹ، فریب، مکاری، دباؤ، خوشامد، لالچ، ترغیب، خوف کون سا ہتھکنڈہ تھا جو نہیں آزمایا تھا۔ ملک خداداد میں دولت وہ اسم اعظم ہے جو ہر مشکل کا حل نکال لیتی ہے، ہر مصیبت ہر بلا کو دور کر دیتی ہے۔ یہ وہ کنجی ہے جو ہر قفل کھول دیتی ہے، چاہے وہ کتنے ہی بھاری بھرکم اور مضبوط ہوں یا کتنے ہی زنگ کھائے ہوئے ہوں، چاہے کچھ وقت لگے مگر بالآخر کھل ہی جاتے ہیں۔

اور امداد بروہی نے بالآخر وہ سات قفل کھول لیے جس کے پیچھے اس کا اکلوتا بیٹا مقید تھا۔ اس خوشی کے ساتھ ساتھ وہ کچھ اور بھی سوچ رہا تھا۔ بیٹے کی رہائش اور آئندہ زندگی کے لیے وہ کوئی ایسی جگہ سوچ رہا تھا جہاں اسے گرفتاری کا، سزا کا یا اس طرح کا کوئی خوف نہ ہو، ایک بے فکر اور پرآسائش زندگی اس کی دسترس میں ہو۔ یہ

فیصلہ تو امداد بروہی بہت پہلے کر چکا تھا کہ بیٹے کو ملک سے باہر بھیجنا ہے مگر کہاں؟ یہ فیصلہ ہونا ابھی باقی تھا۔

☆☆☆

سرتاپا سفید لباس میں ملبوس، سر پہ دوپٹہ بھی سفید ہی تھا اور اس انداز سے سیٹ تھا کہ ہیئر اسٹائل اپنی تمام تر خوب صورتی کے ساتھ نظر آئے، چہرے پہ میک اپ تھا مگر ایسا جو نمایاں تو دور کی بات، نظر بھی نہ آئے، جسے عرف عام میں نو میک اپ لک کہا جاتا ہے، کانوں کے ننھے ننھے سے آویزے اور دائیں ہاتھ کی تیسری انگلی میں ایک انگوٹھی، کلائی میں ایک بریسلٹ فقط یہ تین زیور جو ڈائمنڈ کے تھے، سادہ مگر برانڈڈ جوڑا، جوتی، ہینڈ بیگ اور گلاسز، سر سے پاؤں تک بظاہر بہت سادہ سی تیاری تھی مگر یہ تیاری لاکھوں روپے کی تھی۔

پریس کانفرنس کی ساری تیاریاں مکمل تھیں، صحافی حضرات ہاتھ میں قلم اور ذہنوں میں سوالات لیے بالکل تیار بیٹھے تھے۔ جب پرکشش اور مشہور شخصیت کی مالک سارہ یوسف زئی تیز تیز چلتی ہوئی آئی اور اپنی کرسی سنبھال لی۔ چنبیلی تیزاب گردی کیس جتنا میڈیا میں آ رہا تھا۔ سارہ بھی اتنی ہی خبروں میں ان تھی۔ اس وقت وہ واحد سیاستدان تھی جو چنبیلی کی حمایت میں سرگرم عمل تھی۔ طلال کے خلاف جو ایف آئی آر کٹی وہ سیارہ یوسف زئی کی کوششوں اور اثر و رسوخ کی بدولت ہی ممکن ہو سکا تھا اور اس کیس کو میڈیا میں نمایاں جگہ مل رہی تھی وہ بھی سارہ کی ذاتی دلچسپی اور تند و تیز بیانات کی بدولت تھی۔

سارہ یوسف زئی نے ایک مختصر مگر بے حد جارحانہ تقریر کی تھی جس کے آخر میں اس نے اپنی تقریر کو کچھ یوں سمیٹا کہ۔

"میں بس یہ چاہتی ہوں کہ اس مظلوم بچی کو انصاف ملے، بے شک ملزم بہت با اثر اور بہت ظالم ہے مگر اب وقت آ گیا ہے کہ آج کے ان فرعونوں کے خلاف ہم سب اٹھ کھڑے ہوں۔ جو اپنے ہی جیسے انسانوں کو معمولی کیڑے مکوڑے سمجھتے ہیں اور اپنے پیروں تلے کچل دینے کو ہمیشہ تیار رہتے ہیں۔ یہ وہ بدمست ہاتھی ہیں

جوفقط انسانوں کو ہی نہیں بلکہ ہماری معاشرت، اخلاقیات، تہذیب امن اور انصاف، ہر اس شے کو کچل مسل رہے ہیں جو ایک آزاد انسان کا حق ہے۔"

صحافیوں کی طرف سے سوالات کا آغاز ہوا۔

"بیگم صاحبہ کہا جارہا ہے کہ اس مقدمے میں آپ کی دلچسپی کی وجہ یہ ہے ملزم آپ کے سابق شوہر اور سوکن کا بیٹا ہے؟"

"میں صرف اور صرف اس لیے کھڑی ہوئی ہوں کہ ایک مجبور بے بس اور کمزور فرد کو انصاف دلا سکوں اور اس کے مجرموں کو سزا دلوا سکوں، براہ مہربانی آپ لوگ اسے ذاتی عناد اور مفاد کا نام مت دیں۔" سارہ نے اسے جواب دیا۔

چیتلی جیسے کتنے ہی واقعات اب عام ہو گئے ہیں، پچھلے ایک سال میں ہی ملک کے مختلف حصوں میں ایسے ایک درجن کیس فائل ہوئے ہیں، آپ نے پہلے کبھی کسی کے حق میں آواز نہیں اٹھائی، کیوں؟"

"کیونکہ میں پچھلے کئی سالوں سے ملک سے باہر تھی۔ اور آپ کی معلومات میں اضافے کی غرض سے بتا دیتی ہوں کہ میں تین ماہ پہلے ہی پاکستان آئی ہوں۔" سارہ کے لہجے میں خفیف سا طنز تھا۔

"آپ سمجھتی ہیں کہ ملزموں کو قرار واقعی سزا ہو گی؟"

"میں لڑنے کے لیے تیار ہوں، وہ لڑکی بھی لڑنے اور ڈٹ جانے پر آمادہ ہے اور مجھے اپنی عدالتوں سے انصاف کی امید ہے۔ ان دو وجوہات کی بناء پر میں سمجھتی ہوں کہ ملزم کو سزا ہو گی اور ضرور ہو گی۔"

"سنا ہے آپ کو پریشرائز کیا جارہا ہے اس مقدمے کو چھوڑنے اور پیچھے ہٹنے کے لیے؟"

"صرف ہمارے ملک میں ہی نہیں دنیا میں ہر جگہ یہی ہوتا ہے کہ جب بھی کوئی شخص حق و انصاف کے لیے سچ کے لیے کھڑا ہوتا ہے تو اسے ترغیب بھی دی جاتی ہے، دباؤ بھی پڑتا ہے، لالچ بھی دیا جاتا ہے اور دھمکی بھی، مگر میں اس قسم کے کسی ہتھکنڈے کا شکار ہونے والی نہیں ہوں نہ مجھے کسی کی دھمکی روک سکتی ہے نہ کوئی لالچ، چاہے کچھ بھی ہو میں آخر تک لڑوں گی۔"

کچھ اور بے ضرر سے سوالات کے بعد پریس کانفرنس ختم ہو گئی، صحافیوں اور رپورٹرز کا رخ اب ان میزوں کی طرف تھا، جہاں پر تکلف عصرانہ ان کا منتظر تھا۔

☆☆☆

وہ بیڈ پہ لیٹی تھیں، چہرے پہ کچھ زردی اور نقاہت تھی ابھی ابھی عائشہ انہیں دوائی کھلا کر گئی تھی۔ اب ذوہیب ان کے پاس بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پہ تفکرات کے سائے تھے اور آنکھوں سے پریشانی چھلک رہی تھی۔ حالانکہ ڈاکٹرز نے تو یہی بتایا تھا کہ معمولی سا انجائنا کا اٹیک تھا۔ بروقت طبی امداد سے طبیعت سنبھل گئی تھی۔ ایک دن اسپتال میں رکھ کر انہوں نے گھر بھیج دیا تھا۔ ذوہیب کے والد اور بہن آج رات کی فلائیٹ سے کراچی آرہے تھے۔

"پاپا کو بلانا تھا تو ایسے ہی بلا لیتیں، ہاسپٹل جانے کی کیا ضرورت تھی؟"

ذوہیب ہلکے پھلکے مذاق کر کے ان کا دل بہلانے کے جتن کر رہا تھا۔ خود کو بظاہر لاپرواہ اور بے خوف ظاہر کر رہا تھا مگر درحقیقت اندر سے وہ تھوڑا سہم گیا تھا، اس کے مذاق پہ امی مسکرا کے رہ گئی تھیں۔ زیر لب تبسم کی ساتھ کچھ دیر وہ بیٹے کو دیکھتی رہیں۔

"ذوہیب۔"

"جی۔"

''میں بہت دنوں سے ایک بات کہنا چاہ رہی تھی تم سے۔''
''کہیے۔''
ماں کے لہجے میں غیر معمولی پن تھا جسے محسوس کر کے ذوہیب کی ساری حسیات چوکنا ہو گئیں۔
''تم نے اپنے فیوچر کے متعلق کیا پلان کیا ہے؟'' اپنی بات کہنے سے پہلے انہوں نے سوال کیا۔
''پاپا سے بات ہوئی تھی۔ وہ یہاں آئیں گے تو میں نیویارک چلا جاؤں گا۔ آگے بھی وہاں کا کام میں ہی سنبھالوں گا، یہاں کام کرنا مجھے بہت مشکل لگ رہا ہے۔ یہاں کے لوگوں کو پاپا ہینڈل کر سکتے ہیں، میں نہیں۔
ذوہیب نے اپنا آئندہ کا لائحہ عمل بتاتے ہوئے اعتراف کیا۔
''میں شادی کے متعلق تمہاری رائے جاننا چاہ رہی تھی۔''
''شادی؟'' ذوہیب چونکا۔
''ہاں، میں اب تمہاری شادی کے متعلق بہت سوچنے لگی ہوں تمہیں کوئی پسند ہے تو بتا دو۔''
''میرے فیوچر پلانز میں شادی چند سال بعد ہے، ابھی تک تو کوئی لڑکی ایسی نہیں ملی جس کے لیے اپنا پلان تبدیل کر دوں۔''
''ماں کے لیے تو کر سکتے ہو۔'' امی کی آنکھوں میں بڑی امید تھی۔
''آپ کے لیے تو جان بھی حاضر ہے، بتایئے کب اور کس کے ہاں بارات لے جانی ہے۔'' ذوہیب نے ماں کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیا۔ اس کی نرم گرم گرفت مضبوط تھی۔
''عائشہ کیسی لگتی ہے؟''
''اچھی ہے۔''
''میں اسے اپنی بہو بنانا چاہتی ہوں، تم اسے میری خودغرضی سمجھ لو، میں ایسی بہو لانا چاہتی ہوں جو ہمارے بیٹے کو ہم سے دور نہ لے جائے بلکہ سب کو سمیٹ کر رکھے، وہ بہت ادب، احترام اور محبت والی بچی ہے مجھے یقین ہے کہ وہ تمہیں بھی خوش رکھے گی اور ہمیں بھی۔''
''خدا کرے کہ آپ کے سارے گمان سچ نکلیں، مگر یہ بتایئے کہ آپ نے عائشہ کی رائے بھی لی ہے یا بس اپنی طرف سے ہی، سب کچھ طے کر رہی ہیں؟'' ذوہیب نے سنجیدہ ہو کر سوال کیا۔
''یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔ میں بات کر لوں گی، وہ بہت پیاری بیٹی ہے، مجھے یقین ہے کہ انکار نہیں کرے گی۔'' ان کے چہرے پہ یکا یک ہی ایسی چمک آ گئی تھی کہ ذوہیب دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔

☆☆☆

''الو کا پٹھا، ڈال دیا نا سب کو مصیبت میں۔''
ڈھیر ساری بھاری بھرکم گالیوں کے بعد آخر میں بالکل بے ضرری گالی دے کر انہوں نے اپنی بات کا اختتام کیا تھا۔ ساٹھ کے پیٹے میں ہونے کے باوجود بھی اس کی شخصیت میں ایک عجیب سی کشش تھی، کچھ کشش اس کی بے پناہ دولت اور جائیداد کی تھی۔ کچھ عہدے، اقتدار اور اختیار کی بھی تھی جو اس سے آدھی عمر کی لڑکیاں اور خواتین بھی اس کی طرف کھنچی چلی آتی تھیں، حال ہی میں ایک جواں سال اور خوب صورت ایئر ہوسٹس سے بیاہ رچایا تھا۔ ہنی مون ابھی شروع بھی نہیں ہوا تھا کہ بیٹے کی حرکت نے اپنے ساتھ ساتھ باپ کو بھی مشکل میں مبتلا کر دیا۔ اپنے پرانے اور خاندانی وکیل کے سامنے بیٹھا وہ جی بھر کے بیٹے کو گالیاں دے رہا تھا۔
''جو ہونا تھا وہ تو ہو گیا چوہدری صاحب، اب آگے کے بارے میں سوچیں کہ کیا کرنا ہے۔''
''اوئے میں کیا سوچوں؟ یہ کام تمہارا ہے اسی لیے بلایا ہے تمہیں، تم بتاؤ کہ کیا کرنا ہے۔ میرا تو دماغ ہی

کام نہیں کر رہا۔"

چوہدری صاحب جھنجھلا کر وکیل صاحب پہ برس پڑے۔ اگر بیٹے نے یہ سیاپا نہ ڈال دیا ہوتا تو اس وقت وہ اپنے بنگلے میں وکیل صاحب سے الجھنے کے بجائے دبئی، سنگاپور یا ہانگ کانگ میں اپنی نئی نویلی بیگم کے ساتھ موجود ہوتے۔

"سینکڑوں بار سمجھایا اس الٹی کھوپڑی کو، کہ ہر کام خود سے کرنے کا نہیں ہوتا، اتنے غنڈے موالی اور ملازمین میں کس لیے پالتا ہوں؟ کسی سے بھی کام کرواؤ، اوئے یہ جو ہمارے وفادار ہیں ناخوشی خوشی بکرا بننے کو تیار ہو جاتے ہیں، مگر اس گدھے کو خود ہیرو بننے کا شوق ہے۔ اب نکل جائے گا سارا شوق ناک کے رستے سے جیل کی سلاخوں میں فوم نہیں لگا ہوتا ہیں جی۔"

"صحیح کہہ رہے ہیں چوہدری صاحب! جیل ہو یا جیل کی سلاخیں، دونوں ہی بہت سخت ہوتی ہیں انہیں نرم کرنے کے لیے بڑے جتن کرنے پڑتے ہیں، پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔"

وکیل صاحب بہت شاطر، منجھے ہوئے پرانے کھلاڑی تھے اس فیلڈ کے، جتنی تگڑی فیس لیتے تھے۔ اتنی ہی جی جان سے محنت کرتے تھے کیس جیتنے کے لیے، صحیح غلط، سچ جھوٹ، جائز ناجائز یہ سب الفاظ ان کے نزدیک بے معنی تھے۔ اپنا کیس جیتنے کے لیے وہ ہر راستہ، ہر حربہ اختیار کرنے پہ یقین رکھتے تھے۔

"ارے تو وکیل صاحب آپ کرو نا، ہر جتن کرو، ہر پاپڑ بیلو جو کر سکتے ہو کرو، میری مدد چاہیے تو بولو۔"

"چھوٹے چوہدری صاحب کے خلاف کیس مضبوط ہے، گواہ موجود ہیں جنہوں نے انہیں وہاں دیکھا پھر وہ آپ کی ایکس وائف، وہ بہت آگے ہیں اور پوری طرح ان لوگوں کو سپورٹ کر رہی ہیں۔"

"اس کی ایسی کی تیسی۔" چوہدری صاحب نے ایک نحش گالی اپنی سابقہ بیوی سارہ یوسف زئی کو دی جو چنبیلی کے کیس میں غیر معمولی دلچسپی اور کارکردگی دکھا رہی تھی۔

"اس کو تو میں سنبھال لوں گا، اس کے نئے خاوند کی گوٹ کہاں پھنسی ہے، میں جانتا ہوں۔" چوہدری صاحب نے اپنی مونچھوں کو تاؤ دیا۔

"کوئی گواہ لانا ہے جو طلال کے لیے گواہی دے، وہ بھی سالڈ اور پرفیکٹ ہو۔" وکیل صاحب نے خود کلامی کی تھی۔

"آپ اپنا شاطر دماغ چلاؤ وکیل صاحب، میں اس نالائق کو جلد از جلد جیل سے باہر دیکھنا چاہتا ہوں۔"

جتنی دیر میں چوہدری صاحب نے اپنی بات مکمل کی، وکیل صاحب ایک ممکنہ گواہ کے بارے میں سوچ بھی چکے تھے۔

☆☆☆

تین روز ہی ہوئے تھے، فقط تین روز، یعنی تین دن اور تین راتیں، اور یہ ذرا سا پیریڈ آف ٹائم ایک قیامت، ایک عذاب سا بن گیا تھا، کسی پل چین تھا نہ سکون، سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں ایسے ایسے لرزا دینے والے خیالات آتے، وہ فوراً انہیں جھٹکتی، جیسے کوئی زہریلا سانپ، بچھو، جو ذہن کی دیواروں سے لٹک گیا ہو، ایسے ان گنت زہریلے سانپ بچھو جھٹک جھٹک کر وہ ادھ موئی ہوئی جا رہی تھی مگر وہ موذی تھے کہ کم ہونے کے بجائے بڑھتے ہی جا رہے تھے حالانکہ میزبان اپنی طرف سے تو خاطر داری اور مہمان نوازی میں کوئی کسر نہیں چھوڑ رہے تھے مگر اس کا اضطراب، اس کی بے چینی کسی طور کم نہیں ہو رہی تھی۔ کوئی امید کی صبح؟ کوئی روشنی کی کرن؟ ہر صبح ہر شام ایک آس ہوتی اور پل پل گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ ہر آس ہر امید دم توڑتی چلی جاتی۔

یاس نراس کے عالم میں سر جھکائے ہاتھوں کی لکیروں کو کھوجتی اپنے خیالات میں گم تھی جب پہلے ایک سستے

سے پرفیوم کا بھبکا آیا پھر سومی کی آواز۔
''یہ لو جمال بھائی سے بات کرلو اور دروازہ بند کرلینا میں بازار جارہی ہوں، تھوڑی دیر میں آجاؤں گی۔''
نائلہ کی ساری حسیات فقط اس کے پہلے جملے پر ہی مرکز ہوگئی تھیں، آگے اس نے کیا کہا، نائلہ کی سمجھ میں خاک نہ آیا، اس نے سومی کے ہاتھوں میں پکڑے موبائل کو یوں دیکھا جیسے کئی دنوں سے صحرا میں بھٹکتا کوئی بھوکا پیاسا، اچانک کسی نخلستان میں خود کو پائے اور اسے اپنی آنکھوں پہ یقین نہ آئے، اس کے ترسے ہوئے ہاتھوں نے موبائل لیا، کان سے لگایا، اس کا رواں رواں سماعت بن گیا۔
سومی ٹھک ٹھک کرتی سیڑھیاں اترتی چلی گئی۔
''ہیلو جان۔'' ایک مانوس آواز نے اس کے سارے تار چھیڑ کر اسے مرتعش کردیا۔
''جمال! تم کہاں ہو؟'' اس کے سارے رکے ہوئے آنسو اک دم ہی بہہ نکلے۔

☆☆☆

لابی میں پہنچ کر وہ ایک بار ٹھٹکا، پھر ایک گہری سانس لے کر لفٹ میں داخل ہوگیا۔ مطلوبہ فلور، مطلوبہ فلیٹ اور کال بیل پر دروازہ کھولنے والا شخص، سب کچھ مانوس تھا، بے حد مانوس۔
''تم نے جو کچھ ہمارے بیٹے کے لیے کیا وہ ہم کبھی فراموش نہیں کرسکتے، اپنی آخری سانس تک تمہارے لیے دعا گو رہیں گے۔''
اور جو کچھ آپ لوگوں نے کیا، میں بھی وہ سب فراموش نہیں کروں گا، اپنی آخری سانس تک نہیں بھول سکتا۔ مانی کا دل چاہا، وہ اپنے خیالات بیان کرے مگر وہ خاموش رہا کہ اس کے سامنے جو میاں بیوی بیٹھے تھے، وہ دونوں اس کے لیے بے حد قابل احترام تھے۔ ہاں اسے شکایت تھی، دونوں سے نہیں، ایک سے، مگر اپنی شکایت، اپنے احساسات کو وہ لفظوں میں رقم کرکے، اظہار کرچکا تھا۔ گلہ ایک ہی بار کیا جاتا ہے، بار بار شکوے کرنے سے اہمیت ختم ہوجاتی ہے، شکوے کی بھی اور شکوہ کرنے والے کی بھی۔
''تم نے صحیح لکھا، تمہاری جگہ میں ہوتا تو شاید ایسے ہی سوچتا، یوں ہی ری ایکٹ کرتا، مگر۔''
ایک لمحے کو ان کی آنکھوں میں نمی لہرائی۔
''اگر تم میری جگہ ہوتے تو یقیناً یہی فیصلہ کرتے۔''
ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولتے ہوئے وہ اداس اور دکھی ضرور تھے، مگر مایوس اور دل شکستہ نظر نہیں آتے تھے۔
''میں کسی کے سامنے اپنی صفائی پیش نہیں کرنا چاہتا، نہ کی ہے اور نہ کروں گا مگر تم، تمہاری بات دوسری ہے، تم ہمارے بیٹے کی ہی طرح ہمیں عزیز ہو۔'' بولتے بولتے وہ خاموش ہوگئے۔
''لڑائی ابھی مزید لڑی جاسکتی تھی، آپ نے اک دم ہی ہتھیار پھینک دیے اور وہ بھی اتنے..... اتنے بھونڈے طریقے سے؟'' مانی لفظ شرمناک استعمال کرتے کرتے رک گیا۔
''یہ وقتی پسپائی ہے۔'' وہ سرسراتے لہجے میں گویا ہوئے۔
''فاتح، دنیا کے سامنے ڈکلیئر ہوچکا ہے۔ اپنی فتح کا جشن منا چکا ہے، خالی میدان میں، خالی ہاتھوں کے ساتھ، اب کس سے لڑیں گے آپ؟''
مانی کی آنکھوں میں وہ حیرت سمٹ آئی جو اپنے اندر ایک سوال چھپائے ہوئے ہوتی ہے۔ آر یو میڈ؟ مگر وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ اس کی اور اس کی جذباتیت، خلوص اور یگانگت کی عمر اتنی نہیں جتنی ظفر صدیقی کے تجربے کی عمر ہے۔ جن راستوں سے وہ، ابھی گزر رہا تھا، ظفر صدیقی ان راستوں سے نہ صرف گزر چکے تھے بلکہ تمام پیچ وخم

سے بھی آگاہ تھے۔
''میں نے تمہیں اس لیے بلایا تھا کہ مجھے تمہاری ضرورت ہے۔'' وہ ساری بحث کو ایک طرف کرتے ہوئے براہ راست موضوع پر آ گئے۔
''میں کیا کر سکتا ہوں آپ کے لیے؟'' مانی کی آنکھوں میں الجھن تیرنے لگی جیسے کوئی پتا پانی کی سطح پہ ڈول رہا ہو۔
اب تم ہی ہو جو سب کچھ کر سکتے ہو۔'' ظفر صدیقی نے بات کا آغاز کیا اور بہت دیر تک ٹھہر ٹھہر کر بولتے رہے۔

☆☆☆

لاک کھول کر اندر آنے کے بعد اس نے دروازہ بند کیا۔ ہاتھ میں موجود کلچ لاپروائی سے صوفے پر پھینکا اور اپنی نیو برانڈ زیرو میٹر گاڑی کی چابی جدید وضع کی میز پر رکھی، جس کی بناوٹ اور تعمیر سازی میں لکڑی کم، شیشہ زیادہ استعمال ہوا تھا۔
صوفے پہ آڑی ترچھی لیٹ کر اس نے سکون و اطمینان سے آنکھیں بند کیں اور لیٹے لیٹے ہی کانوں سے چھوٹے چھوٹے بندے اتار کر میز پہ ڈال دیے اور ہاتھ میں پہنا بریسلیٹ بھی۔
''اف، شکر ہے اس عفریت سے نجات مل گئی، ورنہ وہ تو ایسا بھیانک خواب بن گیا تھا جو کبھی ختم ہی نہ ہو۔'' آنکھیں بند کیے کیے اس نے سوچا۔
''اور اگر اس کی بیوی کی جگہ میں ہوتی تو..... دھمکی تو مجھے بھی دی تھی اس نے۔'' ایک لمحے کو اس نے تصور کیا اور کانپ کر رہ گئی۔
''توبہ توبہ، ایسی حالت ہو جاتی کہ پھر بھیک مانگنے کے ہی لائق رہتی۔ سارے چاہنے والے دم دبا کر بھاگ جاتے۔'' سر کے نیچے کشن ٹھیک سے رکھتے ہوئے ایک تلخ مسکراہٹ نے پریا کے لبوں کو چھوا۔
''سب حسن کے پجاری ہیں، جوانی کے دیوانے ہیں، خود کو سنبھال کے رکھ، جتنا خیال رکھ سکتی ہے اس چہرے کا حسن کا، اس سے زیادہ دکھ، جب تک جوبن ہے تو بھی جوبن پر ہے سمجھ لے۔''
بانو میڈم کی مخصوص کرخت آواز اس کے کانوں میں گونجنے لگی۔ بانو میڈم اپنی جگہ ٹھیک ہی تھی مگر پریا نہ جانے کیوں اب اپنی زندگی سے، ان روز و شب سے اور نت نئے عاشقوں سے کچھ تنگ سی آ گئی تھی، بیزار ہونے لگی تھی۔ اپنی خوب صورتی اور صلاحیت کے بل بوتے پر فیشن انڈسٹری میں قدم جمانے کا خواب دیکھنے لگی۔ مگر قدم جمانا تو دور کی بات، ابھی تک قدم رکھنے کی بھی نوبت نہیں آ رہی تھی۔ اپنے ایک دوست کے توسط سے کوشش کی مگر کوئی خاص کامیابی نہیں ہوئی۔ ہر شعبے کی طرح یہاں بھی گروہ بندیاں تھیں، منافقت اور آپا دھاپی تھی۔ ایک دوسرے کو کہنیاں مار مار کر بھیڑ میں راستہ بنا کر آگے جانے کی تگ و دو تھی اور یہ سارے گر اسے آتے تھے، وہ اوپر جاتے ہوئے فرد کی ٹانگیں کھینچ کر اسے نیچے گرا سکتی تھی اور آگے بڑھتے شخص کو گھسیٹ کر خود سے پیچھے کر سکتی تھی، مگر بس پہلی سیڑھی پہ قدم رکھنے اور بھیڑ میں گھسنے کی دیر تھی اور یہ دیر قریب تھی یا دور؟ کچھ اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔
پریا نے سوچتے سوچتے میز پہ رکھا موبائل اٹھایا اور کسی کو فون کرنے لگی۔
''ہیلو فیضی جی، کیا حال ہیں آپ کے؟ میں یاد بھی ہوں یا بھول گئے؟'' پریا نے ایک ساتھ سارے سوالات کر لیے۔
''ارے بے بی، تم بھی کوئی بھولنے والی چیز ہو؟'' دوسری طرف سے فیضی نے ایک زوردار قہقہہ لگایا تھا۔

''ویسے میں ابھی تمہیں ہی فون کرنے والا تھا۔''
''زہے نصیب۔''
''ایک گھنٹہ ہے تمہارے پاس، ٹھیک چھ بجے یہاں ہونا ہے تمہیں، میرے آفس میں، میٹنگ ارینج کروائی ہے تمہاری۔''
''کس سے؟''
''یہ سرپرائز ہے، نام نہیں بتاؤں گا، تم خود دیکھ لینا، بس اتنا بتا دیتا ہوں کہ اس میٹنگ کے بعد فیشن انڈسٹری کے دروازے تم پر کھل جائیں گے اب وہاں اپنی جگہ بنانا تم پہ ڈپینڈ کرتا ہے۔'' فیضی کی باتوں نے اسے لمحوں میں آسمان کی سیر کرادی تھی۔
''میں آدھ گھنٹے میں پہنچ رہی ہوں۔'' پریا نے کھنکتی ہوئی آواز میں جواب دے کر موبائل آف کیا اور ایک سرشاری کے عالم میں اٹھ کھڑی ہوئی۔
بیڈروم کا دروازہ کھول کر اس نے اپنی جھونک میں قدم رکھا ہی تھا کہ ٹھٹک گئی، سامنے کرسی پہ بیٹھے اجنبی کو وہ پہلی بار دیکھ رہی تھی۔
''بڑا انتظار کرواتی ہیں آپ، پانچ گھنٹے ہو گئے ہیں یہاں بیٹھے ہوئے۔'' مسکراتے ہوئے وہ بے حد اطمینان سے گویا ہوا تھا۔

☆☆☆

دو گھوڑا بوسکی کی قمیض کا کپڑا، سفید شلوار کا کپڑا اعمدہ قسم کی کاٹن کا تھا چار خانے کا رومال، کندھے پہ ڈالنے کے لیے ایک چھوٹا رومال، سفید کڑھائی والی ٹوپی، ایک قیمتی گھڑی، پھلوں اور مٹھائیوں کے ٹوکرے اور لفافے میں رقم۔
ترنم کا بس نہیں چل رہا تھا کہ دنیا جہاں کی نعمتیں اور دولت مولوی صاحب کے قدموں میں ڈھیر کر دے۔ آج چاند بابو کا قرآن شریف لگ گیا تھا۔ ترنم کے پیر زمین پہ نہیں ٹک رہے تھے۔ دیگیں پکوائی تھیں اس نے، خواص، عوام سب کی دعوت تھی۔ بے حد خوشی اور عقیدت کے ساتھ اس نے ساری اشیاء مولوی صاحب کی خدمت میں پیش کی تھیں۔
''بی بی، اب میں مزید یہاں نہیں آ سکتا۔'' مولوی صاحب کے کہنے پر ترنم کی تو سانس ہی رک گئی۔
''کیا ہو گیا مولوی صاحب؟'' اس نے بوکھلائی ہوئی نظروں سے مولوی صاحب کو دیکھا۔
''کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے، دراصل اب چاند بابو کو میرے پاس آنا پڑے گا، مسجد میں اور بچے بھی پڑھنے آتے ہیں، ان کے ساتھ پڑھنا ہوگا۔''
مولوی صاحب نے اس کی پریشانی بھانپ کر تسلی دی اور وضاحت کی۔
''ایسا نہیں ہو سکتا کہ آپ یہیں آ کر پڑھا دیا کریں؟ آپ کا احسان ہوگا مجھ پر مولوی صاحب۔'' ترنم نے لجاجت اختیار کی۔
''مجبوری ہے، میری مصروفیات بھی بڑھ گئی ہیں اور گھٹنوں کی تکلیف میں بھی اضافہ ہو گیا ہے، سیڑھیاں چڑھنا اترنا مشکل ہو جاتا ہے۔''
''کوئی نہیں مولوی صاحب، ہم اپنے شہزادے کو وہیں مسجد پہنچا دیا کریں گے۔'' قربان علی طبلچی نے مداخلت کی۔
''کوئی تنگ تو نہیں کرے گا میرے بیٹے کو۔'' بادل نخواستہ ترنم نیم رضامند ہوئی تھی۔

''میری موجودگی میں کوئی تنگ نہیں کرے گا اسے۔'' مولوی صاحب نے یقین دہانی کروائی۔
''کیا کروں قربان بھائی؟'' ترنم نے مدد طلب نگاہوں سے کھچڑی داڑھی والے قربان بھائی کی طرف دیکھا۔
''مولوی صاحب کہہ تو رہے ہیں وہ خیال رکھیں گے، بس بے فکر ہو جاؤ پھر۔'' قربان بھائی نے سر ہلایا۔
''ٹھیک ہے پھر۔'' ترنم نے بھی اثبات میں سر ہلا دیا۔

☆☆☆

رات کا پہلا ہی پہر تھا۔ اندھیرے میں یوں بھی وہ سب کچھ زیادہ چمک اٹھتا ہے جو پہلے ہی سے روشن ہو جیسے کوئی خیال کوئی یاد، جو دن بھر فرصت کے ہنگام میں بھی ساتھ ساتھ یوں رہتی ہے جیسے بھرے میلے میں بچے کی انگلی مضبوطی سے پکڑنے والا باپ جس کی نظر چاروں طرف رہے۔ دھیان میں بھی کوئی ہے جو دھڑکن کے ساتھ دھڑکتا ہے، لہو کے ساتھ رگ رگ میں بہتا ہے اور جسے دوری کہتے ہیں یا جدائی وہ دراصل پیمانہ ہے ناپنے کا کہ دل میں جو جذبہ ہے، وہ وقتی، لمحاتی ہے یا پائیدار اور دائمی، ہر گزرتے لمحے اس ریشمی ڈور کی گرہ ڈھیلی ہو کر کھلتی جاتی ہے یا اور مضبوطی سے کستی چلی جاتی ہے۔ تو تجربے سے اندازہ ہوا کہ اس رشتے کی جو ڈور ہے اس کی گرہ مضبوط سے مضبوط تر ہوتی جا رہی ہے۔ گرہ سخت سے سخت تر اور دل نرم سے نرم تر۔

خنک ہوا محسوس کر کے اس نے اپنے چہرے پہ ہاتھ پھیرا، جو سرد موسم میں ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ ٹھنڈی ہوا جسم و جان سے ٹکراتی ہوئی اچھی لگ رہی تھی۔ کتنی دیر سے وہ یہاں چھت پہ کھڑا تھا مگر سردی ہونے کے باوجود سردی کا احساس نہیں تھا اسے، جیسے دور ہونے کے باوجود بھی دوری کا احساس نہیں تھا اور اگر کوئی اس ٹھنڈ میں کھڑا اسے دیکھ لے تو پاگل ہی کہے، مگر وہ بے چارہ بھی آخر کیا کرے، محبت کبھی ضروری ہوتی ہے کبھی مجبوری، کچے پکے گھڑوں پہ دریا پار کرواتی ہے اور کبھی ایک مانوس جھلک کے پیچھے موٹر سائیکل اٹھا کر دیوانہ وار بھاگنے کی سعی کرتی ہے اور بعد میں مایوسی کے ساتھ واپسی کہ وہ جو محسوس ہوا وہ واہمہ تھا، محض ایک قیاس، ایک گمان جو دھوکا تھا، سچ نہیں تھا۔ اس خنک ہوا کو رات کے پہلے پہر خود پہ محسوس کرنا بھی ایک مجبوری تھی۔ گھپ اندھیرے میں روشنی کی تلاش اور امید کرنا ہمت کا کام ہے۔ وہ باہمت تھا، حوصلہ مند تھا، زندگی کے الجھے ہوئے دھاگے بے حد آرام اور نرمی سے سلجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

اس کے بہت شفیق باپ نے تسلی اور دلاسے کے پھول اس کے ہاتھوں میں رکھے ہوئے تھے۔
''میں تمہاری امی کو منانے کی پوری کوشش کروں گا صاحبزادے، مگر تم وہ تو ڈھونڈو جو گم شدہ ہے۔''
وہ دھیرے سے مسکرائے تھے۔ اس نے سر جھکا کر فقط جی کہا تھا۔ مگر بیٹے کا چہرہ دیکھ کر باپ کے لیے بھانپنا مشکل نہ تھا کہ تلاش کی ساری کہانی، ساری جدوجہد اس کے چہرے پہ رقم تھی۔ انہوں نے زیادہ نصیحت کرنا مناسب نہ سمجھا، بس حوصلے اور امید کی مشعل ہاتھ میں تھما گئے۔

''سنا ہے گمشدہ چیزیں جہاں کھوئی جاتی ہیں وہیں سے مل بھی جاتی ہیں۔'' (امجد اسلام امجد)
ماریہ کے ساتھ پرانے محلے کا چکر ایک بار پھر لگانا پڑے گا۔ اپنی یخ ہوتی ناک کو چھوتے ہوئے مانی سوچ رہا تھا۔

☆☆☆

کالی سیاہ چادر میں چہرہ کھلا ہوا تھا۔ سیاہ گاگلز نے آنکھوں کی سرخی چھپائی ہوئی تھی اور چہرے کی زردی ہلکے میک اپ میں دب گئی تھی۔ پرس اٹھا کر کمرے سے نکلی ہی تھی کہ شمسو نے پہلے کمرے میں جھانکا پھر دھیرے سے اندر آ گیا۔

''کہاں جا رہی ہے؟'' سوال کرتے وقت اس کا لہجہ بڑا محتاط اور سرسری سا تھا۔ بھلا کس کی جرات تھی کہ جھکا سے سوال جواب کرے۔

''اسپتال۔'' خلاف توقع مختصر جواب آرام سے دیا گیا تھا۔ کسی ادھیڑ بن میں لگ رہی تھی۔ پرس سے موبائل نکال کر اب نہ جانے کیا کرنے لگی۔ کال یا میسج۔

''میں بھی چلوں؟'' شمو نے دزدیدہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''کیوں؟'' ذرا سی تیوری چڑھا کر تیکھا سا سوال۔

''دیکھ لوں گا اسے۔'' شمو منمنایا۔

''اب اس میں دیکھنے کا کچھ نہیں رہا۔'' جھمکا نے سپاٹ لہجے میں بولتے ہوئے موبائل کان سے لگایا۔

''جی خالد صاحب! میں جھمکا۔''

''جی، جی میں ٹھیک ہوں۔'' اس نے بے زاری سے مکھی اڑائی اور فوراً مدعے پر آ گئی۔

''یہ کیا تماشا چل رہا ہے عدالت میں پھر ایک مہینے بعد کی تاریخ دے دی، اتنی لمبی لمبی تاریخ پڑ جاتی ہے ہر بار، آپ کر کیا رہے ہیں؟'' کوشش کے باوجود بھی اس کا لہجہ تند ہو گیا۔

''سب کچھ آپ کے سامنے ہے بی بی، سامنے والی پارٹی کے ہاتھ بڑے لمبے ہیں، بہت طاقت اور اختیار ہے ان کے پاس، وہ اپنی جان لگا رہے ہیں، ہم اپنی طاقت لگا رہے ہیں، کھلا میدان تو ہم نے بھی نہیں دیا ہوا انہیں، ویسے عدالت میں معاملات اسی طرح چلتے ہیں، کئی کئی سال بلکہ صدیاں لگ جاتی ہیں مقدمات کے فیصلوں میں، مگر آپ پریشان نہ ہوں، عوام ہمارے ساتھ ہے، میڈیا ہمارے ساتھ ہے پھر سارہ جی بھی ہماری پشت پر کھڑی ہیں، ان شاء اللہ انصاف ضرور ملے گا ہمیں۔''

وکیل صاحب نے ایک چھوٹی سی تقریر ہی جھاڑ دی تھی، جھمکا کے چہرے پہ بڑے تلخ رنگ ایک کے بعد ایک آ رہے تھے۔

''عوام کے اپنے ہی سیاپے بہت ہیں۔ روز روز رنگ برنگی خبریں آتی ہیں، پچھلے دن کی خبر آج کی خبر کے نیچے دب جاتی ہے، وہ کس کس کو یاد رکھیں اور میڈیا اور وہ بیگم صاحبہ؟ ایک اپنی دکان چمکا رہا ہے، ایک اپنی سیاست۔'' چہرے کے کڑوے رنگ لہجے میں آ گئے۔

''فی سبیل اللہ کون کام کرتا ہے یہاں؟'' خالد صاحب نے سچائی بیان کی۔ ''پھر بھی یہ دونوں اتنی آواز اٹھا رہے ہیں آپ کے حق میں، چینلی کے حق میں تو غنیمت جانیے، اب اس میں اگر کوئی اپنا بھی مفاد جمع کر رہا ہے تو کرنے دیں، اتنا تو حق بنتا ہے ان کا۔''

''اس..... کو سزا ہو گی یا نہیں۔''

''ہونی تو چاہیے مگر عدالت سارے ثبوت اور گواہوں کے بیانات کے بعد فیصلہ کرے گی۔'' انہوں نے تحمل سے جواب دیا۔

''سب کو معلوم ہے کہ وہ مجرم ہے۔'' جھمکا جان کبھی کبھی بچوں کی سی معصومیت والی باتیں کرتی تھی، وکیل صاحب مسکرا اٹھے۔

''چاہے ساری دنیا کسی کو مجرم کہے اور سمجھے مگر عدالت میں جو فیصلہ ہوتا ہے وہ ثبوت اور گواہ دیکھ، سن کر ہوتا ہے۔'' انہوں نے سمجھانے کی کوشش کی۔

''گواہ اور ثبوت نہ ہوں تو مجرم بری ہو جاتا ہے مگر رہتا تو مجرم ہی ہے۔'' بڑبڑاتے ہوئے اس نے کال کاٹ دی تھی۔ سیاہ گاگلز کے پیچھے آنکھوں کی سرخی کچھ اور گہری ہو گئی تھی۔ خیال کا پرندہ کہیں اور بھی بھٹکا تھا۔

☆☆☆

لیپ ٹاپ میز پہ رکھے، پچھلے ایک گھنٹے سے وہ اس پر کام کر رہی تھی۔ اب ذرا کرسی کی پشت سے ٹیک

لگا کر آنکھیں موندی تھیں۔ کچھ دیر تک بند پپوٹوں کو انگلیوں سے سہلاتی رہی۔
''بیٹی، ہمارے کام کا کچھ ہوا؟'' دادی کی آواز پہ ماریہ نے آنکھیں کھول دیں۔
''بڑی نانی جان مصروف ہیں۔ تین گھنٹے بعد خود رابطہ کریں گی۔'' ماریہ نے انہیں اطلاع دی۔
''اچھا۔'' انہوں نے قریب رکھا دیوان سنبھال لیا اور براجمان ہو گئیں۔
''تو کیا ہو رہا ہے اس جام جہاں نما کے ساتھ۔'' دادی کا اشارہ لیپ ٹاپ کی طرف تھا۔
''بہت ضروری کام، دادی آپ کے پاس کچھ رقم ہو گی؟'' ماریہ نے ان کے سوال کا جواب دے کر ایک سوال کیا۔
''ہاں، کیوں نہیں کتنے چاہئیں؟'' وہ خوشدلی سے بولیں۔
''کم سے کم آٹھ، دس۔'' ماریہ کی منتظر نگاہیں ان پر تھیں۔
''ہزار؟''
''نہیں لاکھ۔''
''لاکھ۔'' وہ اچھلی نہیں مگر کیفیت کچھ ایسی ہی تھی۔
''کیا کرو گی اتنی رقم کا۔'' ناک کی پھنگ پہ چشمہ درست کر کے انہوں نے غور سے پوتی کو دیکھا۔
''ایک درزی خانہ کھولوں گی۔'' ماریہ نے دادی کی زبان استعمال کرتے ہوئے بوتیک کا متبادل بیان کیا۔
''اتنے میں کھل جائے گا؟''
''کچھ وانیہ کرے گی، کچھ میں، دونوں مل کر کام کریں گے۔''
''گھر میں ویسے ہی شادی سر پر ہے، بڑا خرچہ۔'' دادی نے اظہار خیال کیا۔
''اسی لیے تو آپ سے پوچھ رہی ہوں، امی، ابو سے نہیں کہا۔''
''ہم منگوا کر دے سکتے ہیں، واپس کیسے کرو گی؟''
''قسطوں میں۔''
''چلو ٹھیک ہے، کچھ ہم کر دیں گے کچھ کے لیے بڑی آپا سے بات کرتے ہیں۔ قطرہ قطرہ کر کے تالاب بھر ہی جائے گا۔'' انہوں نے سوچ کر کہا۔
''تھینک یو دادی۔''
ماریہ نے خوشی کے مارے لپٹانے کے بجائے انہیں دبوچ ہی ڈالا، اس نے تو فقط ایک خواب دیکھا تھا ڈرتے ڈرتے، اندازہ بھی نہیں تھا کہ اتنی جلدی تعبیر کے آثار ظاہر ہو جائیں گے۔
''اری لڑکی! ذرا دھیرج سے۔ بوڑھی ہڈیاں ہیں، ٹوٹنے میں کیا وقت لگے گا؟'' دادی بری طرح گھبرا گئیں۔

☆☆☆

کاپی گھٹنوں پہ رکھی تھی، قلم ہاتھ میں دھیان کے پرندے ادھر ادھر بھٹک رہے تھے کوشش کے باوجود بھی اپنی توجہ ایک طرف مرکوز کرنے میں ناکام تھی۔ تبھی غلط جواب پر سائن کر دیا۔
''مس، اسٹرونگ کے معنی مضبوط ہوتے ہیں نا، کامران نے غلط معنی لکھے ہیں۔'' اپنی کاپی چیک کرانے کے لیے کھڑے حماد نے اسے ٹوکا، اس کی نگاہیں کامران کی کاپی پر تھیں۔
''اوہ۔'' عائشہ نے اس کی تصحیح کی اور حماد کی کاپی چیک کرنے کے لیے لی۔ اس بار بہت کوشش کے ساتھ اس نے اپنی تمام تر توجہ اور تمام تر دھیان کاپی اور کام پر ہی رکھا۔ ایک ایک کر کے ساری کاپیاں چیک ہو گئیں۔ بچوں کو پڑھا بھی دیا، اگلے روز کا ہوم ورک بھی دے دیا۔

چھٹی بھی ہوگئی اور بہت بھاری قدموں اور بھاری دل کے ساتھ وہ گھر کی طرف جا رہی تھی۔کل پوری رات ٹھیک سے نیند نہیں آئی، بار بار آنکھ کھلتی رہی، ذرا سی دیر کی نیند میں بھی عجیب وغریب خواب نظر آتے رہے، وہ گھبرا گھبرا کر اٹھتی رہی، پریشان ہوتی رہی حالانکہ اتنی گھبراہٹ، اتنی پریشانی کی بات بھی نہیں تھی، فقط ایک لفظ ہی تو کہنا تھا۔

نہیں، ایک لفظ کہنے میں کیا قباحت، کیا مجبوری تھی، جس میں اس کا اطمینان تھا، سکون تھا، اس ایک لفظ میں اس کی خوشی، اس کی زندگی چھپی تھی۔مگر پھر بھی یہ ایک لفظ اسے اتنا بھاری لگ رہا تھا جس کا بوجھ اٹھانا دشوار تھا۔انکار کرنے میں عجب ایک بے بسی کی دیوار حائل ہو رہی تھی، اونچی اور مضبوط دیوار۔

وہ خوشی جو عائشہ سے بات کرتے وقت ان کے چہرے پہ تھی، وہ مان اور اعتبار جو ان کے لفظوں میں تھا، اس خوشی اور اس مان نے عائشہ اور اس کی نہیں کے درمیان ایک آڑ حائل کر دی تھی۔وہ سوچ رہی تھی کہ کچھ جرات کا اور کچھ بے حسی کا، کچھ خود غرضی کا مظاہرہ کرنا چاہیے مگر اس سوچ کو عملی جامہ پہنانا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔انہوں نے تحفظ فراہم کیا تھا اسے، محبت دی، عزت دی، اپنائیت، یگانگت دی، ایک پرآسائش زندگی اور پھر انہوں نے ان سب کا بدلہ نہیں مانگا تھا، صلہ نہیں چاہا تھا، فقط اپنی خواہش بیان کی تھی، اپنے دل کی خواہش اور یہ دلوں کے معاملے ہی تو ہوتے ہیں عجیب اور شدید۔

خالہ کے دل کا مان رکھے یا اپنے دل کو ترجیح دے؟ فیصلہ کرنا بہت کٹھن تھا۔خیالات کے بھنور میں الجھتی وہ گھر بھی آ گئی اور سیڑھیاں چڑھتے ہوئے، اپنے کمرے میں جانے کے بجائے لاؤنج میں آ گئی، وہاں سے ٹیرس پر، دروازہ کھول کر وہ جھجھک گئی۔وہاں ذوہیب موجود تھا۔وہ اس وقت کسی کا بھی سامنا نہیں چاہتی تھی، خالہ کا نہیں اور ذوہیب کا تو بالکل بھی نہیں مگر کہتے ہیں کہ دل کے چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا، وہی سامنے آتا ہے جو نصیب میں ہوتا ہے۔

☆☆☆

اس کلین شیو، گورے چٹے اسمارٹ قسم کے اجنبی نے جو کچھ کہا تھا اسے سن کر اپنے کانوں پہ یقین نہیں آ رہا تھا، جیسے اسے دیکھ کر اپنی آنکھوں پہ یقین نہیں آ رہا تھا۔

''کون ہو تم اور یہاں کیسے آ گئے؟'' پریا کو سچ مچ چکر سا آ گیا تھا۔اتنی سیکیورٹی کے ہوتے ہوئے، حفاظتی لاک، الارم، سب کی ناکامی اس کی ایک کامیاب مسکراہٹ میں چھپی تھی۔

''میں کون ہوں، یہ جاننا آپ کے لیے غیر ضروری ہے اور یہاں کیسے آیا ہوں تو ایک درخواست آپ کے گوش گزار کرنی ہے۔''

''میں ابھی سیکورٹی کو بلاتی ہوں۔'' پریا جیسے یکا یک ہی ہوش میں آئی تھی۔

''یہاں آنے کے لیے مجھے کوئی سیکیورٹی نہیں روک سکی تو.....'' اس نے مسکراتے ہوئے اپنا ہاتھ آگے کیا۔

''خوب صورت لڑکیوں کے سامنے اس بدنما شے کی نمائش اچھی نہیں لگتی مگر کبھی مجبوری ہوتی ہے، آپ پلیز تشریف رکھیے اور بی ریلیکس پلیز۔''

اس کے ہاتھ میں موجود پستول کا رخ پریا کی طرف تھا۔چہرے پہ مسکراہٹ تھی مگر آنکھوں میں، لہجے میں عجیب سفاکی اور دھمکی تھی جو بہت نمایاں تھی، پریا نے ایک گہری سانس لے کر خود پہ قابو پایا اور بیڈ کے ایک کنارے پہ ٹک گئی۔

''کس نے بھیجا ہے تمہیں؟''

''یہ سوال آپ نے بالکل ٹھیک کیا ہے، جس کا جواب دینا میں پسند کروں گا۔مجھے ملک صاحب نے بھیجا ہے۔''

''کون ملک صاحب.....'' تیزی سے بولتے بولتے وہ یک دم رک گئی۔
''طلال؟''
''ان کے والد نے۔'' پریا کا ادھورا جملہ اس اجنبی نے پورا کیا۔
پریا یک ٹک اس کی طرف دیکھ رہی تھی، اس کی نگاہوں میں خوف کی تہہ کہیں اندر تھی اور اضطراب زیادہ اور نمایاں تھا۔
''کس لیے بھیجا ہے؟''
''یہ ہے ون ملین ڈالر کوئسچن۔'' اس نے ایک لفافہ پریا کی طرف بڑھایا۔
''اس میں آپ کے سوال کا جواب ہے۔''

☆☆☆

گھر میں شادی کی تیاریاں اپنے زوروں پر تھیں۔ شہر کا کوئی بازار کوئی مال رہ نہیں گیا تھا جہاں گھر والوں نے چکر نہ لگایا ہو اور گھر والوں کا تو بس نام ہی تھا، اصل میں تو یہ ماریہ تھی جس کی نہ اپنی خریداری مکمل ہو رہی تھی، نہ ہی اس کی وجہ سے کسی اور کی مکمل ہو رہی تھی، خوب سے خوب تر اور بہتر سے بہترین کے چکر میں گاڑیوں کے ٹائر گھس گئے مگر کتنی چیزیں تھیں جو ابھی باقی رہ گئی تھیں۔
''یہ میرا آخری چکر تھا، بس اب نہ کوئی مارکیٹ نہ کوئی مال میں کہیں نہیں جاؤں گی۔'' فروا نے ایک روز بازار سے واپسی پر دونوں ہاتھ اٹھا کر باقاعدہ اعلان کیا۔
''مگر تمہاری ابھی جیولری باقی ہے، ولیمے کے شوز اور اور چوتھی میں کیا پہنو گی؟ وہ سوٹ بھی تو باقی ہے۔''
''خدا کو مانو ماریہ، میری چوتھی چالا نہیں ہے جو نئے جوڑے کی فکر کروں، پہن لوں گی کچھ بھی، ابھی تو ان تین تقریبات کی تیاری نے ہی ہلکان کر دیا ہے۔'' فروا نے اپنی بہن کو گھورا، جس کی تمام صلاحیتوں کے باوجود ابھی تک اسے چھوٹی، لاپروا اور تھوڑی بے وقوف ہی سمجھتی تھی، اور فروا بڑی حد تک یہ سمجھنے میں حق بجانب تھی۔
''بہن کی شادی کی تیاری کر کے ہی ہلکان ہو گئیں؟ اپنی شادی پہ کیا کرو گی؟''
''کچھ بھی نہیں، صرف اور صرف آرام۔'' فروا نے بڑے مزے سے جواب دیا۔
''اور تیاریاں کون کرے گا؟'' ماریہ نے اس کے اطمینان پہ اچنبھے سے دیکھا۔
''تم اور کون۔'' فروا نے بیٹھے بیٹھے اپنے پیر پھیلائے۔ ''پھر پھر کے حشر برا ہو گیا، تھکن الگ اور چہرہ بھی کتنا خراب ہو گیا۔'' فروا نے اپنی انگلیوں کی پوروں سے چہرہ چھوا۔
''خیر یہ تو فیشل سے ٹھیک ہو جائے گا اور تھکن تو، ابھی کچھ نہیں ہے شادی کے بعد دیکھنا کیسی تھکن ہو گی۔'' ماریہ کا تجزیہ کس حد تک درست تھا۔
''اچھے بھلے ریڈی میڈ سوٹ لے آتے مال سے، تم نے ہنج لگا دی اپنے ڈیزائنر ویئر پہننے کی، کپڑا اور دوسرے میٹریل کے لیے خوار کر دیا، کوئی کونا نہیں چھوڑا کراچی کا، جہاں نہ لے کے گئی ہو۔''
فروا نے ماریہ کو گھورا، جس نے کسی کو بھی سوٹ خریدنے نہیں دیے تھے، سارے جوڑے خود بنا رہی تھی اور اس کے لیے کب سے خود بھی خوار ہو رہی تھی اور اپنے ساتھ ساتھ باقیوں کو بھی کر رہی تھی۔
''میں عنقریب اپنا بوتیک شروع کر رہی ہوں، تم لوگوں پہ ہاتھ صاف نہیں کروں گی تو دوسروں پہ کیسے کروں گی؟ آفٹر آل، چیریٹی بیگنز ایٹ ہوم۔'' ماریہ نے مسکراتے ہوئے اسے زچ کرنے کی کوشش کی۔
''یہ چیریٹی نہیں ہے، جو تم کر رہی ہو۔ یوں کہو کہ بزنس بیگنز ایٹ ہوم۔'' فروا نے اسے ترنت جواب دیا۔
''آ گئیں تم لوگ، کیا لائی ہو؟'' حمنہ بی بی نہا کر اب نکلی تھیں، سٹر پٹر کرتی آ گئیں اور تھیلے کھول کر دیکھنے لگیں۔

☆☆☆

وسیع وعریض آفس، بہترین سجاوٹ سے مزین تھا۔ قیمتی فرنیچر اور دیگر آرائش بزبان خموشی بتا رہی تھی کہ یہ ملک کے ایک کثیر الاشاعت روزنامے کے مدیر کا دفتر ہے۔ مانی یہاں پہلی بار آیا تھا بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ اسے بلایا گیا تھا۔ اب تک وہ جس اخبار میں لکھ رہا تھا وہ یکے بعد دیگرے اس کے کئی کالم مسترد کر چکے تھے۔ ہر بار ان کا ایک ہی مطالبہ ہوتا، کچھ اور لکھو، کچھ اور سے مراد ان کی وہ آؤٹ لائنز ہوتی تھیں جس کے اندر رہتے ہوئے لکھنے کا مطالبہ کیا جاتا تھا۔

''زہر ہلاہل کو قند کیسے کہہ دوں؟'' مانی بری طرح بھنایا ہوا تھا۔

''آزاد میڈیا، آزاد پریس، آزاد صحافت، کبھی کبھی تو سب کچھ ڈھکوسلہ لگتا، نہ صحافی آزاد ہے نہ صحافت، میں پنجرے میں رہ کر کسی کی مرضی سے ٹیں ٹیں نہیں کر سکتا، آزاد رہ کر اپنی مرضی سے بھونکنا پسند کروں گا۔'' تلخی سے جواب دے کر وہ وہاں سے اٹھ آیا تھا اور آج یہاں بیٹھا تھا، جہاں اسے بلایا گیا تھا۔

''جس طرح لکھنا چاہتے ہو، جو لکھنا چاہتے ہو، لکھو، پابندی کوئی نہیں بس ایک مشورہ ہے، جو بات تم ہنس کر کہہ سکتے ہو اسے منہ بنا کر مت کہو، تمہارا طنز خوب ہے اور مزاح خوب تر، سنجیدگی سے اپنی تحریر بوجھل کرنے کے بجائے طنز و مزاح سے اسے سجا دو۔''

''آپ بھی آؤٹ لائن دے رہے ہیں۔'' مانی مسکرایا۔

''باؤنڈریز ہر جگہ ہیں، لیکن تم اس سے باہر گیند پھینک سکتے ہو، بشرطیکہ چوکا یا چھکا ہو۔'' سفید بالوں والے تجربہ کار مدیر کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ تھی۔

☆☆☆

''ارے، یہ کیا، تم رو رہی ہو۔ مجھ پہ یہ ظلم مت کرو۔ چپ ہو جاؤ شاباش اپنے آنسو صاف کرو۔'' اپنے شہد آگیں لہجے میں وہ مخاطب تھا اور نائلہ کا دل اور بے قرار ہو رہا تھا۔

''تم کہاں ہو، مجھ سے فوراً ملو۔'' نائلہ نے خود پہ قابو پا کر ایک بار پھر اپنا سوال اور مطالبہ دہرایا۔

''آؤں گا، بہت جلد آؤں گا، مجھ سے زیادہ بے چین نہیں ہو گی تم، مگر میں جس مصیبت میں پھنسا ہوں، میں ہی جانتا ہوں، یہ بتاؤ، یہ دونوں تمہارا خیال رکھ رہے ہیں۔ تم ٹھیک تو ہو نا۔''

''میں یہاں نہیں رہنا چاہتی، تمہارے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔'' نائلہ نے جیسے فریاد کی۔

''میں بھی یہی چاہتا ہوں جان، مگر ابھی فوری طور پہ یہ ممکن نہیں ہے۔ میں جس مصیبت میں پھنسا ہوا ہوں۔ اس سے نکلتے ہی سب سے پہلے تمہارے پاس آؤں گا تمہیں لے جانے کے لیے بس دو چار دن اور۔'' جمال بچوں کی طرح اسے بہلا رہا تھا۔

''کچھ بتاؤ تو سہی، آخر بات کیا ہے؟ میں سولی پہ لٹکی ہوئی ہوں، کچھ احساس ہے تمہیں۔'' نائلہ کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کسی طرح یا تو اسے اپنے سامنے لے آئے یا خود اس کے سامنے جا کھڑی ہو۔

''مجھے ہر بات کا احساس ہے مگر میں تمہیں پریشان نہیں کرنا چاہتا، میں اپنی مشکلات سے خود ہی نپٹ لوں گا۔ بلکہ بہت حد تک تو مسئلہ حل ہو چکا ہے یوں سمجھ لو کہ ہاتھی نکل گیا ہے بس دم اٹکی رہ گئی ہے۔''

''اور یہ دم کب نکلے گی؟''

''بہت جلد۔'' جمال نے یقین دلایا۔

''اور وہ بہت جلد نہ جانے کب آئے گی۔''

''تمہیں مجھ پہ بھروسہ نہیں ہے؟''

''نہیں ہوتا تو اتنا بڑا قدم اٹھاتی، اپنا سب کچھ داؤ پہ لگا کر تمہارا ہاتھ پکڑا تھا۔ شروع سے آخر تک سارا بھروسا تم سے ہی جڑا ہوا ہے، مگر اب تو ایسا لگ رہا ہے جیسے کسی بند اور ویران گلی میں کھڑی ہو گئی ہوں۔'' نائلہ کی شکوہ کناں آواز بھیگی ہوئی تھی۔

''تم ایسا کرو گی تو میرا حوصلہ بھی ٹوٹ جائے گا اور خواب بھی، تمہیں کیا معلوم تمہیں پانے کے لیے میں نے کتنے جتن کیے ہیں اور تم ایسی مایوسی کی باتیں کرتی ہو تو خود پہ افسوس ہوتا ہے، اپنے دل پہ، اپنی محبت پہ افسوس ہوتا ہے۔'' جمال انتہائی جذباتی ہو رہا تھا۔

''میں بھی تو پریشان ہوں، کیا کروں؟'' نائلہ دھیمی پڑ گئی۔

''تھوڑا سا انتظار اور بس۔''

نائلہ خاموش رہی، فون بند ہو گیا بہت سے وعدے، دلاسے اور تسلیوں کے بعد، وہ پھر بھی چپ رہی، خاموشی کا بھنور، دائرے کی شکل میں دھیرے دھیرے اس کے اندر پھیلتا جا رہا تھا اور وہ اس دائرے میں سمٹتی جا رہی تھی۔

☆☆☆

''کیسی ہیں آپا۔''

''بس ٹھیک ہی ہیں۔'' ان کا لہجہ بجھا بجھا سا تھا۔

''سب خیریت تو ہے نا؟''

''ہاں ہاں خیریت ہی ہے، کبھی پرانے ذائقوں کی ایسی ہڑک اٹھتی ہے کہ پہروں دل اداس رہتا ہے۔ حالانکہ گھر میں دیسی پکوان ہی پکائے جاتے ہیں کبھی کبھی مگر کچھ چیزوں کو تو زبان جیسے ترس گئی ہے۔'' آپا جان اپنے سارے دکھڑے اپنی بہن کے آگے ہی سناتی تھیں۔

''اب تو یہاں بھی برا حال ہے۔ بدیسی ذائقوں میں اپنے مرچ مسالے ڈال کر عجیب ملغوبہ سا کھا رہے ہیں عوام اور بڑی خوشی خوشی کھا رہے ہیں۔ چائنیز بھی اپنے ذوق اور ذائقے میں ڈھال لیا ہے ہم پاکستانیوں نے، ابھی کل پرسوں تمہاری پوتی صاحبہ نے پزا ڈلیور کیا تھا، جس میں مسالے والے تکے ڈالے ہوئے تھے اٹلی والے اگر اپنے مقبول عام کھانے کا یہ حشر دیکھیں تو کیا سوچیں گے؟''

''ہاں، شاید وہی کچھ سوچ لیں، ہمارے ہاں تو یہ زحمت کوئی نہیں کرے گا۔'' بڑی آپا اپنے یاسیت کے گھیرے سے ذرا باہر آئیں اور مسکرائیں۔

''اور سنیں، باہر تو باہر گھروں میں آہستہ آہستہ چٹنی کی جگہ کیچ اپ اور مایونیز نے لے لی ہے۔ ہماری پوتی صاحبہ خود ہر تلی ہوئی شے انہی میں ڈبو کر کھاتی ہیں اور چٹخارہ بھرتی ہیں، لیکن ایک وہی دیوانی ہیں باقی تو ابھی تک دھنیے پودینے کی، انار دانے کی یا لہسن مرچ کی چٹنی شوق سے کھاتے ہیں، مجھ سمیت۔''

''ہا آ آ، لہسن مرچ اور زیرے کی لال چٹنی کی خوشبو اور ذائقہ تو جیسے بھولی بسری یاد بن گیا ہے، بیٹا اور بہو کہتے ہیں لال مرچ اس عمر میں آپ کو نقصان کرے گی۔ بھلا بتاؤ، ابا میاں اسی برس کی عمر میں بھی بیسن کی روٹیاں اور ڈھیروں چٹنی کیسے ہضم کر لیتے تھے؟''

''وہ لوگ اور معدے کچھ اور تھے، گندم، گھی، دودھ، اناج، سبزیاں، پھل، اصلی غذائیں کھا کر وہ لوگ بچپن سے بڑھاپے تک پہنچتے تھے، اب تو یہ حال ہے کہ جو نہ سنو وہ کم ہے۔ گٹر کے پانی میں سبزیاں اگائی جا رہی ہیں دودھ میں واشنگ پاؤڈر اور کیمیکل ملائے جا رہے ہیں، کیونکہ جو پانی اس میں ملاتے تھے وہ اب گوشت میں ملایا جا رہا ہے۔ کوئی بھی کم نہیں ہے کچھ سونا کھوٹا، کچھ سنار کھوٹا۔'' دادی نے بھی اپنے جی کی بھڑاس نکالی۔

''بڑیاں، منگوچیاں اور بتوے کھانے کو بڑا جی چاہتا ہے۔ چولائی کا ساگ کھائے مدتوں گزر گئی، گوار کی

پھلیاں جب کھائی تھیں جب دو سال پہلے پاکستان گئی تھی۔تم نے ہی تو کھلائی تھیں (رسا دل) گنے کے رس کی کھیر، گڑ کے چاول ہائے ہائے کیسے کیسے انوکھے ذائقے تھے، اب تو جی کڑا کے ابلی سبزیاں زہر مار کرتی ہوں۔"

"یہاں کا چکر لگا لیں، سب چیزیں کھلا دوں گی۔" دادی نے انہیں لالچ دیا۔

"یہی سوچ رہی ہوں، توبہ توبہ کبھی خیال بھی چھو کے نہ گزرا تھا کہ بیسن اور آلو کے پراٹھے کھائے مدتیں گزر جائیں گی، لہسن پیاز کے بگھار کی خوشبو اور چھنن چھنن کو کان ترس جائیں گے؟ کسی کسی ویک اینڈ پہ یخنی پلاؤ، لونگوں کے بگھار والا، ہمارے صاحبزادے تیار کر لیتے ہیں کیونکہ خود بھی شوق سے کھاتے ہیں۔ بہو صاحبہ کوفتے بنا لیتی ہیں، میٹ بالز کہتی ہیں انہیں اور ابلی سویوں کے ساتھ پیش کرتی ہیں سب کو ہمارے لیے تھوڑی گھریلو بنا کر دیتی ہیں، اچھے ہیں بے چارے دونوں، پورا ہفتہ مشین کی طرح کام کرتے ہیں، دو دن ملتے ہیں اس میں بھی ڈھیروں کام ہوتے ہیں۔" آپا جان لگاتار بول رہی تھیں، وہ یاسیت جو ابتدا میں ان کے لہجے میں تھی اب بشاشیت میں بدل چکی تھی۔

"کھانے پینے کے انداز یہاں بھی بہت بدل گئے ہیں، پہلے لذت اور چٹخارے کے ساتھ غذائیت بھی ہوتی تھی، اب غذائیت کم ہوتی جا رہی ہے چٹخارا بڑھتا جا رہا ہے۔"

"ٹھیک کہتی ہو، بھی تو ابا میاں کہا کرتے تھے کہ جو وقت گزر گیا وہی اچھا تھا۔"

"اس معاملے میں تو شاید ہر ایک کا پیمانہ اور تجربہ الگ الگ ہو۔" دادی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"ہاں، ہو سکتا ہے یہ بھی ناسٹلجیا کا ایک روپ ہو، بڑھاپے میں گزرا ہوا وقت ہی سہانا لگتا ہے خیر چھوڑو ان باتوں کو یہ بتاؤ شادی میں کتنا وقت رہ گیا؟"

"بس دو ہفتے باقی ہیں۔"

"اللہ خیر رکھے، بڑا دل تھا میرا آنے کے لیے مگر....."

"کوئی بات نہیں، اگلی بار سہی۔" دادی نے انہیں تسلی دی۔

"ہاں۔" کچھ دیر ادھر ادھر کی باتوں کے بعد دونوں نے خدا حافظ کہا۔

☆☆☆

"ماریہ، کتنی دیر اور؟"

"بس بھائی، پانچ منٹ۔" پچھلے پندرہ منٹ سے وہ یہی پانچ منٹ کا راگ الاپ رہی تھی۔ گھر والوں نے ٹھیک ہی کہا تھا، اس کے ساتھ بازار جانا، ایسا ہی ہے کہ آ بیل مجھے مار، مگر مانی پھر بھی اس کی منتوں پہ پسیج گیا اور طارق روڈ لے آیا، اب کھڑا خود کو ملامت کر رہا تھا۔ دوست کا فون آیا تو مانی کان سے لگائے لگائے تھوڑا آگے چلا گیا۔ کال ختم ہونے پر واپسی کے لیے جیسے ہی پلٹا ٹھٹک گیا۔

"عائشہ....." اس کے لبوں نے بے آواز جنبش کی۔

اپنی تمام تر دلکشی اور رعنائی کے ساتھ وہ بالکل سامنے ہی کھڑی تھی۔ اپنا آنچل سنبھالنے میں مگن اس کی نگاہیں ابھی مانی کی موجودگی سے بے خبر تھیں۔ جو ایک قدم اور آگے بڑھا تھا مگر یوں جیسے کوئی ہپناٹائز۔

"عائشہ منگنی کی انگوٹھی اپنی پسند سے لے لو یا ذوہیب کے ساتھ آ کر خرید دو گی؟"

اس کے ساتھ موجود ایک گریس فل سی خاتون بول رہی تھیں۔

☆☆

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

فرح بخاری

وہ نازنین

گزشتہ اقساط کا خلاصہ:

عبدالواسع کوئٹہ میں وکالت کی تعلیم حاصل کررہا ہے۔ اپنے باغ کے حصول نے واسع کو وکالت کی طرف مائل کیا ہے۔ واسع کی بہن رباب پھوپھی زاد نصیر سے محبت کرتی ہے، لیکن گلشن پھپھو دونوں کی شادی میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔ ان کے ہاں بناوٹے سٹے کے شادیاں نہیں کی جاتی تھیں۔ سیف اور نغمہ کی شادی کو چھ برس بیت چکے ہیں لیکن ان کی کبھی ایک دوسرے سے نہیں بنی۔ پشمینہ سیف کی بہن ہے، وہ رئیس کی بچپن کی منگ تھی لیکن چھ برس پہلے ایک واقعے نے ان کے راستے ہمیشہ کے لیے جدا کردیئے تھے۔ نازنین کوئٹہ شہر میں اپنے بابا کے ساتھ رہتی ہے۔ اس کے بابا کسی بیوہ عورت سے چوری چھپے شادی کرچکے ہیں اور اس کا رشتہ اپنے ایک رنڈوے دوست کے ساتھ طے کردیتے ہیں۔ نازنین عین نکاح کے وقت شادی سے انکار کردیتی ہے۔ دولہا والے دلہن کو زبردستی اٹھالے جاتے ہیں۔ ادھر واسع کوئٹہ سے گھر واپس جارہا ہے۔ بس میں ایک مسافر لڑکی تمام راستہ روتی ہوئی ملی، واسع کو شبہ گزرا کہ اس کی ساتھی عورت اسے اغوا کرکے لے جارہی ہے لیکن وہ اس کی کوئی مدد نہیں کرپایا۔ اگلے روز اسے اپنے کمرے میں اچانک سامنے پاکر واسع کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ معلوم ہوا وہ لڑکی اس کے چچازاد سیف اللہ کی سالی نازنین ہے اور اب یہیں رہنے والی ہے۔ نازنین کو اس کی بہن نغمہ نے مصیبت سے نکالا تھا۔ اب آگے پڑھیے۔

چوتھی قسط

کھانے کے دوران نازنین نے محسوس کیا کہ پشمینہ دماغی طور پہ مکمل غیر حاضر تھی۔ کھانے میں بھی اس کا بالکل دل نہیں لگ رہا تھا۔ نہایت بے دلی اور آہستہ روی سے نوالے توڑتے وہ کبھی کبھار ایک چور نظر باہر بھی ڈال لیتی۔

''یہ بھی کوئی رشتہ دار ہے؟'' نازنین نے بہت عام انداز میں استفسار کیا۔ دونوں اُس وقت کچھ بھی بولے بغیر اندر آ گئی تھیں اور لڑکا بھی پشمینہ پر ایک گہری نگاہ ڈالتے واپس پلٹ گیا تھا۔

''ہوں.....!''

''رباب کا بھائی ہے؟'' نازنین کو لگا شاید بس والے کا دوسرا کوئی بھائی ہے کیونکہ چھت ان ہی کی تھی۔

''نہیں، یہ مجیب چاچا کا بیٹا ہے۔ ان کی چھت اِس سے اگلی ہے۔''

''مجیب چاچا۔'' نازنین نے ذہن پہ زور دیتے دہرایا کہ یہ نام اس نے نغمہ باجی سے بہت بار سنا تھا اور ایک ''خاص'' حوالے سے ہی سنا تھا۔ لیکن وہ خاص حوالہ کہیں نہ کہیں پشمینہ سے بھی جڑا تھا۔ ایسا نازنین کی یادداشت میں دھندلا دھندلا سا اُبھرا ضرور، پر ٹھیک سے سمجھ پھر بھی نہیں سکی اور اب پشمینہ کا ایسا رویہ۔

''کھانا کھاؤ پشمینہ! تمہیں تو بہت بھوک لگی تھی۔''

''بس کھا لیا۔'' وہ زبردستی مسکرائی۔ نازنین نے کھانا ختم کر کے برتن بھی خود ہی کچن میں پہنچائے۔ چھت پر سونے کی آج ان کی پہلی رات تھی اس لیے بے چینی بہت فطری سی تھی۔ لائٹ آف کر کے بستر پر لیٹ کر بھی بہت دیر تک دونوں سو نہیں پائیں

''جاگ رہی ہو؟'' پشمینہ کی آواز بڑی دیر بعد سنائی دی تو نازنین مسکرا دی۔

''ہاں! جاگ رہی ہوں۔'' اس نے کروٹ بدلی۔ کھڑکیوں کے پردے ہٹے ہوئے تھے اور باہر سے دور کسی بلب یا شاید چاند کی ہلکی روشنی آ رہی تھی۔ کچھ فاصلے پہ رکھی دوسری چارپائی پر پشمینہ لیٹی تھی۔

''وہ..... تم نغمہ بھابی سے اِس کا ذکر مت کرنا۔'' پشمینہ نے بہت ہچکچا کر آہستہ سے کہا تو نازنین چونکی۔

''کس کا؟''

''یہ مجیب چاچا کا بیٹا۔ رئیس.....!'' پشمینہ کے انداز میں بہت جھجک تھی جیسے انتہائی مجبوری میں کچھ مانگنا پڑ گیا ہو۔ نازنین کو وہ دوست ضرور مانتی تھی لیکن بے تکلفی ابھی اتنی نہیں تھی۔

''نہیں خیر، باجی کو بطورِ خاص بتانے والی تو اس میں کوئی بات نہیں تھی۔ میں ویسے کہتی بھی نہیں لیکن اگر تم مناسب سمجھو تو تھوڑا کھل کر واضح کر دو، کیونکہ مجھے تمہاری بات کی سمجھ میں نہیں آئی۔'' نازنین نے صاف گوئی سے خود ہی پوچھ لیا۔

''ہاں! خاص بات تو اس میں واقعی کوئی نہیں، بس میں اس نگینہ والے قصے کی وجہ سے کہہ رہی تھی۔ ان لوگوں سے ہمارے تعلقات نہیں ہیں ناں۔'' پشمینہ نے اس مرتبہ بھی مبہم انداز میں کہا۔ اس کا خیال تھا کہ نازنین ہر بات سے واقف ہے۔

''نگینہ!'' نازنین نے پھر ذہن پر زور دیا۔ یہ نام بھی نغمہ باجی کے منہ سے کئی بار سنا تھا، شاید ان کی شادی کے شروع شروع کے دنوں میں۔ جب وہ امی کے ساتھ حال احوال کر رہی ہوتی تھیں۔ لیکن اسے تفصیل کا کچھ علم نہیں تھا۔

''یار! نغمہ باجی سے سب نام سنے ہوئے ہیں لیکن امی اور باجی مجھے اپنی باتوں میں کبھی شامل نہیں کرتی تھیں۔ تم بتاؤ ناں کیا معاملہ ہے، پہلے ہی نیند نہیں آ رہی۔ مزا آئے گا باتیں کرتے ہیں۔'' وہ ایک دم ایکسائیٹڈ ہوئی اور پشمینہ کی اندھیرے میں ہلکی سی ہنسی سنائی دی۔ نازنین کے صاف سادہ انداز نے واضح کر دیا کہ وہ واقعی کچھ نہیں جانتی۔

''ہاں بہت مزے کی کہانی ہے، تم بھی انجوائے کرو۔'' اس کا شکستہ لہجہ انتہا کی اداسی لیے ہوئے تھا لیکن نازنین اس وقت سمجھ نہیں پائی۔

''اچھا بتاؤ نا۔'' نازنین کے لیے فی الوقت اس

کی اداسی سمجھنا مشکل تھا۔
''یہ جو ابھی یہاں کھڑا تھا۔ رئیس۔..... یہ کبھی میرا منگیتر تھا۔'' پشمینہ نے آغاز لیا اور نازنین پہلے ہی جملے پر چونکی۔
''تھا..... مطلب.....؟''
''اب نہیں ہے۔ ہمارا رشتہ چھ سال پہلے ٹوٹ چکا ہے۔''
''ارے۔ تو یہ رشتہ ہوا کب تھا؟'' نازنین کو سوچ کر حیرت ہوئی کہ اتنی سی تو پشمینہ تھی۔ چھ سال پہلے تو بچی ہی ہوگی، تو پھر منگنی کب ہوئی تھی۔
''ہاں۔ میرا اور رئیس کا جب رشتہ ہوا میں اسکول میں پڑھتی تھی، شاید پانچویں، چھٹی۔ اور جب ٹوٹا تب بھی اسکول میں پڑھتی تھی۔ نویں جماعت میں۔''
''تو وجہ کیا تھی؟''
''ہماری منگنی ٹوٹنے کی تو کوئی وجہ نہیں تھی۔ اور دراصل ہماری منگنی ہونے کی بھی کوئی خاص وجہ نہیں تھی۔'' پشمینہ پھر ہلکا سا ہنسی، صاف لگا جیسے اپنی حالت پہ افسوس کر رہی ہو۔
''یار! ٹھیک سے بتاؤ ناں۔ مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔'' نازنین باقاعدہ اُٹھ کر بیٹھ گئی اور بال سمیٹے تکیہ اپنی گود میں جمایا۔ پشمینہ کو اس کے انداز پر ہنسی آئی۔ نازنین کی دلچسپی دیکھتے ہوئے اس کا ذہن بھی تفصیل میں جانے کو بن گیا اور وہ بھی اپنی چارپائی پر اُٹھ کر بیٹھ گئی۔
''اصل میں ہم دونوں کا رشتہ سیف لالہ کی وجہ سے ہوا تھا۔ لالہ کو نگینہ پسند تھی شاید بچپن سے۔ انہوں نے اپنی پسندیدگی کا گھر میں ذکر کیا اور بابا نے خوش ہو کر فوراً ہی مجیب چاچا سے بات کر لی۔ وہ بھی خوش تو بہت ہوئے لیکن ہمارے ہاں چونکہ بنا بدلی کے رشتے نہیں کیے جاتے خصوصاً جب جوڑ موجود ہو۔ تو بس پھر ان کی طرف سے بھی رشتے کی بات کر دی گئی۔ میرے اور رئیس کے لیے جے بغیر کسی حیل وحجت کے فوراً قبول کر لیا گیا۔ ہمارے لیے تب تو یہ بات اہم نہ تھی، ہاں لیکن سیف لالہ کی نگینہ کے لیے محبت کا رشتہ بہت مضبوط تھا۔ لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ یہ محبت یک طرفہ تھی اور یک طرفہ ہی رہی۔ نگینہ کو میں نے ہمیشہ ایک مغرور کزن کے روپ میں دیکھا۔'' ''لیکن یہ بھی میری غلط فہمی ہے کہ وہ مغرور تھی۔ دراصل اس کی دلچسپی اس منگنی میں صفر تھی اور یہی ناپسندیدگی ہم سب گھر والوں کے لیے اس کے رویے سے جھلکتی تھی۔ سیف لالہ البتہ ہرگز یہ ماننے کو تیار نہ ہوتے۔ وہ ان کی محبوب تھی، وہ اس کے رویے کو بھی اس کی ادا سمجھ کر دل سے لگاتے تھے۔ ہم بھی چونکہ عادی تھے تو اسے نگینہ کی شخصیت کا حصہ سمجھتے تھے۔ اس رشتے میں سارا جوش، ساری توجہ صرف لالہ کی طرف سے تھی۔ وہ اسے تحفے دیتے، ملنے اور بات کرنے کے حیلے بہانے ڈھونڈتے، دیوانے تھے اس کے لیے بالکل مجنوں۔ لیکن نہیں۔'' پشمینہ کہتے کہتے رُکی۔
''پہلے میں تمہیں اپنے اور رئیس کے بارے میں بتاتی ہوں۔ عمر کے درجے طے کرتے میں جب نویں جماعت میں آئی تو رئیس نیا نیا کالج میں آیا تھا۔ اب تک کے وقت میں ہم دونوں کے بیچ کوئی خاص جذبہ ایک دوسرے کے لیے پیدا نہ ہو سکا تھا کیونکہ ظاہر ہے، ہم کم عمر تھے، زیادہ کبھی سوچا ہی نہیں تھا اس بارے میں۔ اور جب سوچنا شروع کیا تو بس اس وقت ہی انجام سے پالا پڑ گیا۔ ہم دونوں کی محبت کی کہانی کی مدت بہت مختصر رہی، یوں سمجھو، شروع ہوتے ہی خاتمہ۔'' پشمینہ جیسے پوری طرح اس وقت میں چلی گئی۔
''ہمارے خاندان میں ایک شادی تھی، شاید گلشن پھوپھی کی کسی نند کی۔ مجھے یاد ہے میں نے شادی کے لیے سرخ رنگ کی فراک بنوائی تھی۔ میں اس وقت تیار ہو رہی تھی جب سیف لالہ نے مجھے بلایا۔ انہوں نے نگینہ کے لیے چاندی کی پازیب بنوائی تھی لیکن کسی وجہ سے خود دے نہیں پائے، یا نگینہ شاید کسی وجہ سے خفا تھی اور تحفہ لینے کو تیار نہ تھی۔ لالہ

نے مجھے وہ پازیب دے کر چھت کے راستے ان کے گھر جانے کو کہا اور سمجھایا کہ سیدھے جا کر نگینہ کے ہاتھ میں دے دوں۔

میں تیاری مکمل کر کے خود بھی پائل چھنکاتے چھت پر آ گئی۔ رباب لوگوں کی چھت سے ہوتی، میں مجیب چاچا کی چھت پر آئی اور ان کے گھر کی سیڑھیاں اترنے لگی۔ میرے پاؤں کی پائل بھی چھن چھن کر رہی تھی، میں جب آخری سیڑھی پہ آ کر برآمدے میں اترنے لگی تو سامنے نظر رئیس پر پڑی۔ وہ شاید چھن چھن کی آواز سن کر سیڑھیوں کی طرف متوجہ ہوا تھا۔ میں اسے دیکھتے پا کر تھوڑی سی نروس ہوگئی۔ آس پاس اور کوئی نظر بھی نہیں آیا۔

''وہ..... نگینہ باجی.....'' پشمینہ گھبرا کر سوچنے لگی کہ لالہ کے تحفے والی بات رئیس سے چھپائے تو نیا بہانا کیا ہو۔

''وہ لوگ تو شادی میں چلے گئے۔'' رئیس اب چل کر سیڑھیوں کے قریب آ گیا تھا کیونکہ پشمینہ بجائے نیچے اترنے کے وہیں سیڑھیوں پر ہی رک گئی تھی۔

''اچھا۔'' وہ بھی گھر کی خاموشی دیکھتے سمجھ گئی کہ رئیس اکیلا ہے اس وقت۔

''کیا کام تھا باجی سے۔'' رئیس نے اسے پلٹتے دیکھ کر روکنے کی کوشش کی۔ میلی کچیلی سی ہمہ وقت بدرنگ بڑے سے دوپٹے میں چھپی یہ وہ بورنگ سی پشمینہ تو ہرگز نہ تھی جسے اب سے پہلے وہ اپنی دیہاتی منگیتر کہتا اور سمجھتا آیا تھا۔ سرخ اور گہری سرمئی فراک کے ساتھ، کھلے لمبے بالوں اور ہلکے ہلکے میک اپ کے ساتھ کانوں، ہاتھوں اور گلے میں نفیس سی جیولری پہنے، کیا واقعی وہ ایک گنوار دیہاتن تھی۔ رئیس نے اس کے گھبرائے ہوئے چہرے کو شاید زندگی میں پہلی بار پوری توجہ سے دیکھا تھا۔ شہدسی چمکتی براؤن آنکھوں کا کالے سرمے کے ساتھ کچھ چبھتا اور اپنی جانب کھینچتا ہوا سا احساس۔ چھوٹی سی ناک، پتلا کتابی چہرہ۔

''کچھ نہیں ویسے ہی، شادی میں مل لوں گی۔'' وہ بہانا نہ سوجھنے پر گھبرائی سی واپس پلٹنے لگی۔

''کس سے؟'' رئیس کا موڈ پشمینہ کا گلاب جیسا روپ دیکھ کر تروتازہ ہوگیا تو زبان بھی شرارتی ہوئی

''ہوں؟'' وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا اور پشمینہ کو لگا اب سے پہلے تو کبھی ایک دوسرے کو دیکھا ہی نہیں۔ یہ نظریں، یہ لگاوٹ، وہ رئیس کے نہیں آج واقعی اپنے منگیتر کے سامنے کھڑی تھی۔ سٹپٹا کر جلدی سے سیڑھیاں چڑھنے لگی۔

''اے مینو۔ تو ڈیرا حسین دے۔'' (تو بہت حسین ہے) رئیس کی شوخ پراعتماد آواز نے قدم ڈگمگائے لیکن وہ مڑی نہیں۔ ٹانگیں لرز رہی تھیں، دل بے قابو تھا۔ لالہ کو اس نے جس وقت پازیب واپس کی، ہاتھ واضح کانپ رہے تھے۔ بڑی مشکل سے بات بنا کر اندر بھاگی۔

پھر کچھ دیر بعد شادی والے گھر میں رئیس کی متلاشی نگاہیں صرف اُسی کو ڈھونڈ لینے میں بے تاب نظر آئیں۔ پشمینہ نے بھی اس کی توجہ کو پالیا تھا۔ شادی کے اُن تین دنوں میں بارہا رئیس نے اس کا راستہ روک کر اپنی بے چینی کا اس سے اظہار کیا۔ بلکہ شادی ختم ہوجانے کے بعد بھی اپنے رویے سے ثابت کر دیا کہ یہ چند روزہ جذباتیت نہیں بلکہ وہ کتنا سنجیدہ ہے اِس نئے نئے تعلق اور بہت پرانے رشتے کے متعلق۔ اب وہ حیلے بہانے سے اکثر اُن کے ہاں آ جایا کرتا، نگینہ اور زیبا بھی ان دنوں گھر میں ہوتیں۔ اس لیے وہ بھی کبھی اکیلے تو کبھی رباب کو ساتھ لیے مجیب چاچا کے گھر چلی جاتی اور رئیس بھی اس کی توجہ اور محبت پا کر کھل اٹھتا۔

''لیکن ہاہ۔'' پشمینہ نے ایک درد بھری آہ کھینچتے ناز کو دیکھا۔ ''محبت کو اُڑان بھرنے سے پہلے پر کاٹ کر اپاہج کر دیا گیا۔ ہم دونوں کی محبت کا قصہ چار پانچ ماہ کی مدت سے اوپر نہیں جا سکا۔''

''ایسا کیوں؟'' نازنین کا نازک دل جدائی کے ذکر سے تڑپ اُٹھا۔ ''ایسا کیا ہوا تھا پشمینہ! ابھی ابھی تو کہانی میں رنگ بھرے تھے۔''

''ہاں۔ ہمیں بھی کچھ ایسا ہی لگا۔'' پشمینہ اداسی سے مسکرائی۔ ''لیکن رنگوں سے سجتی یہ تصویر ادھوری ہی رہ گئی۔ سیف لالہ کی محبت ہمارے رشتے کے ہونے کی وجہ بنی تھی اور نگینہ کی محبت اس کے ٹوٹنے کی۔''

''مطلب؟''

''مجیب چاچا کے باغ کی رکھوالی ہمیشہ سے داؤد بابا کرتے آئے تھے۔ بہت ہی بھروسے مند اور وفادار ملازم تھے۔ ان کا بیٹا احمد بھی باپ کی طرح باغوں کی رکھوالی کرتا تھا۔ داؤد بابا اب بوڑھے ہو چکے تھے اور چاہتے تھے کہ ان کے بعد احمد ان کے کاموں کو اسی سوجھ بوجھ اور جانفشانی سے دیکھے۔ احمد علی بھی یوں تو باپ کے نقش قدم پر چلتے ان ہی کی طرح کام سیکھ رہا تھا لیکن وہ پڑھا لکھا اور سمجھ دار لڑکا تھا۔ اس کے خواب اونچے تھے۔ پھر عادتاً بھی بہت ہی الگ شخصیت کا مالک تھا۔ خوبرو تو تھا ہی شخصیت بھی بڑی ہی جادو اثر تھی اس کی، ہر کوئی اسی کے گن گاتا دکھائی دیتا۔

کچھ لوگ واقعی اپنے اندر منوا لینے کی طاقت رکھتے ہیں۔ احمد علی بھی ایک انتہا کا زور آور، حاوی ہونے والا بندہ تھا۔ جہاں جاتا بس ماحول پر چھا جاتا۔ باغ بھی اُس نے نہایت اچھے سے سنبھال لیا تھا۔ برسوں سے ہم دیکھتے آئے تھے کہ داؤد بابا کی فیملی سے مجیب چاچا کے کیسے اچھے تعلقات تھے۔ احمد بھی اور کسی کا تو نہیں لیکن پڑھائی کے ساتھ ساتھ ان کے باغ کا کام بھی دیکھ رہا تھا۔ بس اسی تعلق داری کے بیچ کہیں نگینہ اور احمد کے درمیان محبت کا آغاز ہوا۔ اب کس کی طرف سے۔ کب اور کیسے یہ سب تفصیل تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے یا پھر وہ دونوں، ہاں لیکن بعد میں جب بہت کچھ ہو چکا، تب باتیں کھلنے پر سننے میں آیا کہ دونوں کی آپس میں بچپن کی محبت تھی اور نگینہ سیف لالہ سے منگنی پر ہرگز تیار نہ تھی اور اسی کی وجہ سے نہ تھی۔

ہم سب کو پتا اس وقت چلا جب احمد نے ایک دن اچانک مجیب چاچا سے نگینہ کا رشتہ مانگ لیا۔ مجیب چاچا کے لیے یہ ایک بہت ہی حیرت انگیز بات تھی۔ اُن لوگوں سے دوستی اور خلوص کا تعلق اپنی جگہ لیکن رشتے داری کے متعلق تو وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ پھر منگنی شدہ بیٹی وہ بھی بدلئی والی تو ہرگز نہیں۔ اور سیف لالہ بھی مجیب چاچا کے بے حد چہیتے تھے۔ وہ لالہ کو اپنا بڑا بیٹا مانتے تھے اور اس کی بے حد قدر کرتے تھے۔ انہوں نے احمد کے گھر والوں کو نہ صرف صاف انکار کر دیا بلکہ کچھ ایسی باتیں ان کے کانوں نے سنیں کہ وہ احمد کو کام سے ہٹانے پر مجبور ہو گئے۔ احمد کے رشتہ مانگنے نے عشق کی اس پوشیدہ کہانی کا راز افشا کر دیا تھا۔

مجیب چاچا نے اس واقعے کے بعد سیف لالہ اور نگینہ کی شادی کی جلدی ڈال دی۔ حتیٰ کہ اُڑتی اُڑتی کچھ باتیں سیف لالہ کے کانوں میں بھی پڑیں، پھر نگینہ کے رویے سے بھی وہ کافی پریشان تھے لیکن سچ تو یہ ہے کہ سیف لالہ کی نگینہ کے لیے محبت بہت خالص بہت سچی تھی۔ باوجود کئی تلخ حقیقتیں جان لینے کے وہ نگینہ سے ہی شادی کے خواہش مند تھے۔ ہاں لیکن جتنی گہری سیف لالہ کی نگینہ کے لیے محبت تھی اتنا ہی شدید احمد اور نگینہ کا ایک دوسرے کے لیے پیار تھا۔

احمد کے خود جا کر مجیب چاچا سے رشتہ مانگنے کی بات نے داؤد بابا کے گھر میں بھی کافی پریشان کن صورت حال پیدا کر دی تھی۔ داؤد بابا کا مجیب چاچا سے مالک اور خادم جیسا تعلق تھا، وہ احمد سے خفا تھے لیکن احمد کی سوچ، اس کے دنیا کو دیکھنے کا نظریہ پرانی سوچ سے قطعی مختلف تھا۔ وہ بہت مناسب ڈھنگ سے مجیب چاچا کو سمجھانے کی کوشش کرتا کہ انسانیت کو برابری اور مساوات کی نظر سے دیکھنا چاہیے۔ وہ انسان کے مقام و مرتبے کو ذات پات کے بجائے

اس کی اہلیت کی بنیاد پر جانچتا تھا۔

مجیب چاچا نے اس کی تقریروں سے تنگ آ کر داؤد بابا سے شکایت کی۔ ان لوگوں سے اپنے مراسم وہ پہلے ہی توڑ چکے تھے۔ داؤد بابا نے احمد کو زبردستی چمن بھیج دیا۔ مجیب چاچا نے گھر میں شادی کی تیاریاں شروع کر دیں۔ انہیں اب جلد از جلد نگینہ کو سیف لالہ سے بیاہنا تھا۔ لالہ بھی تیار تھے۔

دونوں گھروں میں شادی کی تیاریاں ہونے لگیں لیکن احمد کے چلے جانے سے نگینہ اتنی بیمار پڑ گئی کہ بستر پر آ گئی۔ میرا بہت بار ان کے ہاں جانا ہوا، مجھے یاد ہے نگینہ چپ چاپ بستر پہ لیٹی چھت کو گھورتی رہتی۔ سلطانہ چاچی رو رو کر ہلکان ہو چکی تھیں کیونکہ وہ کھانا پینا بالکل چھوڑ چکی تھی۔ مجھے انہیں دیکھ کر سچی ڈر لگتا تھا۔ محبت میں کسی کا ایسا حال ہو جانا میرے رونگٹے کھڑے کر دیتا۔

ادھر دونوں گھروں میں شادی کی مکمل تیاریاں ہو جاتیں۔ میں اور رئیس گھر کی اس انتہائی قریبی شادی میں شریک ہونے کے لیے دیوانے ہو رہے تھے۔ یہ وہ وقت تھا جب ہم دونوں ایک دوسرے کی محض ایک جھلک دیکھ لینے کی تگ و دو میں پھرا کرتے تھے۔ لیکن ہمیں بھی کوئی خوشی کم ہی راس آئی تھی۔

سیف لالہ کے ساتھ شادی سے پانچ روز پہلے نگینہ اپنے گھر سے غائب ہو گئی، معلوم کروانے پر احمد بھی اپنے گھر سے لاپتا ملا۔ احمد نے اپنے گھر پہ ایک خط چھوڑا تھا کہ وہ رسم و رواج کی بھینٹ چڑھ کر اپنی نگینہ کو مرتے نہیں دیکھ سکتا۔ ان معاملات میں چونکہ سیدھا خطرہ لڑکے اور لڑکی کی جان کو لاحق ہو جاتا ہے اس لیے سننے میں آیا کہ وہ دونوں شاید سندھ کی طرف نکل گئے تھے۔

ادھر ہمارے گھروں میں بھی ہلا دینے والا زلزلہ آیا تھا۔ مجیب چاچا تو باپ کی حیثیت سے متاثر تھے ہی، ہم بھی دولہا والے ہونے کی وجہ سے ڈائریکٹ متاثرین میں شامل تھے۔ سیف لالہ کی حالت سب سے بری تھی۔ بابا الگ غصے سے کھول رہے تھے۔ برادری میں بری طرح ناک کٹ رہی تھی۔ مردوں کا گھر سے نکلنا مشکل ہو گیا تھا۔

مجیب چاچا نے ان حالات میں مشورہ دیا کہ سیف کی شادی اسی طے کی گئی تاریخ میں زیبا کے ساتھ کر دی جائے۔ اگرچہ مجیب چاچا خود بہت کرائسس سے گزر رہے تھے لیکن انہیں سیف لالہ اور میرے بابا کا بھی احساس تھا۔ لیکن سیف لالہ زیبا سے شادی کے لیے ہرگز تیار نہ تھے۔ انہوں نے کہا کہ نگینہ میری محبت تھی، میں اس کی بہن سے شادی نہیں کر سکتا۔ انہوں نے مجیب چاچا کو بھی کھری کھری سنا دیں کہ سب ان ہی کا قصور ہے۔ مجیب چاچا جس قدر معافی مانگتے، حالات کو قابو میں لانے کی کوشش کرتے۔ لالہ اس قدر زیادہ غضب ناک ہوتے، انہیں اس سب میں نگینہ اکیلی قصوروار دکھائی نہ دیتی۔ انہیں چاچا سے بھی گلے تھے کہ انہوں نے احمد کے ساتھ گہرے مراسم کیوں رکھے، کیوں اس کو اتنی ڈھیل اور آزادی دی، رئیس کے ساتھ میرا رشتہ بھی لالہ نے یہ کہہ کر توڑ دیا کہ ایسے بے غیرت بھائی کو وہ ہرگز اپنی بہن نہیں دے سکتے۔ خیر....." پشمینہ نے ایک آہ بھری۔ "بدلی کی رسم میں یوں بھی ایک رشتہ ٹوٹنے سے دوسرا خود بخود ٹوٹ ہی جاتا ہے، چاہے حالات جیسے بھی ہوں۔ ہم دونوں کی تو صرف منگنی ہوئی تھی، یہاں تو ایک جوڑے کے بگاڑ کی صورت میں دوسرے جوڑے کا نکاح اور شادی تک ٹوٹ جاتے ہیں۔"

"یعنی بغیر کسی قصور کے؟" نازنین حیران ہوئی، نازنین نے اگرچہ ایسے قصے سن بہت رکھے تھے لیکن اس کا خیال تھا کہ شاید گزرے وقتوں میں ایسا ہوتا رہا تھا اب حالات بدل گئے ہیں۔

"ہاں تو اور کیا..... تم نے سنا نہیں کبھی۔ یہ جو گلشن پھوپھی کی نند ہے میمونہ۔ وہ پچھلے سترہ سالوں سے صرف اس لیے اپنے میکے میں ہے کہ اس کی بھابی کو اس کے بھائی نے طلاق دے دی تھی۔ حالانکہ میمونہ باجی اپنے شوہر اور تین بچوں کے ساتھ

بڑی خوش وخرم زندگی گزار رہی تھیں۔ لیکن بدلئی کا چونکہ اُصول یہی ہے تو پچھلے سترہ سالوں سے وہ اپنے میکے میں ہیں۔ بچے تینوں یہاں سے وہاں لڑھکتے اب تو بڑے بھی ہو چکے۔"

"اُووف....." نازنین کے دل کو جیسے کسی نے مٹھی میں لے لیا۔ "تو ان کا شوہر کوئی اسٹینڈ کیوں نہیں لیتا تھا، یہ تو سراسر زیادتی ہے۔"

"یہی تو سارا مسئلہ ہے ڈیئر! رسموں رواجوں کو دل سے لگا کر رکھیں گے تو جذبات واحساسات کو تو مارنا ہی پڑے گا۔ سنا ہے آغاز میں یہ میاں بیوی چوری چھپے ایک دوسرے سے ملا کرتے تھے پھر اس پر بھی پابندیاں لگنے لگیں اور اب تو وہ ایسی تباہ حال زندگی کے شاید عادی ہو گئے ہیں۔ بس لائف ہی خوار ہوگئی دونوں کی۔ مزید ستم یہ دیکھو کہ ان کے ساتھ والے جس جوڑے کی آپس میں طلاق ہوئی تھی۔ وہ دونوں الگ الگ جگہوں پر دوسرا بیاہ رچا کر خوش وخرم زندگی گزار رہے ہیں۔"

"وئی خدایا۔" نازنین تو رو دینے کو تھی، پشمینہ نے درد بھری مسکراہٹ سے اس کا یہ نیا نیا دکھ دیکھا۔

"یہاں ہر دوسرے گھر میں یہی کہانی ہے نازنین! کس کس کا افسوس کرو گی۔"

"اور بھی....." نازنین کا دل دھڑکا۔

"ان ہی گلشن پھوپھو کی ایک دیورانی ہیں خیر بانو۔ ان کی چھوٹی بہن کو بھی بالکل میمونہ باجی کے انداز میں اپنے شوہر سے جدا ہونا پڑا تھا، لیکن وہ یہ جبراً مسلط کی گئی جدائی برداشت نہیں کر پائیں، ان کی شادی کو ابھی صرف ایک ہی برس ہوا تھا کہ دوسرے جوڑے کی طلاق کی وجہ سے ان کی اپنے شوہر سے زبردستی طلاق کروادی گئی اور اس کے لیے یہ صدمہ بہت گہرا تھا۔ وہ بے چاری اسی غم سے پاگل ہوگئیں۔"

"ہائے۔" نازنین نے منہ پہ ہاتھ رکھا۔

"اور لیلیٰ، نگار چاچی کی چھوٹی بہن ہے، اس کا نکاح بھی بدلئی کے چکر میں زبردستی توڑا گیا تھا۔ اور انہوں نے اسی غم میں دوبارہ شادی نہیں کی۔ سنا ہے بہت خوب صورت تھیں۔ اپنی شبنم باجی کو دیکھا ہے نا تم نے۔ بالکل اپنی خالہ لیلیٰ پر گئی ہے۔ سبز آنکھیں، سنہری بال، سرخ ہونٹ۔"

"بس مڑے، میرا کلیجہ اور چھلنی نہ کرو۔" نازنین کی سچ مچ آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔

"اچھا میری کہانی تو پوری ہونے دو۔ ابھی وہ نگینہ اور لالہ کا قصہ تو باقی ہے۔"

"ہاں۔" نازنین کو خیال آیا کہ بات تو ابھی پوری نہیں ہوئی تھی۔

"لالہ کی شادی کی وہ تاریخ تو آ کر گزر گئی جس پر ان کی نگینہ سے شادی ہونی تھی لیکن لالہ کی غیرت، ان کی مردانگی پر جیسے روز کے حساب سے کچوکے لگ رہے تھے۔ دوست احباب کچھ جان لینے کے لیے سوالات کرتے اور میرے بابا اور لالہ کو وہ باتیں تیر کی طرح چبھتیں۔ انہوں نے ڈیرے پر جانا، گھر سے نکلنا حتیٰ کہ مسجد جانا بھی چھوڑ دیا تھا۔ دنیا والوں کی باتوں کا سامنا اب انتہائی مشکل ہو گیا تھا۔ ان کی منگیتر انہیں شادی سے پانچ روز پہلے چھوڑ کر بھاگ گئی تھی، یہ حقیقت اب ناقابل برداشت تھی۔ بس پھر حالات کو دیکھتے بابا نے یہی فیصلہ کیا کہ سیف لالہ کی جلد از جلد کہیں شادی کر دی جائے۔ اب تو کوئی بڑی تبدیلی ہی حالات کا رخ بدل سکتی تھی۔ تب ہی بنا بدلئی وغیرہ کے چکر میں پڑے لڑکی کی تلاش شروع ہوگئی۔

میری اماں کو تمہاری امی کی یاد آئی اور قسمت نے چونکہ نغمہ بھابی کو اس گھر میں لانا تھا تو بس ہوگئی جھٹ پٹ یہ شادی۔ باقی رہ گئے میں اور رئیس۔" پشمینہ مسکرادی۔

"تو میری بہن، یہ رشتہ پہلے بھی کب کسی کے لیے اہم رہا تھا۔ پھر ان کے گھر میں نگینہ باجی کے چلے جانے کے بعد جو سوگ کی حالت تھی اس کا اثر بہت دیر تک نظر آتا رہا۔ رئیس اور اسفند کے لیے بھی اب گاؤں میں رہنا دوبھر ہو گیا تھا۔ وہ بھی کچھ مدت

تک گھر میں بند ہو کر رہ گئے۔ اور پھر دونوں ہی یہاں سے اپنے نام کٹوا کر کوئٹہ پڑھنے کے لیے چلے گئے۔ یہاں تو مہینوں سالوں میں کبھی ایک چکر لگتا۔

رئیس اور اسفند کوئی پانچ یا چھ سال بعد ابھی کچھ ماہ پہلے اپنی اپنی پڑھائی مکمل کر کے گاؤں واپس لوٹے ہیں۔ میرے اور اس کے بیچ بنا کچھ کہے، کچھ طے کیے ہی دُوری آئی تھی۔ پھر بیچ میں ایک لمبا جدائی کا عرصہ اور اب ان کی واپسی۔

میں اسے اپنے سامنے پانے کی، راہ میں ملاقات کرنے کی عادت برسوں ہوئے کھو چکی ہوں۔ لیکن اس دن مجھے لگا جیسے وہ یہ چاہتا ہے کہ اُس چار پانچ مہینے کی مختصر سی محبت کو دوبارہ وہیں سے شروع ہونا چاہیے جہاں سے وہ ٹوٹی تھی۔ معلوم نہیں وہ ایسا کیوں سوچنے لگا ہے، گزرے پانچ چھ برسوں نے اس کا دل کیوں تبدیل نہیں کیا۔"

"کیا تمہارا دل بدل گیا ہے پشمینہ؟"

"ہوں؟" وہ بے طرح چونکی، خالی خالی نظروں سے کچھ دیر نازنین کو دیکھا پھر سر جھکا لیا۔

"وہ تو مرد ہے نا، آزاد گھومنا، ہزار لوگوں سے ملنا۔ اس کے میرے خیالات ایک کیسے ہو سکتے ہیں۔"

"انسان کبھی کبھار آزاد رہ کر ہزار طرح کے لوگوں سے مل کر زیادہ اچھی طرح اپنے اندر کو پہچان پاتا ہے۔"

"لیکن ہمارے حالات، ہماری مجبوریاں؟" پشمینہ نے سوالیہ نگاہ اُٹھائی۔

"ہاں حالات کی کڑوی حقیقت تو یہی بتاتی ہے کہ کوئی امید لگانا خود کو دھوکا دینے کے سوا کچھ نہیں۔" نازنین نے بھی واضح تجزیہ کیا لیکن وہ نہیں دیکھ پائی کہ اس کے کھلے تبصرے نے پشمینہ کے چاند سے چہرے کی جوت کیسے بجھا دی تھی۔ کبھی کبھار نادان دل کو ایسی دلیلیں بڑی راحت دیتی ہیں جو اُس کے حق میں جائیں، اور اِن لمحوں میں آئینہ دیکھنے سے وہ گریز چاہتا ہے۔

☆☆☆

"اماں! آپ نصیر سے خود بات کیوں نہیں کرتیں؟"

"ہائے خدایا۔ اپنے منہ سے کہوں؟" جمیلہ کو جبین کا مشورہ بہت عجیب لگا۔

"کچھ نہیں ہوتا اماں، اب تو اس کی نوکری لگ گئی ہے۔ آپ کسی طریقے سے بات شروع کریں۔" جبین پاس لیٹے علی پہ دوپٹے سے ہلکا ہلکا پنکھا جھل رہی تھی۔ ان دنوں صبح کا وقت برآمدے کے ٹھنڈے خوش گوار ماحول میں گزرتا۔ تھوڑے فاصلے پر تیسری کھاٹ پہ دادی لیٹی تھیں۔ جبین کی آواز ہلکی تھی، اور دادی تو ویسے بھی اونچا سنتی تھیں۔ رباب انہیں اپنے ہاتھ کا ہنر دکھانے کے لیے صندوق سے کئی چیزیں نکال لائی تھی، تکیوں، کشنوں کے غلاف، بیڈ کی چادریں، میز پوش وغیرہ۔ میٹرک کر کے وہ دو تین سالوں سے گھر پر فارغ تھی۔ زیادہ وقت ڈائجسٹ پڑھنے اور سلائی کڑھائی کرنے میں گزر جاتا اور کڑھائی میں اس کی نفاست اور مہارت دیکھنے لائق تھی۔ جبین نے اس کی جہیز کے لیے بنائی بیڈ شیٹ دیکھی تو رباب کی جلد شادی کروانے کے لیے اس کا دل مچل گیا۔ چائے رنگ کی کاٹن کی چادر پر گہرے سبز، نسواری اور میرون رنگ کا اُونی کام کیا ہوا تھا۔ وہ ابھرے ابھرے ان پھولوں پر نرمی سے ہاتھ پھیر رہی تھی۔

"نہ، نہ..... اچھا نہیں لگتا۔ پھر واسع بھی تو منع کر دے گا۔ وہی کہتا ہے پہلے یہاں وکالت تو شروع کر دوں، بہن کی شادی پہ خرچا نہیں آئے گا کیا۔ پھر اس کی اپنی شادی۔"

"زمرد تو ویسے خوش ہوتی ہے ہمارے گھر آ کر۔ پتا نہیں پھوپھی ہم سے کیوں اتنا خار کھاتی ہیں۔" جبین مختلف رنگوں کے الجھے دھاگوں کو ساتھ ساتھ سلجھانے میں لگی تھی۔ رباب کی چیزوں میں دھاگوں کا تھیلا بھی آ گیا تھا، جبین نے الجھے دھاگوں پر رباب کو ڈانٹ بھی دیا کہ وہ بہت لاپرواہ

ہے۔ آج اسے اماں کے گھر آئے تیسرا دن تھا۔ اگلے روز اس کی گھر واپسی تھی۔ واسع بھی پچھلی صبح کوئٹہ چلا گیا تھا۔

''بس کنہ۔ نصیب کی بات ہے۔'' جمیلہ کی آہ نکل گئی۔

''اماں! ویسے ان کا رشتہ اگر بچپن میں کر دیا جاتا تو اچھا نہیں تھا۔ پھر تو پھوپھی بھی کچھ نہ کر سکتیں۔ کسی کو خیال کیوں نہیں آیا؟''

''خیال تو آیا تھا۔'' جمیلہ کہیں دور پہنچ گئیں۔ ''تمہارے بابا کو نصیر اچھا لگتا تھا، ایک دن تمہاری پھوپھی یہیں ہمارے گھر میں بیٹھی تھی۔ زمرد بھی گود میں تھی۔ تمہارے بابا نے تب صاف کہا کہ بدلئی میری طرف ہی کرنا گلشن۔ اب بات تو بالکل صاف تھی پر تمہاری پھوپھی کے تب بھی رنگ بدل گئے تھے۔ بڑی دیر سوچتی رہی، حبیب الرحمٰن سے ڈرتی بھی بہت تھی۔ انکار پر تو وہ سیدھے سیدھے غضب ناک ہو جاتے، بڑا سوچنے پر اُسے میمونہ کا خیال آیا۔ اس کے حالات بھی تب نئے نئے خراب ہوئے تھے۔ اُسی کا حوالہ دے کر کہنے لگی کہ میمونہ کے ساتھ جو ہوا تو اب بچپن کی نسبتوں سے ڈر لگتا ہے۔ اب بات ایسی تھی کہ تمہارا بابا بھی چپ ہو گیا۔''

''تو اب اماں۔'' جبین کی آنکھوں میں تشویش لہریں لینے لگی۔ ''اب کیسے ہوگا یہ سب؟''

''اللہ کا آسرا ہے اور نصیر کی لگن۔ دیکھو پھر۔'' جمیلہ نے بھی ایک الجھا گچھا ہاتھ میں لیا۔ کچھ دیر تک دیکھتی رہیں۔۔ جیسے سرے کی تلاش ہو، پھر مایوس ہو کر واپس رکھ دیا۔ کچھ الجھے معاملے بھی ٹھیک اسی طرح نظریں چُرا کر آئندہ کسی وقت پر ٹال دیے جاتے ہیں۔

☆☆☆

''کہو پھر۔ اور آرام سے ہو تم دونوں۔'' نغمہ نے بستر کی چادریں لپیٹتے مسکرا کر نازنین کو دیکھا۔ نازنین بھی اس کا ہاتھ بٹاتے بیڈ پر بکھری بچوں کی چیزیں سمیٹ رہی تھی۔

''جی ہاں! بہت سکون ہے وہاں۔ اب تو سچی پڑھنے کو دل کرتا ہے۔ لیکن.....''

''ہاں مڑے! تمہاری تو کتابیں بھی ادھر نہیں ہیں۔'' نغمہ کا کچھ سوچتے ہاتھ وہیں رُکا۔ نازنین بے چاری کپڑوں کی وجہ سے بھی کافی مشکل اٹھا رہی تھی۔ فی الحال تک کا وقت تو پشمینہ اور اس کے کپڑے پہن کر گزارا تھا اور ابھی پچھلے روز ہی نغمہ نے سردی گرمی کے کپڑے یہاں وہاں کیے تو دو ان سلے موسم کے سوٹ نکل آئے۔ اس نے فوراً ہی کٹنگ کر کے نازنین کے لیے سلائی شروع کر دی۔ وہ خود تو اپنے منہ سے کچھ نہ کہتی تھی لیکن سوچنے کی بات تھی کہ وہاں کوئٹہ میں اس کا کتنا سامان پڑا رہ گیا تھا۔

''میں بابا سے بات کروں؟'' نغمہ نے مشورے کے انداز میں نازنین کو دیکھا۔

''بابا سے۔'' نازنین کی آنکھوں میں خوف سا لہرایا۔ ''وہ تو شاید آپ کی کال ہی پک نہ کریں۔''

''دیکھ لیتے ہیں۔ پھر تمہارے سامان اور کتابوں کا انہوں نے کرنا بھی کیا ہے۔ اُلٹا ان ہی کا بوجھ بڑھ رہا ہے اور آج کل تو وہ گھر خالی کرنے میں لگے ہیں۔ تمہارا سامان یہاں آجائے تو انہیں آسانی ہوگی۔ بس میں آج ہی ان سے بات کرتی ہوں۔ تمہاری کتابیں آجائیں تو تم بھی تیاری شروع کر دو۔'' نغمہ نے جیسے مصمم ارادہ کیا باپ سے بات کرنے کا۔

''پشمینہ چھت پر ہے نازی؟'' شمیم خالہ نے اندر جھانکا تو بیڈ کی چادر درست کرتی نازنین سیدھی ہوئی۔

''جی خالہ! وہ ابھی وہیں تھی۔''

''ہاں صحیح دا۔ میں آواز دیتی ہوں اُس کو۔'' وہ فوراً ہی پلٹ گئیں۔

''پشمینہ ابھی سو رہی تھی کیا؟'' نغمہ نے نازنین کی طرف دیکھا۔

''نہیں، جاگ تو گئی تھی، کہہ رہی تھی کمر اسیٹ کر کے آؤں گی۔''

''ہوں۔'' نغمہ اب کام نمٹا کر بیڈ کے کنارے پر بیٹھ گئی تھی۔ ''تم دونوں ویسے دن کا زیادہ وقت نیچے ہی گزارا کرو ہم سب کے ساتھ۔'' وہ ذرا نرمی اور آہستگی سے گویا ہوئی تھی، لہجے میں ایسا کچھ تھا کہ نازنین چونک گئی۔

''کوئی بات ہے باجی؟''

''ارے نہیں۔'' وہ ہنس پڑی اور ہاتھ پکڑ کر نازنین کو اپنے ساتھ بٹھالیا۔ ''کام کاج میں ضرورت پڑتی ہے ناں، دیکھو ابھی خالہ بھی پشمینہ کو ڈھونڈتی ہوئی آئی تھیں۔ اوپر رہیں تو سارا دن تم دونوں کو آوازیں دینے میں گزر جائے گا۔'' نغمہ نے اپنے لہجے کو شگفتگی میں ڈھالا لیکن نازنین کی تسلی نہیں ہوئی۔ رات جب وہ پانی لینے نیچے کچن میں آئی تو نغمہ باجی کے کمرے سے تیز آوازیں آرہی تھیں۔ صاف محسوس ہورہا تھا کہ لالہ اور باجی کسی بات پر جھگڑ رہے ہیں۔ تب تو وہ فوراً واپس چلی آئی تھی، نہ کان لگانے کی کوشش کی نہ رُکنے کی۔ لیکن باجی کی اب والی بات۔

''لالہ نے کچھ کہا ہے باجی؟'' وہ ہنوز سنجیدہ تھی اور نغمہ نے جواباً بجائے انکار کے اس کے ہاتھ پر تھپکی دی۔

''اُس کی تو یونہی عادت ہے ہر بات میں بحث کرنے کی، آج اعتراض بھی خود کررہا ہے کہ اِن دونوں کو چھت پر کیوں بھیجا اور کل کو مشکل بھی خود اسی کو ہوگی۔ اب سر مائکل گیا ہے تو گرم علاقوں سے اس کے کئی دوست گھومنے اور شکار کرنے آنے لگیں گے۔ یہ نیچے کے بیٹھک والے کمرے کی آئے دن ضرورت پڑے گی نا تو خود ہی چپ ہوجائے گا۔''

''آپ ہماری وجہ سے آپس میں نہ بگاڑیں باجی۔ اگر لالہ کو ہمارا چھت پہ رہنا اچھا نہیں لگا تو ہم واپس آجاتے ہیں۔''

''نہ لیو نئے۔ کوئی اتنی سیریس بات نہیں ہے۔ میں نے کہا ناں۔ اس کی عادت ہے۔ ارے وہ تو جس دن ہنس کر بات کرلے، ہم سب کو غش آتے ہیں۔ اس کے غصہ کرنے کا تھوڑی نا یہاں کوئی اثر لیتا ہے۔''

نغمہ کا لاپروا انداز ایسا تھا کہ نازنین کو بھی ہنسی آگئی۔ بات تو واقعی ایسی تھی۔ سیف لالہ کو شاید ہی کبھی کسی نے ہنستے دیکھا ہو، اور اب سے پہلے تو نازنین کو یہ بات سمجھ میں نہیں آسکتی تھی لیکن اس رات پشمینہ کی باتوں کے بعد وہ ان کی کیفیت کو بخوبی سمجھ سکتی تھی۔ اسے سن کر بہت حیرت ہوئی تھی کہ سیف لالہ کس قدر رومانوی جذبات رکھنے والے مجنوں قسم کے لڑکے ہوا کرتے تھے۔ اور ایک لڑکی کے دھوکے نے کیسے ان کی زندگی کا دھارا بدل دیا تھا۔ نغمہ باجی کو اس نے اکثر امی کے سامنے سیف کے سخت رویے کا رونا روتے دیکھا تھا۔۔ جس سے نازنین کے ذہن میں وہ ایک کھردرے، سخت گیر جذبات سے عاری شخص کے طور پر اُبھرتے تھے۔ تو کہیں نہ کہیں شاید باجی کو بھی ان کی نفسیات سمجھنے کی ضرورت تھی۔ وہ کمرے سے نکلتی نغمہ کو دیکھ کر کچھ سوچنے لگی۔

☆☆☆

بڑی دیر تک وہ سامنے کھلے نمبر کو گھورتی رہی۔ پھر موبائل اٹھا کر ہاتھ میں لیا۔ نمبر پہ انگلی رکھی لیکن پُش کرنے کی ہمت نہیں ہوئی تو ہٹا دی۔ اسے واپس گئے آج کافی دن ہوگئے تھے۔ اب تو بلکہ اگلا ویک اینڈ بھی نزدیک تھا۔ اس مرتبہ اس نے ہفتہ کی شام کو آنا تھا۔ یعنی یہاں بس ایک اتوار کا دن اور پیر کو واپسی۔ چلو خیر، یہ تو اس کی نوکری کی مجبوریاں ہیں۔ پر اتنے دن ہوجانے پر کوئی رابطہ نہ کرنا، جبکہ اب تو نمبر بھی اس کے پاس آچکا تھا۔

رہاب کا وہمی دل اب سے پہلے تو دُوری کے دنوں میں کبھی بدگمان نہیں ہوا لیکن رابطوں کی بحالی پر بھی رابطہ نہ کرنا شاید یونہی دلوں میں گرہیں ڈالنے لگتا ہے۔ شام کو گھر لوٹ کر کیا اس کا دل نہیں چاہتا مجھ سے بات کرنے کو، کہتا تھا شام کو سخت بوریت ہوتی ہے، کرنے کو کچھ نہیں ہوتا۔

"بس بور ہوتے رہنا۔ مجھے کال مت کرنا۔"
وہ تو پیر کے دن سے ہی اس کے آفس وقت کے بعد والے ٹائم میں اپنا موبائل استعمال ہی نہ کرتی کہ کہیں اس کی کال آئے اور نمبر نہ بزی ہو۔ پر اسے تو کال یا میسج کی فرصت ہی نہ تھی۔

"میسج۔" رباب کا دھیان تو بے خیالی میں اُس طرف گیا لیکن دوسری مرتبہ اس نے رُک کر سوچا تھا اور پھر فوراً ہی عمل کرتے ہوئے موبائل اُٹھالیا۔

انگلیوں کی پوروں پر
رابطے میسر ہیں
پھر بھی گر یہ دُوری ہے
تو جاننا ضروری ہے
کہ فاصلے زماں کے ہیں
یا دِلوں میں دُوری ہے

دھڑکتے دل کے ساتھ اُس نے میسج بھیج بھی دیا۔ سہ پہر کے چار بجے تھے۔ آفس سے تو دو بجے تک وہ آجاتا تھا۔ اس وقت معلوم نہیں سو رہا تھا یا کہیں بزی۔ وہ انگلیاں چٹخاتے بے چینی سے جواب کی منتظر تھی۔

"ہائے کہیں برا نہ منائے۔ غصہ بھی کر سکتا ہے اور..... اور کہیں غصے سے جواب ہی نہ دے تو۔" وہم اور خدشات اب رسک اٹھا لینے کے بعد اسے کہاں سے کہاں لیے جا رہے تھے جب میسج کی بپ پر وہ حقیقتاً اُچھل کر کھڑی ہوئی تھی۔ جواب نصیر کی طرف سے ہی آیا تھا جسے پڑھنے کی اب اس میں ہمت نہ تھی۔ بڑی مشکل سے اوپن کا بٹن دبایا۔

"مغز اٹوٹل خراب دے۔" (تمہارا دماغ مکمل خراب ہے)۔

"ہا....." رباب کی آنکھیں اور منہ ایک ساتھ کھلے، ایسا پتھر مار جواب، کھلی آنکھوں میں ڈھیر سارا پانی جمع ہوتے گالوں پہ لڑھک آیا، دل بری طرح ٹوٹا، بے یقینی الگ تھی۔ لفظوں کے بے رحم تیر نصیر نے کس آسانی سے چلا دیے تھے۔ وہ کیا اس جیسی پتھر تھی۔ دکھ، افسوس، میسج بھیجنے کا پچھتاوا اسے مسلسل رلائے جا رہا تھا۔ اوپر سے اماں لگاتار آوازیں دیے جا رہی تھی۔ وہ دوپٹے سے آنکھیں اور چہرا رگڑتے باہر آگئی۔ دوپہر ڈھلنے پر دادی باہر برآمدے میں لیٹا کرتیں۔ گرمی بھی پچھلے تین دنوں سے کچھ زیادہ ہوگئی تھی۔ برآمدے میں پنکھا لگا کر اس نے دادی کے لیے چارپائی کھینچی، انہیں لا کر بٹھانے کے دوران بھی غائب دماغ اور چپ چپ ہی رہی۔ اماں نے چائے بنانے کا کہا تو خاموشی سے کچن میں آگئی۔ مجھے دل سے کام کرتے بھی دل اسی بے مہر میں اٹکا رہا۔

"موبائل فون اماں کو دے دیتی ہوں، اُس سے اب کوئی رابطہ نہیں کرنا، جب فون ہی پاس نہیں ہوگا تو بے چینی بھی نہیں رہے گی۔ کتنی اچھی زندگی تھی اس موبائل سے پہلے۔ اپنے آپ میں مگن بس خود کو خوش رکھتی تھی۔۔ وہ بھی دھوکا تھا شاید۔ خوش فہمیوں میں جی رہی تھی۔ دوری اور فاصلوں کی قدر و قیمت تھی جو وہ آکر چند میٹھے بول کہہ جاتا تھا۔ حقیقت تو بس اتنی ہے کہ....." اس نے کھولتی چائے کا چولہا بند کیا۔ "کہ اس تعلق میں نصیر کی طرف سے کچھ بھی نہیں..... اور میں.....؟"

"ہاں میرا تو ٹوٹل دماغ خراب ہے۔" وہ چائے پیالیوں میں ڈال کر باہر لائی۔ اماں کے سامنے ٹرے رکھی اور خود اندر موبائل لینے چلی گئی۔ اس فساد کی جڑ کو اب اماں کے پاس رکھنا تھا۔ موبائل اس نے ہاتھ میں لیا تو اسکرین آن ہوگئی۔ ایک میسج آیا ہوا تھا۔ اس نے بھنویں سکیڑ کر نام دیکھا پھر میسج کھولا۔

بارش کی برستی بوندوں نے
جب دستک دی دروازے پر
محسوس ہوا تم آئے ہو
انداز تمہارے جیسا تھا
اور میں نے گرتی بوندوں کو
جب روکنا چاہا ہاتھوں پر
اک سرد سا پھر احساس ہوا

وہ لمس تمہارے جیسا تھا
تنہا میں چلا پھر بارش میں
تب اک جھونکے نے ساتھ دیا
میں سمجھا تم ہو ساتھ میرے
وہ ساتھ تمہارے جیسا تھا۔

وہ پڑھتے پڑھتے رودی اور روتے روتے ہنس پڑی۔ آخری لائن آنکھوں کے سامنے تھی جب نصیر کی کال آنے لگی۔ رباب نے آن کر کے موبائل کان سے لگایا

''ہیلو۔'' وہ جیسے تصدیق چاہ رہا تھا۔

''ہوں۔'' رباب کے رندھے گلے سے اتنا ہی نکل پایا۔

''آئندہ مجھے نیند سے جگایا ناں تو مار بھی کھاؤ گی۔'' وہ ہنس رہا تھا۔

''نیند ہے کہ نشہ۔'' وہ غصہ کھا گئی۔

'' نشہ کہاں کم بخت۔ تھکا ڈالا اِن دوروں نے۔''

''تمہیں دورے پڑتے ہیں۔'' رباب کی حیرت سے آنکھیں کھلیں اور نصیر کا بے ساختہ قہقہہ۔

''اگر تم سچ مچ کی احمق نہ ہوتیں نا تو قسم سے میں اسے تمہارا مذاق اور حاضر جوابی سمجھتا۔''

''مطلب؟'' رباب کا لہجہ ابھی بھی خفا خفا تھا۔

''اوئے پاگلے مانیٹرنگ کے لیے جانا پڑتا ہے۔ پہاڑ پر اسکول تھا، چڑھتے چڑھتے دماغ گھوم گیا۔'' نصیر ہنس کر وضاحت دینے لگا۔ نصیر ایجوکیشن آفس میں تھا۔ کام کی نوعیت کچھ اس قسم کی تھی۔ رباب کو کہاں اتنا پتا تھا۔ اس کے کام کے موضوع پر کبھی بات ہی نہیں ہوئی تھی۔

''تو سوئے رہتے ایسا سڑا ہوا جواب لکھنے کی کیا ضرورت تھی۔'' وہ ابھی تک اس پہلے میسج پہ خفا تھی۔

'' اچھا کیوں۔ تم مجھے تنگ کرو اور میں نہ کروں۔'' وہ نیند پوری کر لینے کے بعد واقعی اب ہشاش بشاش تھا۔

''ہاں کرلو جی بھر کے تنگ۔ پہلا اور آخری میسج تھا۔''

''واہ۔ پہلا اور آخری۔'' اس نے مضحکہ اڑایا۔ ''تیرا یہ خالی مغز کالیں کر کر کے پکا نہیں دوں گا۔'' وہ مسلسل ہنس رہا تھا۔

''ہاں جیسے پچھلے چار پانچ دنوں میں پکایا ہے ناں۔'' رباب کے شکوے کہاں ختم ہو رہے تھے۔

''یارا میں تو تمہارے رابطے کے انتظار میں تھا۔''

''اچھا۔'' وہ جیسے سوچ میں پڑ گئی۔ دل کچھ کچھ راضی ہونے لگا۔ ''آنا کب ہے؟''

''پرسوں ان شاء اللہ۔''

''شبنم باجی کی شادی کے لیے چھٹی لو گے ناں؟''

''شادی.....'' نصیر نے آنکھیں چھوٹی کر کے کچھ دیر سوچا۔ ''ہاں چھٹی تو لینی پڑے گی۔ چلو دیکھتے ہیں۔ ابھی تو کچھ دن پڑے ہیں۔''

گِلے شکوے تو دو میٹھے بولوں میں ہی مِٹ جایا کرتے ہیں۔ دونوں اب اردگرد سے بے نیاز دنیا جہاں کی باتوں مگن تھے۔

☆☆☆

نازنین کا دل نجانے کیوں بابا کے خیال، ان کے ذکر سے لرزنے سا لگتا۔ وہ کسی کا جگ اور تین گلاس ٹرے میں اٹھائے نغمہ کے کمرے میں داخل ہوئی تو وہ موبائل کانوں سے لگائے اس کے سامان کے متعلق بات کرتی نظر آئی۔ دوپہر کا کھانا وہ تینوں نغمہ کے کمرے میں کھایا کرتیں۔ پشمینہ بھی پیچھے پیچھے سالن روٹیاں لے کر آ گئی۔ نغمہ نے نیچے قالین پر دستر خوان بچھایا۔

''تمہارا چہرا کیوں ہلدی ہو جاتا ہے پاگل۔'' نغمہ لاپروائی سے ہنس رہی تھی۔ ''بیٹھو بتاتی ہوں۔''

وہ معیزہ کو گود میں لیے آلتی پالتی مار کر نیچے بیٹھ چکی تھی۔

''وہ تم بات کر رہی تھیں میرے سامان کی۔'' نازنین نے ظاہر نہیں ہونے دیا لیکن اس کے دل کی

دھڑکن ابھی تک بے قابو تھی۔

''ابھی میں خالہ سے بات کر رہی تھی۔ بابا سے تو رات ہی بات ہوگئی تھی۔ وہ خود بھی تمہارے سامان کی وجہ سے پریشان تھے۔ میں نے اُن سے کہا کہ نازنین کی کتابیں، کپڑے اور چھوٹا موٹا باقی سب سامان خالہ حبیبہ کے ہاں پہنچا دیں۔ اُن سے میں منگوالوں گی۔''

''تو پھر؟''

''ہاں وہ مان گئے۔ اور ابھی اسی سلسلے میں خالہ سے میری بات ہوئی۔ بابا نے کہا تھا کہ آج شام تک سامان خالہ کے گھر بھجوا دیں گے۔ میں خالہ سے کہہ رہی تھی کہ سامان آجائے تو عرفان اللہ کے ہاتھ کل صبح واسع کی رہائش گاہ پر پہنچا دیں۔ وہ بھی کل شام واپس آرہا ہے تو لیتا آئے گا۔''

''واہ واہ میری جینیس بھابی۔ کیا زبردست پلاننگ کی ہے۔'' پشمینہ تو ہاتھ اٹھا اٹھا کر داد دینے لگی۔ نازنین ہنسی اور نغمہ نے فرضی کالر کھڑے کیے۔

''کل رات تک تمہارا سارا سامان تمہارے پاس ہوگا۔''

''شکر ہے اللہ کا۔'' وہ بے یقین سی تھی۔ باجی نے تو سچ مچ چکیوں میں کام کر دکھایا تھا۔ ہاں البتہ واسع کے نام پر اندر کہیں خوش گوار سا جھونکا چھو کر گزرا تھا۔ وہ حیران ہوئی پر اک ذرا لمحے بھر کو، پھر خود ہی دھیان بدل دیا۔

دوپہر کو وہ باجی کے کمرے میں ہوتی تھی۔ سیف لالہ کا کھانا ڈیرے پر جایا کرتا۔ آج تو عبدالرحمن چاچا بھی صبح سے ڈیرے پر تھے۔ اس لیے کھانے کے بعد پشمینہ اپنی اماں کے کمرے میں چلی گئی۔ منزہ اس کی گود میں سر رکھے سو گئی تھی۔ اس کا نیا نیا اسکول میں داخلہ ہوا تھا۔ تھکی ہاری آتی اور کھانا کھاتے ہی سو جاتی۔ معیزہ بھی باجی کی گود میں اونگھ رہی تھی۔

''تم بھی لیٹ جاؤ نازنین، بیٹھی ہی رہو گی کیا۔''

''لیٹ جاؤں تو نیند آنے لگتی ہے۔''

''ارے تو کیا کرنا ہے جاگ کر۔ دوپہر کو کچھ دیر آرام بھی ضروری ہے۔''

''کتابیں آجائیں تو دوپہر کو پڑھا کروں گی، اس لیے نہیں چاہتی کہ نیند کی عادت بنے۔'' وہ بیڈ کی بیک سے ٹیک لگا کر بیٹھی تھی۔

''تمہارے پیپرز تو کوئٹہ میں ہوں گے ناں؟'' نغمہ کو کچھ خیال آیا۔

''جی۔ داخلہ تو ہو چکا ہے۔ ادھر ہی سینٹر آئے گا۔'' نازنین بھی جیسے پہلی مرتبہ سوچ میں پڑی۔

''اچھا کوئی بات نہیں۔ سیف سے کہوں گی لے جائے گا۔ خالہ کے پاس رہ لینا جتنے دن ایگزامز چلیں۔ اب تو ان کے ہاں جانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔''

''جی۔'' نازنین نے مختصر جواب دیتے کچھ دیر سوچا پھر سر اٹھا کر نغمہ کو دیکھا۔ ''سیف لالہ نے اس سارے معاملے پر کچھ کہا تھا باجی؟''

نازنین کے اندر بہت دنوں سے جو ایک سوال رکا تھا بالآخر لبوں پر آ ہی گیا کہ سیف لالہ شاید اس کی آمد پر خوش نہیں ہیں۔

''نہ کنہ۔ اس نے کیا کہنا ہے۔ اپنی دنیا میں مگن رہتا ہے۔ میرے کسی معاملے سے خاک اسے کچھ دلچسپی ہوتی ہے۔''

''میرا مطلب ہے وہ اس بات سے خفا تو نہیں تھے کہ نازنین نے اپنے بابا کے فیصلے سے بغاوت کی، پھر اس طرح چوری چھپے یہاں آنا۔''

''کیوں بلاوجہ کے وہم کرتی ہو ناز۔ تم اسے بہنوں کی طرح پیاری ہو، تمہاری زندگی تباہ ہونے سے بچ گئی تو وہ اس بات سے ناراض کیوں ہوگا۔ مجھ پہ اگر وہ غصہ کرتا ہے تو اسے اپنی وجہ مت سمجھا کرو۔'' نغمہ کہتے کہتے ہنس بھی پڑی، نازنین کے سوالوں کی وجہ کچھ کچھ اس کی سمجھ میں آگئی تھی۔ نازنین بھی مسکرا دی۔

''میرے ساتھ وہ ایسا ہی میٹھا بولتا ہے۔ غم نہ

کیا کر۔"

"خفا نہ ہونا لیکن اس میں بھی کچھ قصور تمہارا ہے۔" نازنین نے مسکرا کر ہلکے سے جتایا، جو کچھ اسے پشمینہ سے پتا چلا تھا، اس میں بہت سی باتیں اس کے لیے نئی تھیں جن پر وہ کافی زیادہ سوچتی رہی تھی تب ہی اظہار کیے بنا رہ نہ سکی۔

"لالہ دل کے بہت اچھے ہیں باجی، بس حالات نے انہیں سخت بنا دیا ہے۔"

"یوں کہو، مجھے شکار ہونا تھا حالات کی سختی کا۔" نغمہ نے اُکتا کر ہاتھ لہرایا۔

"تمہیں ایسا کیوں لگتا ہے؟" نازنین نے سوال تو عام انداز میں کیا لیکن دراصل وہ اس موضوع پر باجی کو بولنے پر اکسانا چاہتی تھی۔

"تو اور کیا کہوں۔" وہ مغموم ہوئی۔ سینے سے بے ساختہ ایک ٹھنڈی آہ نکل گئی۔ "سیف کو اس کی منگیتر شادی سے کچھ دن پہلے چھوڑ کر بھاگ گئی تو اس نے بھی ضد بنا لی کہ اس بھاگنے والی کو ایک ماہ کے اندر اندر نکاح کر کے بتا دوں گا کہ ایسا گیا گزرا تو میں بھی نہیں۔"

"ایسا آپ سے سیف لالہ نے کہا؟"

"کہا تو نہیں لیکن ظاہر ہے ارادہ تو یہی تھا۔ تمہیں نہیں پتا نازنین! یہاں بات مرد کی غیرت اس کی ناک کی آجاتی ہے۔ میں اس کے لیے ایک جیتی جاگتی احساسات رکھنے والی انسان تھوڑی تھی۔ بس دنیا دکھاوے کے لیے "بیوی" نام کی خانہ پُری تھی۔" نغمہ کے لیے یہ اس کی زندگی کا سب سے حساس موضوع تھا، بات چل نکلی تو وہ بھڑاس نکالے بنا رہ نہ سکی۔

"مانتی ہوں تمہارا دل دُکھا ہوگا۔" نازنین نے باجی کے ہاتھ پہ ہاتھ رکھا۔ "لیکن تم اس بات کو تھوڑا سا نیگیٹو لے رہی ہو، اجازت دو تو میں کچھ کہوں؟"

نازنین کو لگا جو کچھ اس نے محسوس کیا اسے باجی سے شیئر کر لینے میں کوئی حرج نہیں، شاید اس سے بگڑی بات بنتی ہو، نغمہ نے ہولے سے سر اثبات میں ہلایا

"سب سے پہلی بات تو یہ کہ تم اس سارے معاملے کو جتنا زیادہ گہرائی میں لوگی، اتنا اپنے لیے مشکلات کھڑی کرو گی۔ بجائے اس کے اپنی لائف کا آغاز یہاں سے کرو کہ ہر شخص کا ایک ماضی ہوتا ہے اور ہماری آمد سے پہلے وہ "کچھ" بھی ہو سکتا ہے۔ بدلنا تو اسے ہمارے آنے کے بعد ہے۔"

"ہاں تو کہاں بدلا کچھ میرے آنے کے بعد۔" وہ پھر بجلت تلخ ہوئی۔ "پہلی رات بیوی کو اپنے عشق کی داستان سنانے بیٹھ جاؤ گے تو خاک کچھ بدلے گا۔"

"یہ بھی کوئی اتنی بڑی بات نہیں ہے۔" نازنین اب بھی نارمل اور سپاٹ لہجے میں مخاطب تھی۔ "ہمارا جوابی ردعمل ہی دراصل کسی بات کو بڑھاوا دینے یا اس کے اثر کو کم کرنے کا باعث بنتا ہے۔"

وہ آج اگر کسی بات پر حیران بھی ہوتی تو کم از کم اسے باجی پر ہرگز ظاہر نہ کرتی کیونکہ وہ اس کا حقیقی بھلا کرنے کی نیت سے بات چھیڑے بیٹھی تھی اس کے آج تک کے رویے پر اس کی حوصلہ افزائی کرنے نہیں۔

"جو باتیں لالہ کسی سے نہیں کر سکتے تھے، وہ انہوں نے تم سے کیں۔ اب دل کی بات بندہ اپنے دوست سے ہی کرتا ہے، دشمن سے تو نہیں۔"

"واہ۔ کیا بات ہے۔" نازنین کا سیف کی طرف داری کرنا نغمہ کو مزید کھولا گیا۔ "پہلی رات ایک دلہن کی اپنے پارٹنر سے کیا توقعات ہوتی ہیں۔ کیا کیا خواب سجائے ہوتے ہیں۔ وہ کیا ایسی باتیں سننے کے لیے روتی دھوتی میکہ چھوڑ کر آتی ہے۔ اب کوئی پوچھے کہ جس کی خاطر جوگ لے رکھا ہے، وہ تو اِسے پوچھتی بھی نہیں تھی۔ ہونہہ۔ گھر سے بھاگی ہوئی بری لڑکی کی وجہ سے گھر بیٹھی شریف لڑکی کی زندگی خراب کر دی۔"

"تم ایسے طعنے لالہ کو بھی سنا دیتی ہو گی؟" نازنین نے اسے تحمل سے سن کر بغور اس کا چہرہ

دیکھا۔ دل تاسف سے بھر گیا۔ بہن کی نادانی پر لب بھینچے وہ بس مناسب الفاظ ہی تلاش کر رہی تھی۔

''ہاں تو اور.....'' نغمہ نے تنک کر منہ بگاڑا۔ ''اتنا بھی احساس نہ دلاؤں۔ یہ بھی نہ کہوں کہ.....''

''نہیں۔'' نازنین نے زور دے کر اس کی بات کاٹی ''نہیں کہنا چاہیے۔ برا مت ماننا باجی! لیکن یہ تمہارا رویہ ہی ہے جس نے اب تک کے وقت میں کچھ بھی ٹھیک نہیں ہونے دیا۔

جس آدمی نے پہلی رات تم پہ بھروسا کر کے اپنا دل تمہارے سامنے کھولا، آج اتنا وقت ساتھ گزر جانے پر وہ تم سے سیدھے منہ بات بھی نہیں کرتا تو قصور اس کا نہیں، تمہارا نکلتا ہے۔ وہ تو تمہارے قریب آ رہا تھا اور تم نے اپنے رویے سے اسے خود ہی اپنے سے دور کر دیا۔ دنیا کے جن طعنوں سے بچنے اور مردانگی پر چوٹ لگنے کے جس خوف سے اس نے جلد از جلد شادی کی، تم نے یہ کہہ کر کہ وہ تو تمہیں کچھ سمجھتی ہی نہیں، یا تمہیں دھتکار گئی وغیرہ۔ اس چوٹ کو ہمیشہ تازہ ہی رکھا۔ لوگ تو شادی ہوتے ہی چپ بھی ہو گئے ہوں گے لیکن تم نے لالہ کے لیے اپنے گھر بلکہ اپنے کمرے میں محاذ کھول دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بے چارے ایک مرتبہ پھر اپنے خول میں سمٹ گئے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ تم نرمی، محبت اور پیار سے ایک بکھرے ہوئے شخص کو سمیٹ لیتیں۔ اسے یقین دلاتیں کہ نگینہ نے جس ہیرے کو ٹھکرا دیا اس کی قدر صرف تم نے کی ہے۔ اگر تم چپ چاپ اس کی کہانی سن لیتیں تو زیادہ سے زیادہ ہفتہ دس دن وہ اپنا دل ہلکا کرتے، لیکن تم نے پہلے دن سے ہی اپنی جان جلانا شروع کر دی، اگر وہ وقت تم لالہ سے دوستی کرنے اور انہیں قریب لانے میں صرف کرتیں تو وہ کب کا پرانی باتیں بھول چکے ہوتے۔ تم آج تک اس خلا کو بھر ہی نہیں پائیں جو نگینہ کے جانے سے پیدا ہوا۔''

''تو میں نے کیا کوشش نہیں کی ہوگی۔'' نغمہ کا جوش نازنین کی باتوں نے واقعی ٹھنڈا کر دیا تھا۔ آخر میں بجھا بجھا یہ اقرار ظاہر کرتا تھا کہ جو کوشش نغمہ نے اب تک کی وہ حالات کو سدھارنے کے بجائے صرف بگاڑ پیدا کر سکی تھی۔ نازنین نے بہن کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں نرمی سے دبایا، نغمہ انتہا کی جذباتی اور جوشیلی تھی۔ کچھ دیر پہلے کسی اور دھارے پر بہہ رہی تھی اور اب اچانک خود کو مکمل ذمہ دار سمجھنے لگی تو نازنین کو لگا شاید وہ زیادہ سخت بول گئی جبکہ اعتدال کی راہ اپنائے بنا سیدھا چلنا محال ہے۔

''دیکھو، شوہر سے متعلق ایسی تلخ حقیقت جان کر جلنا کڑھنا اور انتہا کا حسد محسوس کرنا شاید ایک فطری سی بات ہے، میرے خیال سے یہاں تم دوسری بیویوں سے الگ نہیں تھیں۔ لیکن جیسا ہم اندر ہی اندر محسوس کرتے ہیں ویسا ہی ظاہر کرنا تو ضروری نہیں۔ لالہ کو اپنا دکھڑا رونے کے لیے ایک کندھے کی ضرورت تھی پر تم آگے سے بری طرح بپھر گئیں، جبکہ اس کی وہ توقع نہیں کر رہے تھے۔ ٹھیک ہے کہ وہ بھی غلط تھے اس وقت، وہ اس وقت تمہارے جذبات کو نہیں سمجھ رہے تھے۔ لیکن اگر تم صبر اور حوصلے سے کچھ عرصہ ویسی بن کر رہتیں جیسا وہ چاہ رہے تھے تو یقین مانو، اب وہ تمہارے ممنون ہوتے اور ان کی بے حسی بھی کب کی احساس اور توجہ میں تبدیل ہو چکی ہوتی۔''

''پر اب کیا ہو سکتا ہے۔'' نغمہ کو یہ سمجھنے میں اگرچہ تھوڑا وقت لگا کہ کہیں نہ کہیں وہ بھی غلط تھی لیکن یہ سمجھنا اور بھی مشکل تھا کہ بگڑ چکے کو وہ سدھار بھی سکتی ہے یا نہیں۔ اس کے خیال میں سب ہاتھ سے گیا۔

''تو یہ ہے باجی، پانچ چھ سال کی مدت کو ازدواجی زندگی کا آغاز سمجھا جاتا ہے، کون سا زندگی بیت گئی ہے۔ تم چاہو تو ابھی بھی خود میں بہتر تبدیلی لا سکتی ہو۔ نگینہ کے حوالے سے غلط زبان استعمال کرنا اب بھی ترک کر سکتی ہو، آپس کے تعلق کو مضبوط بنانے کے لیے غیر محسوس انداز میں یک طرفہ کوشش کر سکتی ہو، ہاں لیکن اپنے آپ سے اس وعدے کے ساتھ کہ نہ تھکو گی اور نہ پیچھے ہٹو گی۔''

''تو تمہیں کیا لگتا ہے، میری اکیلے کی کوشش کوئی رنگ لائے گی؟'' نغمہ دل سے چاہ رہی تھی کہ حالات کا موجودہ رخ تبدیل ہوجائے لیکن بے یقین تھی۔

''ان شاء اللہ۔'' نازنین نرم سا مسکرائی۔ ''اور تم اکیلی نہیں ہو، اللہ کی مدد کا یقین رکھو، اپنے شوہر کی محبت اس کی توجہ اور اس کا وقت چاہنے والی وفادار شریف بیوی کی کسی بھی کوشش کو اللہ پاک رائیگاں کیسے جانے دے سکتا ہے۔''

''تو مجھے کرنا کیا ہوگا۔'' نغمہ نے کچھ نروس ہوکر بہن کو دیکھا۔ نازنین اس سے چھوٹی تھی لیکن انسان کی سمجھ، اس کی تعلیم کا قد، اس کی عمر سے بڑا ہوجاتا ہے۔ نغمہ کو اپنی نادانیاں، اپنی کم عقلی کا واضح ثبوت نظر آنے لگیں۔

''تمہیں کیا لگتا ہے، اب تمہیں کیا کرنا ہوگا؟'' نازنین نے اسی سے جان لینا چاہا۔

''مجھے کچھ عقل سمجھ ہوتی تو آج ایسی زندگی ہوتی میری۔ تم جتنی پڑھی لکھی نہیں ہوں نا، اس لیے حیران ہوکر تمہاری باتیں سن اور سمجھ رہی ہوں۔''

''کتابیں شعور دیتی ہیں، تجربہ نہیں۔ تم نے اپنی زندگی کس ڈھب سے جینی ہے یہ صرف تمہاری راہ کی ٹھوکریں تمہیں سمجھائیں گی۔ میں نے آج جو کچھ بھی تمہیں سمجھایا کسی کتاب سے دیکھ کر نہیں بلکہ امی کی زندگی دیکھ کر سیکھا اور سمجھا۔ انہوں نے صرف خاموشی اختیار کی، اور ہمیشہ صبر کو اوڑھا اور پہنا۔ ملا اس دنیا میں کچھ بھی نہیں لیکن بندے کا انجام اس دنیا سے جڑا بھی کب ہے، وہ جہاں ہیں، بہت مطمئن بہت پرسکون اور سرخرو ہیں۔''

''ہاں نازی۔ امی وہاں بہت آرام سے ہیں۔ میں نے انہیں کبھی خواب میں آزردہ اور بے چین نہیں دیکھا۔''

نغمہ کی پلکیں ماں کو یاد کرکے نم ہوگئیں۔ نازنین کا دل بھی بھر آیا، ہفتوں اور مہینوں کی گھٹن نے باہر نکلنے کا راستہ ڈھونڈا۔ وہ تو کب سے اس انتظار میں تھی کہ باجی اس کے قریب ہوں اور وہ امی کو یاد کرکے بس روتی چلی جائے، دل بے اختیار ہی بہت اُداس ہوگیا۔ نغمہ نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھا اور وہ روتے ہوئے بہن کے گلے لگ گئی۔ بہت دیر تک کھل کر رو لینے کے بعد امی کی یاد سکون بن کر اندر اُتری۔ اس نے مسکراتے ہوئے اپنی اور باجی کی آنکھیں صاف کیں۔

''اب وعدہ کرو کہ اپنی زندگی میں بہتری تم خود لاؤ گی۔''

''وعدہ تو کرتی ہوں لیکن کروں کیا؟'' نغمہ بے بسی سے اس کی صورت دیکھ رہی تھی۔

''سب سے پہلے تو اپنے یہ جوابی وار بند کرو، ہر بات کا جواب دینا ضروری نہیں ہوتا۔ مرد کے غصے کو خاموشی سے پینا بھی خدمت ہے، تُو تکار سے اجتناب کرو اور اس کے غصے کو اپنی مسکراہٹ سے زائل کرو، سختی کا جو خول بحث و تکرار سے نہیں ٹوٹا وہ نرمی اور محبت سے ضرور پگھلے گا۔''

''ہا۔ اللہ کرے ایسا ہو۔'' نغمہ کی پلکیں بھیگنے لگیں۔ ''اور اگر ایسا ہوا ناں نازی، تو تمہارے یہاں آنے کو میں اپنے لیے نعمت تصور کروں گی۔''

''اچھا۔ تو ویسے نہیں کرو گی۔'' نازنین شوخ ہوئی اور نغمہ نے اس کو چپت رسید کی۔

''تیرے آنے سے تو سب شکر کرتے نظر آتے ہیں۔ پشمینہ کو دوست مل گئی ہے، منزہ کو ٹیچر، مجھے اور خالہ شمیم کو ہیلپر، تیرا آنا یہاں ہر کسی کے لیے نیک شگون ثابت ہوگا دیکھنا۔'' نغمہ دعا دیتی اُٹھ گئی اور نازنین کو معلوم نہیں کیوں ''ہر کسی'' کہنے پر بس ایک ہی بندہ تصور میں آیا اور لب بے ساختہ مسکرا دیے۔

☆☆☆

''مینے پھوپھو، نازی خالہ۔ باہر موسم دیکھا؟'' منزہ آنکھوں میں خوشی اور حیرت لیے کمرے میں آئی۔ وہ دونوں ٹی وی پر ایک ڈراما دیکھنے کے بعد اب تبصرہ کر رہی تھیں۔ منزہ کی بات سن کر ماحول پہ دھیان دیا۔ واقعی دوپہر ڈھلنے پر اتنا اندھیرا تو کبھی

نہیں ہوتا۔ دونوں ہی اپنے اپنے دوپٹے سنبھالتی باہر نکلیں۔ گزرے چار پانچ دنوں کی چبھن بھری دھوپ اور متواتر گرمی کے بعد آج کی ایسی سہانی شام۔ نازنین کا منہ حیرت سے کھلا۔ ڈوبتے سورج کی لالی نے گہرے کالے اور سرمئی بادلوں میں شامل ہوکر اسے عجیب سا جامنی میرون رنگ اوڑھا دیا تھا۔ ایسی رنگ بھری ٹھنڈی سی شام۔ ہوا کے خوش گوار جھونکے نے طبیعت مزید شاداب کردی۔

''واہ باہر تو مارچ کی کھڑکی کھلی ہے۔''

''اُٹھ گئیں دونوں۔ میں ابھی جگانے آنے والی تھی۔'' شمیم خالہ چولہے کے پاس بیٹھی اللہ جانے کیا بنا رہی تھیں۔ بھنی سوجی کی خوشبو آ رہی تھی۔

''ارے میری ماں۔ ہم سو کہاں رہی تھیں۔ ذرا مادیکھ رہی تھیں۔''

''یہ دیکھو۔'' شمیم جان نے ماتھے پہ ہاتھ مارا۔ ''مجھے معلوم ہوتا تو پہلے آواز دے لیتی۔ ایسا پیارا موسم دیکھ کر کتنی دیر سے تم دونوں کو یاد کر رہی ہوں۔''

''اور بنا کیا رہی ہیں؟'' پشمینہ نے کڑاہی میں جھانکا۔

''سوجی کی مٹھائی بنائی ہے۔ ذرا سی ٹھنڈی ہوجائے تو ٹکڑے کاٹوں گی۔'' وہ گرم گرم مٹھائی کو ٹرے میں پھیلانے لگیں۔ اب ٹھنڈا ہونے پر ایک جیسے حصے بنانا آسان تھا۔

''اب جلدی کرو، چائے بناؤ۔'' وہ اپنی جگہ سے اٹھیں تو پشمینہ سے پہلے نازنین نے جگہ سنبھال لی۔

''چائے میں بناتی ہوں۔ تم اس گرم ٹرے کو کسی اونچی جگہ پہ رکھ دو۔''

''میرے پاس کمرے میں ہی لے آؤ۔ چھری اور پلیٹیں بھی لے آنا۔ چائے پی کر دادی اور جمیلہ چاچی کا حصہ بھی دے آنا۔'' وہ کمر پکڑے ہدایات دیتی اندر چلی گئیں۔

''جلدی چائے بناؤ، کہیں بارش نہ شروع ہوجائے۔ ہمیں تو آج رباب سے کڑھائی بھی سیکھنی ہے نا۔'' پشمینہ کی نظریں آسمان پر ٹکی تھیں۔ پچھلی شام ان دونوں نے چھت پر رباب سے خوب گپ شپ کی تھی اور اسی میں طے پایا تھا کہ کل سے وہ دونوں اس سے لاس کار (ہاتھ کا کام) سیکھیں گی۔ وہ آج کل شبنم کے جہیز کی ایک چادر بنا رہی تھی۔ نازنین تو اس کے ہاتھ کی مہارت دیکھ کر حیران تھی۔ سلائی کڑھائی تو اسے ہمیشہ ہی بہت مشکل کام لگا تھا لیکن رباب نے کیا نفاست سے اپنی قمیص بنائی تھی۔

چائے پی کر مٹھائی کی پلیٹ لیے وہ دونوں چھوٹے دروازے سے رباب وغیرہ کے گھر میں داخل ہوئیں۔ شام ہونے میں تو ابھی بہت ٹائم باقی تھا لیکن بادلوں نے ماحول کو اندھیرا سا کر رکھا تھا۔ بارش ابھی نہیں برسی تھی۔ بادل تھے کہ اُمڈے چلے آ رہے تھے۔ آسمان پر کالے اور سرمئی بادلوں کی جیسے تہیں جمع ہو رہی تھیں۔ نازنین نے گردن اُٹھا کر ایک نظر اوپر دیکھتے قدم چاچا حبیب کے گھر کے پچھلے صحن میں رکھے۔ پشمینہ اس سے آگے چل رہی تھی۔ بیچوں بیچ پہنچے تو نازنین کی بے ساختہ نظر اس کمرے کی طرف گئی جہاں بس کے بعد واسع سے اس کی دوسری ملاقات ہوئی تھی۔ دروازہ کھلا تھا لیکن وہاں دکھائی کوئی نہیں دیا

شاید وہ کوئٹہ سے ابھی نہیں آیا تھا۔ بلاوجہ دل میں خیال سا گزرا۔ وہ جاتے ہوئے اسے اپنے دوبارہ آنے کا بتا گیا تھا شاید اسی وجہ سے اسے بھی پورا ہفتہ کچھ کچھ انتظار رہا تھا۔ وہ دل میں اسی کو سوچتے چند قدم اور آگے آئی، یک لخت دل کی دھڑکن بھاری ہوئی اور ایک احساس نے اسے دوبارہ گردن ادھر موڑنے پر مجبور کیا۔ دروازے سے کچھ چار فٹ آگے کمرے کی کھڑکی تھی اور اس وقت کھلی ہوئی بھی تھی۔ کھڑکی کی اندرونی طرف میز کے پیچھے کرسی پر آرام دہ انداز میں ٹیک لگائے وہ بیٹھا تھا۔ کہنی کرسی کے ہتھے پر جمائے اور انگلیاں لبوں پہ رکھے وہ دیکھ بھی اسی کو رہا تھا۔ نازنین سے نظر ملی تو اسی سکون سے مسکراتے ہوئے سلام کے انداز میں سر خم کیا۔

نازنین گھبرا کر سیدھی ہوئی، قدم لاشعوری طور پر شاید تیز ہوئے کہ سیدھی پشمینہ کی پشت میں جا لگی۔
''وش اللہ۔'' وہ منہ بگاڑ کر پلٹی لیکن بارش کے قطروں نے دونوں کی توجہ ایک ساتھ اپنی جانب مبذول کی۔ پشمینہ نے مسکرا کر آسمان کو دیکھا اور نازنین نے چور نظروں سے کھڑکی کی طرف۔ واسع نے ابرو اٹھا کر معنی خیزی سے بارش کی طرف اشارہ کیا۔ ٹھیک یہی خیال نازنین کو بھی آیا تھا کہ ان کی پہلی ملاقات بھی ایسی ہی ایک بارش بھری شام میں ہوئی تھی۔

وہ دونوں جب سامنے کے حصے میں آئیں بارش تیز ہو چکی تھی۔ دادی، جمیلہ چاچی اور رباب برآمدے میں بیٹھی موسم سے لطف اندوز ہو رہی تھیں۔

''السلام وعلیکم دادی۔'' پشمینہ نے سر جھکایا، نازنین بھی ملنے کے لیے آگے ہوئی۔ نازنین کو دیکھ کر دادی مسکراتے ہوئے اُٹھ بیٹھیں۔

''اے نازی راغلے دا (نازی آئی ہے)۔ سنگے بچہ (کیسی ہو)۔'' وہ اس کا چہرا ہاتھوں میں لیے محبت سے دیکھنے لگیں۔

''خیر دے دادی۔ آپ کیسی ہیں۔''

''اللہ کا شکر ہے گلی۔ آؤ میرے پاس بیٹھو۔'' انہوں نے آلتی پالتی مار کر بیٹھتے نازنین کا ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھایا، جب سے بہو شمیم جان نے انہیں نازنین پر گزرنے والے حالات سے آگاہ کیا تھا ان کا نرم دل بری طرح پسیج گیا تھا۔ انہیں اس بن ماں کی بچی سے دلی ہمدردی اور محبت محسوس ہونے لگی تھی۔

''تمہاری ماں مجھ سے بڑا پیار رکھتی تھی۔ جب بھی کوئٹہ سے آتی میرے لیے خاص طور پر کچھ لے آتی۔ بڑی ہنس مکھ تھی گل نسیمہ۔'' وہ اسے محبت سے دیکھتے اس میں ماں کی شبیہ ڈھونڈ رہی تھیں۔

''ارے جمیلے! وہ واسع کچھ کہہ رہا تھا ناں۔ نازنین کا نام لیا تھا اس نے۔'' دادی کو کچھ خیال آیا تو بہو کی طرف دیکھا اور نازنین کا یہ سن کر ہی دل ڈوب گیا کہ واسع نے اس کا نام لیا۔ وہ بھی سب کے بیچ۔ نازنین نے گھبرا کر تھوک نگلا، چور نظروں سے جمیلہ چاچی کی طرف دیکھا وہ اپنی ساس کی طرف متوجہ تھیں۔

''اے ہاں۔ وہ نازنین کا اٹیچی کیس آیا رکھا ہے۔ وہ اس کی تردر نے کوئٹہ سے بھیجا ہے ناں۔ وہی بتا رہا تھا واسع۔ باری سے کہوں گی نازنین! وہ دے جائے گا۔'' وہ بات کے دوران نازنین کی طرف مڑیں

''جی چاچی۔'' اس نے سعادت مندی سے سر ہلاتے ہوئے نظریں جھکائیں، بس اتنی سی بات تھی اور وہ گھبراہٹ میں نجانے کیا کچھ سوچ آئی۔ دل میں شکر ادا کیا اور جمیلہ نے اُن لمحوں میں پہلی مرتبہ بغور نازنین کو دیکھا۔ اس کے گلابی چہرے پر گھنی کالی بھنویں، کالی کالی بڑی اور گہری آنکھیں، خوبصورت ماتھے پر دائیں بائیں کالے بالوں کی لٹیں۔ پیاری سی ناک، مسکراتے حسین لب، لمبی گردن۔ وہ نجانے کس خیال کے تحت بڑی دیر کے ناقدانہ جائزے کے بعد بھی اس کے حسن میں کوئی کمی نہ نکال پائیں۔ اور آخر وہ اس میں کوئی خامی کیوں تلاش کر لینا چاہتی تھیں۔ سمجھنا مشکل نہیں تھا۔

پچھلے ہفتے واسع نے ان سے نازنین کا ذکر چھیڑتے ہوئے بطور خاص اس کے حالات سنے تھے۔ اور اس ہفتے وہ اس کا سامان بھی لایا تھا۔ واسع نے جب یہ کہا کہ یہ نازنین کا سامان ہے تو فوری طور پر جمیلہ نے اس بات کو بالکل ہی منفی رنگ میں لیا تھا۔ پل بھر کو ایسا ہی سمجھا کہ شاید واسع کا نازنین سے ڈائریکٹ کچھ رابطہ ہے تب ہی یہ سب ہوا، لیکن واسع نے اپنے اگلے ہی جملے میں ان کی سوچ کو یہ کہہ کر رد کر دیا کہ نغمہ باجی نے اسے کال کر کے درخواست کی تھی۔ اور نازنین کا سامان اس کا خالہ زاد خود اس کے ہاں چھوڑ گیا تھا۔

بات بے شک فوراً صاف ہو گئی تھی لیکن معلوم

نہیں کیوں جمیلہ کو اس سارے معاملے میں واسع کی بطور خاص کچھ دلچسپی ضرور محسوس ہوئی تھی۔ اولاد کا لہجہ، اس کے تاثرات ماں سے بہتر بھلا کون جان سکتا ہے اور اگر ایسا تھا تو جمیلہ کے لیے یہ سراسر خطرے کی گھنٹی تھی۔ بھلے واسع بھی ان کی اولاد تھا اور اس کی خوشی انہیں بہت عزیز تھی لیکن واسع کی خوشی رباب کی خوشی سے بڑھ کر نہیں تھی۔ رباب بیٹی تھی اور برسوں سے ایک آس پر تھی۔ واسع کی اس نئی دلچسپی کو رباب کی برسوں پرانی محبت پر کوئی فوقیت نہیں دی جا سکتی تھی۔ پہلے وہ نصیر کی ماں۔ وہی ایک کیا کم رکاوٹ تھی اس معاملے میں کہ اب بجائے حالات میں کسی سدھار کی امید لگانے کے یہ نئے نئے شوشے، واسع کو تو بہن کی خاطر ہر حال میں زمرد کو ہی اپنانا تھا، نازنین کے حسین چہرے کی چمک کو وہ اپنی بیٹی کے نصیبوں پر بجلی بن کے گرنے نہیں دے سکتی تھیں۔ کسی قیمت پر نہیں۔

"اے رباب، چائے بناؤ۔" راہداری کی طرف سے واسع کی آواز سنائی دی، نازنین نے بے ساختہ دوپٹہ درست کیا لیکن وہ شاید وہیں سے پلٹ گیا تھا سامنے آیا ہی نہیں۔ بارش اب رُک چکی تھی۔

"چائے کے ساتھ مٹھائی بھی دینا واسع کو۔" دادی یاد دلانا نہیں بھولیں۔

جمیلہ نے رباب کی مصروفیت دیکھتے ہوئے خود باورچی خانے کی راہ لی۔ مہمانوں کی خاطر مدارت بھی کرنی تھی۔ نازنین نے بھی اپنی توجہ کام کی طرف لگائی۔ پشمینہ پوخ کار سیکھ رہی تھی۔ نازنین کو کروشیے کا شوق تھا۔ چائے اور گپ شپ کے ماحول میں الٹے سیدھے کشیدہ کاری کے ہاتھ مار کر اب وہ ایک مرتبہ پھر پیچھے کے صحن میں آ گئی تھیں۔

واسع کا کمرا اور کھڑکی اب نازنین کے دائیں ہاتھ پر تھی۔ یوں تو اس نے پختہ ارادہ کیا تھا کہ بنا کھڑکی اور دروازے کی طرف دیکھے گزر جائے گی لیکن یہاں آتے آتے وعدہ بھول بھال گیا۔ وجہ کچھ بارش بھی بنی۔ کچھ دیر سے رُکی بارش اس صحن میں داخل ہوتے ہی ایک بار پھر شروع ہو گئی تو نظر بے اختیار ادھر اُٹھ گئی۔ لیکن کھڑکی خالی ملی، نظریں ناکام پہلے نیچے آئیں پھر دروازہ آنے پر ایک بار پھر پلٹ گئیں۔ لیکن وہ اب وہاں نہیں تھا۔ معلوم نہیں وہ بارش کا اپنے اور اس سے کوئی گہرا رشتہ جوڑنے میں کیوں کوشاں تھی۔ وہ تو یہاں تھا ہی نہیں۔

وہ بجھے دل سے آگے بڑھی۔ پشمینہ گھر کے دروازے تک پہنچ چکی تھی۔ مردانہ ہنسی کی آواز نے سر اٹھانے پر مجبور کیا۔ واسع اور نصیر درمیانی دروازے میں کھڑے تھے۔ شاید کچھ دیر پہلے ان ہی کے گھر سے نکلے تھے۔

"اُف۔" نازنین نے شرمندگی سے لب دبائے۔ تو مطلب کچھ دیر پہلے جب وہ چوری چوری واسع کی کھڑکی اور دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی تو وہ دور سے کھڑا دیکھ رہا تھا

"السلام وعلیکم۔" پشمینہ ان دونوں کو دیکھ کر رُک گئی۔ وہ دونوں شاید چاچا چاچی سے مل کر آ رہے تھے۔ ہلکی ہلکی بارش میں بھیگتے نازنین نے بھی سلام کرنے کے لیے اوپر دیکھا۔ دونوں پاس پاس ہی کھڑے تھے۔ اس نے مشترکہ سلام کر کے فوراً ہی سر جھکا لیا

"آپ کب آئے نصیر لالہ؟"

"بس کچھ دیر پہلے پہنچا ہوں۔ اچھے موسم نے گھر میں ٹکنے نہیں دیا۔ آؤ تم لوگ۔" نصیر کو لگا وہ کہیں رستہ روک کر نہ کھڑا ہو۔ واسع نے بھی اسی وقت چوکھٹ سے کندھا ہٹایا دراصل نصیر نہیں وہ ہی راستہ روک کر کھڑا تھا وہ بھی بالکل بے خیالی میں۔ شاید نازنین کو دیکھ کر۔

راستہ ملنے پر وہ پشمینہ سے پہلے بھاگی، واسع کی مبہم شرارتی مسکراہٹ صاف جتا رہی تھی کہ اس کی کچھ دیر پہلے کی چوری بھی چھپی نہیں رہی تھی۔

☆☆☆

اگلی صبح بھی بادلوں سے بھری تھی۔ دس بجنے کو آئے لیکن سورج کا چہرا کسی نے نہ دیکھا۔ پشمینہ نے

باغ جانے کا پروگرام بنالیا، بلکہ جب سے نازنین آئی تھی۔ وہ بہت بار پروگرام بنا چکی تھی لیکن ہر بار کوئی نہ کوئی رکاوٹ آڑے آجاتی۔ پر آج کے موسم کو دیکھتے اس نے جھٹ پٹ ارادہ کیا اور روانگی بھی فوراً کی تاکہ کوئی اور کام نہ نکل آئے۔ پچھلی رات دیر تک بارش ہوتی رہی تھی اس لیے صبح بڑی تر و تازہ اور ٹھنڈی ہوا لیے ہوئے طلوع ہوئی۔ چادریں اچھے طریقے سے اوڑھے وہ دونوں شمیم خالہ کے ساتھ گھر سے نکلی تھیں۔ انہوں نے نگار بھابی سے ملنے جانا تھا اس لیے طے یہی پایا کہ وہ ان دونوں کو اپنے باغ میں چھوڑتے آگے چلی جائیں گی۔ لیکن یہاں باغ کے دروازے پہ آکر معلوم ہوا کہ گیٹ تو ابھی اندر سے کھولا ہی نہیں گیا۔

رات کو سوتے وقت اسے ڈیرے والی سائیڈ سے آکر اندر سے بند کر دیا جاتا اور صبح کھول بھی دیا جاتا لیکن ابھی تک کوئی اس طرف آیا ہی نہیں تھا شاید۔ پشمینہ نے دو ایک مرتبہ بجا کر بھی دیکھا لیکن کوئی رسپانس نہیں ملا۔

"اچھا آگے آجاؤ پشمینہ! وہ دیکھو جبار چاچا کا باغ کھلا ہے۔ تم لوگ ابھی ادھر چلی جاؤ، اپنا باغ کھلے تو واپس آجانا۔" شمیم خالہ نے دونوں کو آگے بلایا۔

"ہاں یہ صحیح ہے، بلکہ نیلم شبنم فارغ بیٹھی ہوں تو ان کو بھی بھیج دینا اماں۔" پشمینہ خوشی خوشی آگے بڑھنے لگی۔ نازنین کی تو کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا معاملہ ہے، بس پشمینہ کے پیچھے چل دی۔ جبار چاچا کے کھلے گیٹ میں تین آدمی کھڑے تھے۔ دو آدمی تو عورتوں کو دیکھتے ہی سائیڈ پر ہو گئے۔ ایک لڑکا البتہ توجہ سے ان سب کو دیکھنے لگا تھا۔ شمیم خالہ نے برقع اُلٹا تو وہ مسکراتے ہوئے سلام کرنے لگا۔ شمیم خالہ ان دونوں کو ساتھ لیے باغ کے گیٹ سے اندر داخل ہوئیں۔

"ذکی بچہ۔ اپنا باغ ابھی کھلا نہیں۔ یہ لوگ ادھر گھومنا چاہتی ہیں کچھ دیر۔"

"ہاں ہاں آجاؤ، آپ بھی آئیں چاچی۔" ذکا نے درخت کے نیچے کھڑی کھاٹ کو فوراً سیدھا کیا۔

"نہ مڑے۔ میں تو تمہارے گھر جا رہی ہوں۔ اماں تو ہے ناں گھر پہ؟"

"جی جی، گھر پہ ہیں۔" ذکی، شمیم چاچی سے باتیں کرتا گیٹ تک آگیا۔ نازنین اور پشمینہ اندر جا کر بائیں ہاتھ کے درختوں کی طرف بڑھ گئی تھیں۔ شمیم چاچی برقع درست کر کے مزید آگے چلی گئیں۔ ذکا پلٹ کر اندر جانے لگا تو نظر دور سے آتے واسع پر پڑی۔ اور اس کی خاطر رکنے اور اس سے بات کرنے کا تو ذکی کو یوں بھی کوئی شوق نہیں تھا۔ اس لیے ابھی وہ کچھ فاصلے پر ہی تھا کہ ذکا دوبارہ باغ میں داخل ہو گیا۔ پشمینہ اور نازنین باغ کے اِسی پچھلے حصے میں گھوم پھر رہی تھیں۔ ذکی نے چھوٹی بڑی یہاں وہاں بکھری پھلوں کی ٹوکریوں کو ایک دوسرے میں پھنسا کر سایے میں رکھا۔ ہاتھوں کو جھاڑ کر سیدھا کھڑا ہوتے بالکل بلا ارادہ اس کی نظر سامنے پڑی، ہاتھ وہیں رُک گئے۔ پشمینہ کی کسی بات پر ہنس کے واپس پلٹتی وہ لڑکی۔ ذکا نے آنکھیں چھوٹی کر کے پہچاننے کی کوشش کی۔ باغ کی رنگا رنگی میں یہ "گلاب" تو بالکل نیا تھا۔ وہ جسے اتنی دیر سے نغمہ بھابی تصور کر رہا تھا۔ وہ تو کوئی اور تھی۔ شاید پشمینہ کی کوئی سہیلی۔ پر کون۔ اور اگر سہیلی تھی تو اس سے پردہ کیوں نہیں کیا تھا۔ پھر۔ ذہن پر زور دینے پر کچھ روز پہلے کی شبنم اور نیلم کی باتیں یاد آئیں۔ وہ دونوں پشمینہ سے ملنے چاچا کے گھر گئیں تو واپسی پر کوئٹہ سے آئی کسی مہمان کا ذکر ہو رہا تھا۔ وہ اگر زیادہ توجہ دیتا تو پوری بات بھی سن اور سمجھ لیتا لیکن ان کی باتیں تب اس کی توجہ اپنی جانب کیسے کھینچتیں۔ تب تک تو اس مہمان کو دیکھا نہیں تھا۔

"اتنی حسین مہمان۔" وہ مبہوت سا کھڑا دیکھ رہا تھا جب دیکھے جانے کے احساس نے نازنین کو چونکایا۔ وہ دونوں درختوں کے نیچے چہل قدمی کے انداز میں چل رہی تھیں۔ کافی دور تک چلے جانے کے بعد اب وہ پلٹ کر واپس آرہی تھیں۔ سامنے کھڑا لڑکا جس نے

انہیں گیٹ پر ریسیو کیا تھا، اب کام بھول کر اسے دیکھے جا رہا تھا۔ وہ نظر انداز کر کے نیچے دیکھنے لگی اور چند قدم آگے آتے ہی فوراً پشمینہ کو واپس پلٹنے کو کہہ دیا۔ لڑکے کی طرف اب ان کی پشت ہو گئی تھی۔ تھوڑا آگے جانے پر نازنین نے غیر محسوس انداز میں راستہ بھی بدل دیا۔ اب وہ اس لڑکے سے کافی دور آ گئی تھیں۔

''یہ باغ کس کا ہے پشمینہ؟'' نازنین نے عام انداز میں سوال کیا۔ وہ ان سب کو آہستہ آہستہ پہچان رہی تھی۔

''یہ جبار چاچا کا باغ ہے۔ اور وہ جو پیچھے کھڑا تھا ناں، نیلی واسکٹ والا۔ وہ ذکاء اللہ ہے، جبار چاچا کا اکلوتا بیٹا۔ یہ والا باغ بھی ان کا ہے اور اس سے اگلا بھی۔ اس سے اگلا باغ مجیب چاچا کا اور پچھلا تو ہمارا ہے۔'' پشمینہ ہاتھ اٹھا کر دائیں بائیں کی سمتوں میں اشارے کرتے سمجھانے لگی۔ نازنین کو ان سب کی رشتہ داریاں بھی دھیرے دھیرے سمجھ میں آ رہی تھیں۔ یہ بات تو آغاز میں پتا چل گئی تھی کہ رحمن چاچا وغیرہ چار بھائی ہیں اور گلشن پھوپھی ان کی اکلوتی بہن..... پر اک بات..... نازنین کو پشمینہ کے تفصیل سے بتانے پر یونہی دھیان میں آ گئی تو سوچا پوچھ بھی لے۔

''تو رباب لوگوں کا باغ کون سا ہے۔ وہ بھی تو تمہارے سگے چاچا ہیں نا۔'' سمجھ میں آنے والی بات تھی کہ جب آس پاس ان ہی سب کے باغات ہیں تو پھر ان کا کیوں نہیں۔ دل میں اشتیاق ذکا کو دیکھ کر اُٹھا کہ کہیں کسی باغ میں واسع بھی ذکا کی طرح کاموں میں مصروف کھڑا ہوگا۔

''ان کا باغ.....'' پشمینہ کچھ کہتے کہتے رُکی جیسے کوئی مناسب جواب یا جملہ سوچ رہی ہو۔ نازنین نے تعجب سے اس کا چہرا دیکھا۔ یہ کوئی ایسا کوئی مشکل سوال تو نہیں تھا جو پشمینہ مخمصے میں پڑ گئی تھی۔

''کیا ہوا۔ کیا سوچنے لگیں؟''

''اصل میں تمہارے سوال کا جواب ذرا لمبا ہے۔'' پشمینہ اب مسکرا رہی تھی۔

''اچھا۔ لیکن میں نے تو صرف باغ کا پوچھا

ہے۔" نازنین متعجب تھی کہ بظاہر تو بہت عام سی بات پوچھی تھی اس نے۔

"اصل میں ان کا باغ ہے بھی سہی اور نہیں بھی۔"

"ہیں..... وہ کیسے، اب بتا بھی دو، پہیلیاں نہ بجھواؤ۔" بات چونکہ واسع کے متعلق تھی، تجسس کچھ اور بھی زیادہ ہوا۔

"ابھی چپ رہو، یہاں بتانے کی بات نہیں ہے۔" پشمینہ زیادہ نہیں سمجھا سکتی تھی اس لیے دھیمی آواز میں تنبیہ کی اور اس کے لہجے کی وجہ سے نازنین کو لگا کہ بات کا تعلق ان ہی باغ والوں سے ہے اور ہے بھی گمبھیر۔

"تم لوگوں کا باغ اب کھل گیا ہوگا پشمینہ! وہاں چلیں۔" نازنین کو معلوم نہیں کیوں یہاں کے ماحول میں کچھ الجھن اور گھبراہٹ سی ہو رہی تھی۔

"ہاں، نیلم اور شبنم بھی نہیں آئیں۔" پشمینہ نے بھی جانے کا ارادہ کیا، دونوں گیٹ کی طرف بڑھیں تو ذکاء ایک مرتبہ پھر کام چھوڑ کر انہیں دیکھنے لگا۔ اس مرتبہ پشمینہ نے بھی ناگواری محسوس کی۔ ذکا مسلسل ان کے آس پاس موجود رہا تھا جبکہ چاہیے تو یہ تھا کہ ان کے باغ میں آنے پر وہ یہاں سے چلا جاتا یا اور نہیں تو ذرا فاصلے پر ہو جاتا، پشمینہ کو اس کی موجودگی میں نازنین بھی کافی بے سکون لگی۔ تب ہی اس کی کیفیت سمجھتے اس نے چادر اوڑھ لی اور آدھا چہرہ چھپا کر دونوں گیٹ کی طرف بڑھیں تو ذکا نے آواز دے ڈالی۔ پشمینہ نے ہی پلٹ کر بتایا کہ اپنے باغ کی طرف جا رہی ہیں۔ نازنین البتہ جلد از جلد یہاں سے چلی جانا چاہتی تھی۔ دیکھنے دیکھنے میں بھی کتنا فرق ہوتا ہے۔ ذکاء کی اندر تک اترتی نظریں بہت عجیب تھیں۔ معلوم نہیں کچھ اکٹھے کرتی آنکھیں کیوں اپنے بے پردہ ہونے کا احساس دلانے لگتی ہیں۔ بے اختیار کہیں چھپ جانے کو دل کرتا ہے۔

وہ گیٹ سے نکل کر دیوار کے ساتھ ساتھ چلتی آگے بڑھ رہی تھی جب نظر سامنے ایک بڑے پتھر پر بیٹھے واسع پہ پڑی۔ قدم بری طرح ڈگمگائے۔ اس کی سامنے موجودگی بالکل ہی غیر متوقع تھی۔ حتیٰ کہ واسع کے لیے بھی اس طرح راستے میں اس کا ہونا۔ وہ اسے سامنے دیکھ کر بہت اندر سے بے ساختہ مسکرا دیا تھا اور پھر ذاتی کوشش سے اپنے چہرے کو سنجیدہ بنانا پڑا کہ اوروں کی موجودگی میں وہ اس اپنائیت کو ظاہر نہیں کر سکتا تھا جو وہ اس کے لیے محسوس کرنے لگا تھا۔ اُس وقت بھی پیچھے گیٹ سے نکلتی پشمینہ نے اسے چہرا سپاٹ رکھنے پر مجبور کیا لیکن پشمینہ کے پیچھے ذکا کے گیٹ سے نکلنے پر واسع کے چہرے پر حقیقی گمبھیرتا چھائی۔ ادھر ذکا بھی نکلا تو اس مہ جبین کو دیکھنے تھا لیکن واسع پہ نگاہ پڑتے ہی اس کا ہرا بھرا موڈ بھی خزاں کی پیلاہٹ میں تبدیل ہوا۔

واسع کو کافی دیر پہلے اس نے یہاں سے آتے دیکھا تھا۔ اور یہی خیال کیا تھا کہ وہ یہاں سے گزر رہا ہے لیکن وہ بجائے گزرنے کے تب سے یہیں بیٹھا تھا، یہ بات کچھ عجیب تھی۔

کہیں وہ اِن دونوں کی خاطر تو یہاں آ کر نہیں بیٹھا تھا۔ شکی طبیعت نے ذکا کے دل میں سوال پیدا کیا۔

"سلام واسع لالہ!" پشمینہ نے قریب سے گزرتے سلام کیا۔

"وعلیکم السلام۔" وہ نیچے ہی دیکھتا رہا، دل میں ایک الجھن بھرا سوال لیے کہ آخر وہ جبار چاچا کے باغ میں کیا کرنے گئی تھیں۔

ساتھ کوئی آدمی، بھابی یا چاچی وغیرہ بھی نہیں تھے۔ اور ان دونوں کے ساتھ باغ میں ذکا تھا۔ اس خیال نے پہلی مرتبہ واسع کو ایک درد دیتے احساس سے دوچار کیا۔ لیکن نہ وہ کسی سے کچھ پوچھنے کا حق رکھتا تھا نہ کسی کے ذاتی معاملے میں مداخلت کا کوئی ارادہ تھا۔ ان دونوں کے اپنے باغ میں داخل ہو جانے پر وہ بھی جانے کے لیے اُٹھ کھڑا ہوا۔ سوچا تھوڑا مزید آگے چل کر گلشن پھوپھی کو سلام کر آئے۔ لیکن سیدھا کھڑا ہوتے سر اٹھایا تو ذکا کو اپنے عین مقابل بہت قریب پایا۔ ایک خاموش مگر سنجیدہ سوالیہ نظر ذکا پر ڈالی۔ معلوم نہیں وہ اس کا

راستہ کیوں روک کر کھڑا ہو گیا تھا۔

''تم یہاں اِن دونوں کے لیے بیٹھے تھے۔''

''ہوں؟'' واسع کے ماتھے پہ بل آیا، ایک غصے کی نظر اس نے ذکا پر ڈالی۔ ''کیا مطلب..... کون دونوں؟''

''بھئی راستے میں ایسے بیٹھے ہو جیسے کسی کی چوکیداری کر رہے ہو، میں نے تو یونہی پوچھ لیا۔'' ذکا نے واسع کا غصہ دیکھ کر بات کو مذاق میں ٹالنے کی کوشش کی لیکن واسع نے لطف نہیں اٹھایا۔

'' چوکیداری بہر حال ''جاسوسی'' سے بہتر کام ہے۔'' وہ کہہ کر رکا نہیں اور آگے بڑھ گیا۔ ذکا کے ذہن میں جو ایک بے ہودہ خیال آیا تھا کہ وہ یہاں پشمینہ اور نازنین کی وجہ سے بیٹھا ہے، واسع کا اس کی وضاحت اور صفائی دینے کو ہرگز دل نہیں چاہا جبکہ وہ ان دونوں کی باغ میں موجودگی تک سے لاعلم تھا۔ وہ تو نصیر سے ملنے کے لیے گھر سے نکلا تھا۔ باغ کے باہر موسم اچھا دیکھ کر یونہی ستانے بیٹھ گیا۔ اب ذکا نے شک کیوں کیا اور اس کا تعلق کیا تھا اس کی بلا سے۔ ذکا کے سامنے جی حضوری جیسا انداز تو اُسے کسی قیمت قبول نہ تھا۔ جو شخص اپنے مرتبے کو آپ ہی بلند تصور کرتا ہو اس سے جھک کر ملنا آپ کی عزت خود اپنی نظروں میں مجروح کرنے کے مترادف ہے۔

غریب اور کم حیثیت کو کبھی اپنے پیروں میں نہ آنے نہ دو اور جنہیں اپنے کچھ ہونے پر خود ہی مان ہو، انہیں سر اٹھا کر شکست دو۔ یہی ایک انسان کی خود پر بھروسے اور انسانیت پر یقین کی دلیل ہے۔

فی الحال وہ خود کو نارمل رکھنا چاہتا تھا، نازنین کے جبار چاچا کے باغ میں ہونے پر وہ اپنے اندر کی کھولن سے نبرد آزما تھا۔ حسد اور جلن کے نئے نئے محسوسات اندر ہی اندر اسے بہت بے چین کر رہے تھے۔ طبیعت کے ایک دم بوجھل ہو جانے کی وجہ اللہ جانے ان دونوں کی یہاں موجودگی تھی، ذکا کا رویہ یا اپنی جلن سے بیزاری۔ وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

دوسری جانب گھر واپس جاتی نازنین، واسع کو دیکھ لینے کے باوجود بجائے خوشی محسوس کرنے کے انتہا کے بھاری پن اور اضطراب میں گھر گئی تھی۔ اب یہ بھاری پن ذکا کی بے باک نگاہی کا تھا یا دل کا چور کسی موازنے پہ تُل گیا تھا، وہ بھی سمجھ نہیں پائی۔

تیسرا ذکا تھا جو بیک وقت خوش گواری اور ناگواری کے ملے جلے احساسات کا شکار تھا۔

کچھ ملاقاتیں اور سامنے باوجود سرسری ہونے کے معمولی نہیں ہوتے۔ تقدیر دراصل سب جانتی ہے کہ آج کے ملنے والوں میں آئندہ کس نے کہاں فِٹ بیٹھنا ہے تب ہی بظاہر عام دکھائی دیتی ہے، بعض پہلی ملاقاتوں میں کچھ نہ کچھ چونکانے کا باعث ضرور بنتا ہے۔ جس کا ادراک اس وقت تو نہیں ہوتا پر آگے چل کر پلٹ کے دیکھنے پر سمجھ میں آتی ہے کہ کچھ محسوس ضرور ہوا تھا۔

واسع کے لیے نازنین کیا تھی، ابھی وہ سمجھنے کے مرحلے میں تھا۔ اور نازنین کے لیے واسع کیا تھا وہ دل سے سمجھ چکی تھی لیکن خود کو سمجھانا مشکل تھا۔ گلاب کی شاخ کو پھول چھونے کی خواہش میں پکڑا جاتا ہے لیکن وہ بنا کانٹے کی چبھن دیے آپ کے ہاتھ نہیں آتی۔

واسع کا اس قصے میں کہیں ہونے کا وہم ذکا کو کانٹے سا چبھا تھا۔ باغ میں ایک خوب صورت لڑکی کو دیکھ لینے کے بعد اس خوبصورت چیز کو دوبارہ دیکھنے کی خواہش اسے باہر تک کھینچ لائی تھی، پر واسع کے اس خوب صورتی سے کہیں تعلق نے ''خوب صورت'' چیز کے مفہوم میں ضد جیسی تبدیلی پیدا کی۔ نازنین کے حسن نے ذکا کو چونکایا ضرور تھا لیکن ابھی وہ ایک انجان حسینہ کے یک دم پہنچ میں ہونے سے تعجب میں مبتلا تھا کہ واسع کو دیکھ کر وہم گزرا کہ وہ اپنی پہنچ میں ہونے کے بجائے کہیں دشمن کی رسائی میں نہ ہو۔ البتہ واسع کے فوری جواب اور غصے نے ایسا تاثر نہیں دیا۔ ورنہ یہ احساس پھول کے ساتھ لگاؤ سے زیادہ کانٹے سے ناگواری کا ہونے لگتا اور یہ بھی شاید واسع کی خوش قسمتی تھی کہ ذکاء کے کان کھڑے نہیں ہو پائے۔ اب معلوم نہیں کہ کب تک۔

☆☆

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

شازیہ الطاف ہاشمی

رہائی

پاؤ بھر میں کتنی بوٹیاں ہوتی ہیں۔ بختاور کے لیے یہ بوٹیوں کا سرخ گرم تیرتا دریا تھا۔ سلور کے بڑے کٹورے میں سارا سرخ شوربا اور ساری بوٹیاں اس نے دیگچی چولہے سے اتاری اور روٹیاں سنبھال لیں اور خود دیگچی سے رگڑ کے نوالے کھانے لگی۔ اس کی ناک میں موٹا کوکا محبت کا امین ہے یہ گواہ ہے کہ اسے کرم نے ہی بکھی کی ہتھیلی پر رکھا تھا بختاور ٹوٹ کر محبت کرنے والوں میں سے ہے محنت نے اسے توڑ ڈالا ہے مگر محبت کرنے والے ٹوٹ کر بھی کبھی ٹوٹا نہیں کرتے۔ محبت کا کاسہ ماپا کی چاہ کی طرح ہے جسے موت کے سوا کوئی بھر نہیں سکتا۔ بختاور کا پیالہ بھی نہیں بھرا۔ کرم نے پیالہ ایک بار پھر زمین پر دے مارا۔

"یہ گوشت پکایا ہے تو نے، سرخ مرچوں سے بھرا ہوا۔ ناں اندھی تھی جب چمچے بھر بھر انڈیل رہی تھی۔ لعنت ہے تیری صورت پر۔"

کرم جب بولتا تھا بغیر رکے کسی وجہ کے بغیر بھی بخادر کے دل کا خون کر دیا کرتا تھا۔ وہ سوچے سمجھے بغیر بولنے کا عادی تھا۔ پاؤ بھر گوشت کی بوٹیوں سے اس نے روٹی کھا تو لی، پر بدمزہ بہت ہوا۔ بختاور کچے چولہے کے پاراڑتی سنہری ریت کو دیکھ رہی تھی۔ اس ریت میں بے شمار راز چھپے تھے۔ راز ان چھدرے رتیلے رنگ کے خوں خوار سانپوں کی طرح جو موٹے چوہوں کو ثابت نگل جایا کرتے تھے اور ریت میں ان کا نام ونشان ڈھونڈنا بھی نا ممکن ہوا کرتا۔ اس گرم ریت پر چلتے پاؤں دھرتے بازوؤں میں سفید چوڑیاں پہنے بختاور عرف نے کرم کے میٹھے سپنوں بھرے گیت ہوا کے سپرد کیے تھے۔

بچپن سے اماں کہا کرتی کہ "کرما تمہارا گھر والا بنے گا۔ اماں اور اس کی سیاہ کلائیاں سوکھے بدن دور دور کنوؤں سے پانی بھرا کرتا خشک ہو جاتے۔ پر امید ہری بھری رہتی۔

"اماں کرما میرا کیا ہے؟" چنری کا پلو تھامے خود کو ڈھانپنے کی کوشش کرتے وہ ایک ریتلا سا سوال پوچھتی۔

"کرما تمہارا کرما ہے بس۔" اور اماں ہنسنے لگ جاتی، اس ہنسی میں اس کے چھوٹے چھوٹے سفید سے دانت بھی ساتھ دیتے۔

صحرا کی ٹھنڈی راتوں میں جب دور کوئی بانسری کے سر بکھیرتا۔ بکھی اٹھ کر بیٹھ جاتی۔ یہ اتنے سارے سنہرے خواب پتا نہیں کون بکھیر دیتا ہے۔ اسے لگتا سارا صحرا، مٹی کے پیالے سب گا رہے ہیں۔ گھڑوں میں پڑا گدلا پانی بڑے شہروں کی طرح ٹھنڈا ہو رہا ہے، گوٹھ کا خوب صورت کرما گھنی مونچھیں لمبا قد سانولا رنگ کتنا جچتا ہے ناں کرے کا۔ ساری رات بکھی کے اردگرد ڈھول پیٹے جاتے رہے۔ وہ کرے کو گوٹھ کا سب سے اچھا مرد سمجھتی پھری، سارے خوابوں نے اس کا رستہ دیکھ لیا تھا۔ بڑی زرخیز سرزمین تھی۔ باہر تو صحرا تھا' ریت اڑا کرتی مگر اس کے اندر خوش رنگ پھول کھلا کرتے۔

☆☆☆

"ہاں چلچی! چاچا کہاں ہے؟" کرما کبھی مسکرایا نہیں۔ کرختگی اس کے وجود میں سانس کی طرح لازم تھی۔ اندر جھونپڑی میں چت لیٹی بکھی نے اسے سنا اور دوڑی چلی آئی۔

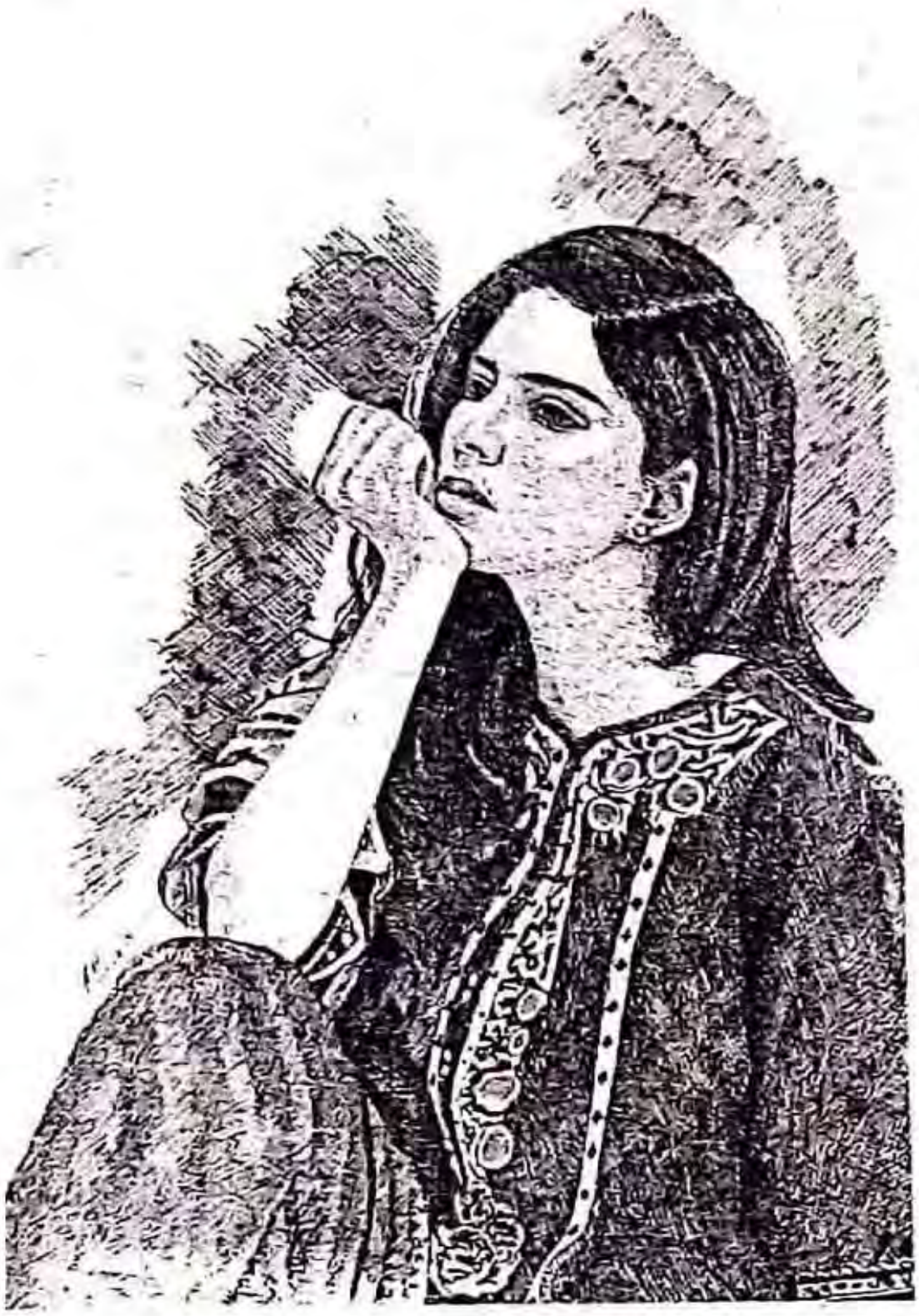

آج بھی سختی غالب تھی۔ محبت کہاں تھی۔ اس کے دل میں تو صرف وہ تھی بس ایک یقین ہی آہستہ آہستہ سچا نکلا تھا۔ باقی ساری باتوں کا رنگ اڑ گیا۔ اسے محسوس ہوا تھا کہ وہ صحرا میں رہتی ہے اور صحرا بہت بے رحم ہے بہت مشکل سے جینے دیتا ہے۔ جینے کے سارے اسباب تو وہی تھے۔ وہی مور تھے پر اب بے رنگے پروں کے پیچھے اس سے بھاگا نہیں جاتا تھا، محبت اسے ایک نہ ایک دن ضرور بدل دے گی۔

''میں نے تمہارے انتظار میں روٹی بھی نہیں کھائی۔'' اس کے بدن کی ناتوانی بتاتی تھی کہ وہ سانس بھی کبھی کبھی لینے لگی ہے۔

''تو کھالیا، کر تجھے کس نے روکا ہے۔''

''کرمے! تو ایسا کیوں ہے۔''

''میں تو ایسا ہی ہوں۔ کسی کا باپ بھی مجھے بدل نہیں سکتا۔''

''کرمے! تو بیٹھ جاناں۔ بابا آ جاتا ہے۔''

''تو پانی پلا ذرا۔'' بکھی سعادت مندی سے سر جھکاتی شرماتی پانی لے آئی۔

''آج بڑی خوب صورت لگ رہی ہے۔'' کرمے نے اس کی کلائی تھامی۔ ''اس پکڑ میں سختی نمایاں تھی۔ مرد تو کڑیل جوان ہی اچھے لگتے ہیں۔ اس نے سوچا۔ اس خوب صورت سوچ کو ٹھوکر کرمے نے اگلے ہی پل دے ماری تھی۔

''ایک تو تیرا بابا دیر بڑی کر دیتا ہے۔ بکھی! سارے گوٹھ کے مرد جمع ہیں۔'' اس کا مزاج دھوپ چھاؤں سا تھا۔ کیا پتا کب بدل جائے وہ نہ شرما سکی نہ گھبرا سکی بلکہ اسے دیکھتی رہی۔ ست رنگ مور کے کتنے سارے پر ان کی جھونپڑی کی دیوار سے لگے رہتے۔ اماں کے لاکھ منع کرنے کے باوجود وہ دور دور تک موروں کے قدموں کے نشانوں پر چلا کرتی اور کتنے سارے رنگین پل اکٹھے کر لاتی۔

''بکھی! اللہ تمہارے نصیب اس سنہرے پکھ سے کر دے۔'' ماں کی دعا پر خود اماں کو بہت یقین تھا۔ صحرا کے گیت جب سوکھے پتلے لبوں پہ پھسلتے، بکھی کو کرما یاد آنے لگتا۔ بازوؤں میں سفید چوڑیاں بھرے بیاہ گیت اس کے نازک سے دل میں طوفان برپا کر دیتے۔ اس کی موٹی موٹی آنکھیں خوابوں سے بھر جاتیں۔

☆☆☆

پھر وہ رات بھی آ گئی جب وہ تنہا تھی۔ پورا چاند کرنیں لٹاتا تھا اور وہ محبت لٹانے آئی تھی، اس کے سارے ناز بوجھ اٹھا لینے آئی تھی، وہ بہت پیار سے جینے چلی تھی۔ اماں کی ساری دعائیں اپنے پلو میں سمیٹ لائی تھی، بابا کے آنسو دل میں چھپائے اسے کرمے کا انتظار تھا۔ وہ بہت دیر سے آیا تھا، وہ بہت امید سے بیٹھی تھی، محبت کا جواب محبت سے پانے کے لیے۔

اس کے دل میں تو صرف میں بستی ہوں ناں صرف میں اسے یقین کامل تھا۔

''ایسے کیوں بیٹھی ہے؟''

وہ سچ کہتا تھا۔ ایک ہی ایک بھائی تھا ناں..... چھ بہنوں کا' کیا کیا لاڈ نہ اٹھائے گئے تھے، کیسے کیسے اسے چاہا نہیں گیا تھا اتنا کہ وہ کسی کو چاہنا محبت کرنا ہی بھول گیا تھا۔

''مردوں کی عادت ہوتی ہے۔'' اس کی عادت یہی تھی۔ وہ ایسا ہی تھا۔ کسی کے لیے وہ نہیں بدلا تھا بکھی کے لیے بھی نہیں۔ کرمے کی ماں کہتی تھی۔

''تو سچ کہتی ہے۔ تیرا چہرہ جھوٹ نہیں بول رہا مگر ایک عورت کو اللہ نے یہ طاقت دی ہے کہ کسی بھی مرد کو بدل دیتی ہے۔ عورت تو پانی کی طرح ہر گڑھے، ہر گھڑے میں جگہ بنا لیتی ہے تو بھی بنانا سیکھ جائے گی آہستہ آہستہ۔''

گھڑے کے ٹھنڈے پانی میں اسے زہر گھلا محسوس ہونے لگا تھا۔ کرما کسی اور کو بھی نہیں چاہتا تھا۔ اس کی زندگی میں صرف وہی تھی اور وہی اذیت میں تھی اور وہی محبت کے ہاتھوں دم توڑنے والی تھی جب جب اسے چاہا گیا۔ اس نے پروا نہیں کی تھی۔ وہ کیوں کرتا۔ اس نے کرنا سیکھی ہی نہیں، وہ ساری چپڑی روٹیاں، سوکھا پنیر، تازہ بھیڑ کا دودھ، لسی اور اپنا وجود سب لٹا کر بھی خالی ہاتھ تھی۔ ازل سے محبت کرنے والی محبت سے بھری تنہا عورت۔ ویران، بنجر، ترسی ہوئی عورت میٹھے بول کی طلب میں مرتی ہوئی۔

☆☆☆

''سو گئی ہو؟'' رات دیر تک اس کے انتظار میں جاگنے والی، بت بننے والی آرام سے لیٹی تھی۔ آج ٹھنڈا صحرا اسے کوئی میٹھی لوری سنا رہا تھا۔ ''روٹی ہے؟''

''ہاں، ابھی لا رہی ہوں۔'' وہ اٹھ کر روٹی لینے چلی گئی تھی۔ آج بھرے پیٹ کی توانائیاں ہی اور تھیں اس کے چلنے میں ہمت معلوم ہوتی تھی۔ صاف ستھرے کپڑے، اپنا خیال خود رکھ کر بکھی خوش تھی۔

''تو نے روٹی کھالی۔''

''ہاں کھالی کیونکہ بھوک بہت لگ رہی تھی۔''

''ہوں۔'' کرما اپنی سوچوں کی کرختگی میں گم تھا۔

''قدموں میں بکھر کر وہ کیوں بے مول ہو، وہ بھی تو اللہ کی بنائی ہوئی کائنات میں برابر کی حصہ دار ہے۔ وہ بے کار نہیں ہے، بہت اہم ہے۔ اسے پہچان دے کر بھیجا گیا ہے۔''

کرمے کا جوتا کتنے دنوں سے اس کے پیروں میں ہی تھا۔ وہ جوتے میں ملفوف ذلیل چاہت سمیٹنے کے لیے آگے نہیں بڑھی تھی۔

گرم ہواؤں میں چھپے پیغام ایک بار پھر سے اس کے نرم سنہرے بالوں سے کھیلنے لگے تھے۔ اس کے بجھے دل کو زندہ کر رہے تھے۔ اس کے لہجے میں بسی لجاجت، بے بسی کی جگہ اعتماد آ رہا تھا۔

''کرمے کو تم نے بدل دیا ہے بکھی۔''

''نہیں اماں۔ میں نے اسے نہیں اس نے مجھے بدل دیا ہے۔'' اماں حیران تھی۔

''میرے سارے مور پنکھ کہاں ہیں، آج میں انہیں اپنے گھر لے جانا چاہتی ہوں۔''

ان کی ساری نرمیاں بکھی کے سنہرے دل میں اتر رہی تھیں۔

وہ تنہا ہو کر بھی تنہا نہیں رہی تھی۔ وہ خود تھی ناں اپنے پاس، اپنا احساس کرنے کے لیے۔

وہ اس کے سارے کام کرتی تھی مگر اب اس پر مرنے جان دینے کے لیے تیار نہیں تھی۔

اس کی جان بھی قیمتی ہے، اس کی بھی عزت ہے۔ بالکل کرمے کی طرح۔ وہ اپنا خیال پہلے خود رکھتی پھر ہی کوئی دوسرا رکھتا ناں۔

کبھی کبھار پکنے والے گوشت، گرم شوربے پر اس کا بھی اتنا ہی حق تھا جتنا کہ خود کرمے کا۔ اس نے سمجھنا شروع کر دیا تھا۔

میٹھے پکوانوں کی سلور کٹوریوں سے اب اس کے لب بھی میٹھے ہوا کرتے، آسمان پہ اڑتے پرندوں کی طرح اس نے بھی کمزور کر دینے والے دشمن محبت سے رہائی حاصل کر لی تھی۔ دور سے آتے کرمے کو دیکھ کر مسرور بکھی کے لبوں پر ایک آزاد مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ صحرا آج نغموں میں ڈھلا اور ہی رنگ رنگ چکا تھا کیونکہ آج ایک عورت نے خود کو بدلا تھا اور رہائی پائی تھی۔

☆

انداز شریعت

"واہ بھئی، مزہ آ گیا۔" آصفہ پھوپھو، فوزیہ چچی، بسمہ آپی، حرا، ماما اور میں ہم سب دستر خوان پر بیٹھے بریانی سے انصاف کر رہے تھے اور یہ جملہ بار بار ہم سب کی زبانوں سے بے ساختہ پھسلتا تھا۔

"بھئی میری حمنہ کے ہاتھ میں جادو ہے۔ دال چاول بھی بنالے تو اتنے لذیذ کہ بندہ انگلیاں

چاشنا رہ جائے ..... اور پھر بناتی بھی منٹوں میں ہے۔ وہ بھی تن تنہا بغیر کسی کی مدد کے۔"

ماما کو بیٹی کی تعریف میں وہی گھسا پٹا روایتی جملہ شاید اتنا معقول نہ لگتا تو وہ، خود ہی رطب اللسان ہو جاتیں اور پھر مقابل کو بھی قائل کر کے ہی چھوڑتیں۔ ان کا یہ فارمولا جلد ہی کامیاب ثابت ہوا، حمنہ آپی کے ہاتھ کے ذائقہ کے چرچے جلد ہی زبان زدعام ہو گئے۔

بلاشبہ حمنہ آپی جو بھی پکاتیں لذیذ اور خوش ذائقہ ہوتا اور یہ بھی سچ تھا کہ خاندان میں دیگر لڑکیاں کوکنگ میں اتنی پرفیکٹ تھیں نہ ایکسپرٹ۔

"چکن کڑاہی میں کیا کیا ڈالنا ہے۔ جلدی سے بتا دو ..... ابو کو بازار بھیجنا ہے لانے کے لیے۔" تائی کی نوال آپی جو کہ حمنہ آپی کی ہی ہم عمر تھیں۔ بڑی عجلت میں دیوار جھانک کر پوچھتیں۔

اچھا میں پیپر پر لکھ کر تمہاری طرف بھیج دیتی ہوں۔" حمنہ آپی کسی کام میں مصروف ہوتیں تو وہیں سے ہانک لگا دیتیں اور پھر ایک فخریہ مسکراہٹ کے ساتھ چکن کڑاہی کے اجزائے ترکیبی لکھ دیتیں۔

"حمنہ! تمہاری نقل تو وہ مار رہی ہے ..... تمہارے جیسی چکن کڑاہی بنا لے گی بھلا۔" ماما بڑے تفاخر سے کہتے ہوئے استہزائیہ ہنستیں اور حمنہ آپی کی گردن مزید تن جاتی۔

"آپا! اگر آپ برا نہ مانیں تو میں حمنہ کو ساتھ لے جاؤں، عافیہ (چچی کی چھوٹی بہن) کی شادی کے بعد میرے ہاں یہ پہلی دعوت ہے۔ اس کے چاچو کہہ رہے تھے حمنہ کو بلا لینا کوکنگ کے لیے، تم کہاں آج کل کے دور کے کھانے پکا سکو گی۔" فوزیہ چچی خوب مکھن لگاتیں اور آپی، ماما کو تو تعریف چاہے تھی چاہے سچی ہو جھوٹی، فوراً اثبات میں سر ہلاتیں۔ آپی کے ہاتھ کے ذائقے کی گردان کرنے لگ جاتیں۔

"بھئی اس کی پھوپھو تو اس دن کہہ کے گئی تھیں، کیسا بختوں والا آنگن ہوگا جہاں ہماری حمنہ قدم رکھے گی ..... جس گھر میں جائے گی۔ مانو ان کے تو نصیب روشن ہو جائیں گے۔"

"حق ہا ..... کاش میرا وجدان بڑا ہوتا تو میں ایسا ہیرا چھوڑتی بھلا، نفاست، رکھ رکھاؤ، ہزار گن۔ ایسی لڑکیاں تو چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی نہ ملیں۔"

پھوپھو کے کہے یہ جملے ماما کو تو اب حفظ ہو چکے تھے۔ من وعن کہہ سناتیں اور چچی برابر اثبات میں سر ہلاتی رہتیں۔

اور حمنہ آپی اپنی تعریفیں سمیٹتی نہ تھکتیں۔

"میری آپی نے رات کو فرائیڈ رائس بنائے تھے یقین مانو بالکل کسی اچھے ہوٹل کے لگ رہے تھے۔"

میں اسکول میں اپنی فرینڈز کو بتا رہی ہوتی۔ اور وہ بھی شوق سے سنتیں اور للچاتی نظریں میرے لنچ باکس پر جما دیتیں۔

☆☆☆

اسکول، کالجز میں سرما کی چھٹیاں تھیں۔ میں اور بسمہ آپی بھی آج کل گھر پر تھے۔ میں آٹھویں کلاس میں تھی اور بسمہ آپی فرسٹ ایئر میں۔ حمنہ آپی تو دو سال پہلے ہی بمشکل ایف۔ اے کرنے کے بعد تعلیم کو خیرباد کہہ چکی تھیں اور مکمل طور پر گھر گرہستی میں مصروف تھیں۔

آج خلاف معمول سورج کرنیں لٹا رہا تھا ورنہ اتنے دنوں سے تو دھند ہی چھائی رہتی تھی۔ میں صحن میں ماما کے قریب چارپائی پر بیٹھی اپنا ہوم ورک کرنے میں مشغول تھی۔ حمنہ آپی کمروں کے جالے وغیرہ اتار رہی تھیں بسمہ آپی کمرے سے نکلیں اور دو منٹ برآمدے میں رک کر حمنہ آپی کو دیکھا جو بڑے انہماک سے ماما، پاپا کے کمرے کی چھتیں دیواریں صاف کر رہی تھیں۔ پھر باہر آ کر ایک نظر صحن میں دوڑائی۔ ایک کونے میں پڑی جھاڑو اٹھا کر دوبارہ کمرے کی طرف پلٹ گئیں۔

''ماما.....ماما!'' حمنہ آپی چلاتی ہوئی باہر آئیں۔

''یہ کیا؟ اس پھوہڑ لڑکی کو تو جھاڑو اٹھانا بھی نہیں آتی اور اسے آپ نے میرا ہاتھ بٹانے کے لیے بھیج دیا۔''

''کون بسمہ؟'' ماما نے حیرت سے آنکھیں پھیلاتے ہوئے پہلے حمنہ آپی پھر ان کے پیچھے کھڑی بسمہ آپی کو دیکھا۔

''اور کیا۔ یہ ان محترمہ کو نجانے آج کہاں سے شوق اٹھا ہے گھر داری کا..... ہونہہ ہر کسی کے بس کی بات نہیں یہ۔ اسے کہیں اپنی راہ لے اور میرے کاموں میں رکاوٹ نہ بنے۔''

حمنہ آپی اس بات پر کیوں پیچ وتاب کھا رہی تھیں۔ میری ننھی عقل یہ سمجھنے سے قاصر تھی۔ ماما نے بسمہ کو ڈپٹ کر کہا کہ ''جاؤ اپنی کتابیں نکال کے پڑھو۔'' وہ منہ بسورتی کمرے میں چلی گئیں۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد میں کمرے سے کلر پنسلز لینے گئی تو بسمہ آپی منہ پر ہاتھ رکھے رو رہی تھیں۔

''آخر کیوں! بسمہ آپی اتنے مشکل کام کرنے کے لیے کیوں رو رہی ہیں؟'' میں منہ میں پنسل ڈال کر سوچتی ہوئی کمرے سے باہر آ گئی لیکن شام تک بسمہ آپی کا منہ پھولا رہا حالانکہ ماما یا حمنہ آپی نے انہیں قطعاً قابل اعتنا نہ گردانا۔

پھر ایک دو دن بعد حمنہ آپی نے بھی ان کا روٹھا روٹھا انداز محسوس کر لیا، تب ہی انہوں نے فیصلہ کن انداز میں ماما سے کہا۔ ''ماما! آپ بسمہ کی ڈیوٹی لگا دیں کہ وہ شام کے برتن صاف کرے، اپنے اور آمنہ کے کپڑے دھوئے اور اپنے ہر کام کی ذمہ داری اپنے سر لے اور ہاں جب مجھے ضرورت ہو جو بھی کام بتاؤں یہ کرے، تاکہ اسے بھی کام کرنا آئے اتنی بڑی ہو گئی ہے اب۔''

حمنہ آپی کے منہ سے یہ چند باتیں کیا نکلیں بسمہ آپی تو خوشی سے کھلکھلاتے ہوئے۔ ''ٹھیک ہے آپی.....ٹھیک ہے آپی۔'' کی گردان کرنے لگیں مگر یہ خوشی محض چند روزہ ثابت ہوئی کیونکہ حمنہ آپی انہیں وقتاً فوقتاً ایسے ایسے کام بتاتیں کہ بسمہ آپی تو اب ان کی نظروں کا تعاقب کرنے سے ڈرتیں۔

''چلو سارے صوفوں کے کور اتار کر دھو کے دوبارہ اوپر چڑھاؤ۔'' اب بسمہ آپی کور اتار تو لیتیں لیکن دھونے میں بھی مشکل ہوتی اور اس کو دوبارہ چڑھانا خاصا مشکل ہوتا۔ وہ ماما کو مدد طلب نگاہوں سے دیکھتیں مگر حمنہ آپی بیچ میں حائل ہو جاتیں۔

''نہیں ماما آپ نہیں بتائیں گی۔ اس کی اپنی عقل کیا گھاس چرنے گئی ہے۔''

بڑے بڑے دیگچے بسمہ آپی سے ٹھیک طرح سے صاف نہ ہوتے تو کبھی حمنہ آپی ہزار صلواتیں سناتیں اور جب تائی یا چچی آ کر بیٹھتیں تو وہ بسمہ آپی کو ایسے مخاطب کرتیں گویا کوئی ملازمہ ہو۔

''چلو جاؤ۔ دیگچی میں چائے کا پانی رکھو۔ پھر مجھے آواز دے دینا۔ میں خود آ کے چائے بنالوں گی۔''

ان کے بظاہر عام لہجے میں کہے گئے یہ الفاظ بعض اوقات بسمہ آپی کے لیے دل خراش ثابت ہوتے۔

''اچھا تو اب بسمہ بھی گھر داری میں شریک ہو گئی ہے۔'' تائی نے تو اتنی سی بات کہی مگر حمنہ آپی کو تو موقع مل گیا۔

''پتا نہیں کیوں شوق ہو رہا تھا اس کو۔ اور اب جی چرانے لگی ہے جو کام بتاؤں مجھے دوبارہ خود کرنا پڑتا ہے نجانے کیوں اسے عقل نہیں آتی۔''

وہ ہنسی ہنسی میں کہتیں اور سب کی نظروں میں بسمہ کو پھوہڑ بنا دیتیں۔

''بس بیٹا! اپنی اپنی عقل ہوتی ہے۔ اب دیکھو۔ پچھلے تین سالوں سے گھر سنبھالا ہوا ہے۔ مجال ہے کہیں کوئی غلطی یا کمی ہو۔'' حمنہ آپی کی تعریف ماما کے لیے تو اولین فریضہ تھی جس کی ادائیگی میں ذرا سی

تاخیر بھی کبیرہ گناہ تھی۔

☆☆☆

میرا میٹرک مکمل ہوگیا تھا اوراب کالج میں ایڈمیشن لینا تھا۔ بسمہ آپی کی گریجویشن کا پہلا سال تھا پاپا نے میرا بھی اسی کالج میں ایڈمیشن کروادیا کہ آنے جانے میں سہولت رہے گی۔ ہم دونوں بہنیں ہنسی خوشی اکٹھے آتیں جاتیں اور گھر میں بھی تقریباً ساتھ ساتھ ہوتیں، ماما اور حمنہ آپی کے لیے ہم دونوں ہی اتنی قابل اعتنا نہیں تھیں اور ہم بھی سارا وقت اپنی تعلیمی سرگرمیوں میں مصروف رہتیں۔ گھر کے سارے معاملات حمنہ آپی کی مرضی اور مشورے سے ہوتے تھے، گویا ہمارا ہونا نا ہونا ایک برابر تھا۔

ایک دن کسی جاننے والے کے توسط سے ایک رشتہ آیا (یقیناً حمنہ آپی کے لیے) لیکن جب پتا چلا کہ لڑکا سعودی عرب میں ٹرالر چلاتا ہے اور بالکل ان پڑھ ہے اوراتنی بڑی فیملی کو اکیلا پال رہا ہے۔ انہیں اپنا مستقبل بکھیڑوں کی نذر ہوتا دکھائی دیا تو انہوں نے بڑی چالاکی سے رشتے کا رخ بسمہ آپی کی طرف موڑ دیا۔

''ماما! بسمہ کی عمر بھی شادی کی ہے اوراس کے لیے یہ رشتہ بالکل موزوں رہے گا۔ اب یہ تو کسی کام کاج کی ہے نہیں، چلیں وہاں ساس نندیں ہیں جنہوں نے پہلے سے گھر سنبھالا ہوا ہے ہماری بسمہ پر کوئی ذمہ داری بھی نہیں آئے گی سو میری مانیں تو بسمہ کا رشتہ یہاں کردیں۔''

حمنہ آپی کوئی بات کہیں اور ماما اسے اہمیت نہ دیں یہ تو ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ پاپا کے سامنے بھی حمنہ آپی کے نمبر بن گئے۔ ''ماشاء اللہ بڑی سمجھ دار ہے ہماری حمنہ۔ اللہ ایسی اولاد ہر کسی کو دے۔''

پھر کیا تھا بسمہ آپی کے احتجاج کے باوجود رشتہ کردیا گیا اور ساتھ ہی شادی کی تیاریاں بھی شروع ہوگئیں۔''

جہیز میں کیا کیا دینا ہے..... شادی کے جوڑے کھانے کا مینیو حتیٰ کہ بسمہ آپی کا برائیڈل ڈریس تک حمنہ کی مرضی سے آیا۔

کیا بسمہ آپی کی کوئی مرضی یا خواہش نہیں..... کیا ان کی اس گھر میں کوئی حیثیت نہیں۔

میرے ذہن کی سرزمین پر ایک سوچ ابھری تھی اور پھر روز کا معمول بن گیا نجانے کیوں میں اس گھر میں حمنہ آپی اور بسمہ آپی کا موازنہ کرنے لگ گئی تھی۔

''ماما! یہ بسمہ کی حالت دیکھیں۔'' حمنہ آپی قہقہے مارتی صحن میں آئیں اور انہیں مخاطب کیا۔

ان کی پوری بات سننے کے لیے ماما نے بھی مشین روک دی۔

''بارات دروازے پر کھڑی ہے اور لڑکی چلی ہے۔ گھر گرہستی سیکھنے، روٹی بنانا سیکھ رہی ہے پاگل۔''

ماما بھی سن کر مسکرانے لگیں مگر مجھے حمنہ آپی کا یہ انداز گفتگو بہت ناگوار گزرا لیکن میں پھر بھی انہیں کچھ کہہ نہیں سکی تھی۔

شادی کی رسومات بخیر وخوبی انجام پا گئیں۔ ارسلان بھائی بہت اچھے شوہر ثابت ہوئے۔ ان کی سنگت نے ایک دم بسمہ آپی کی زندگی میں رنگینیاں بھر دیں۔ وہ شروع کے تین مہینوں میں کبھی رہنے نہیں آئی تھیں ہاں وقتاً فوقتاً ملنے آجاتی تھیں۔

ارسلان بھائی کے جانے کے بعد بھی شاذ ونادر ہی چکر لگاتیں۔ میں ان کے کم آنے پر خفگی کا اظہار کرتی ماما مجھے سمجھاتیں کہ وہ اپنے گھر میں اگر خوش ہے تو ہمیں اور کیا چاہیے۔

☆☆☆

میرے کالج کی چھٹیاں تھیں۔ میں گھر میں فارغ پڑے پڑے اکتا جاتی۔ میں نے یوٹیوب سے کچھ کھانے پکانے کی تراکیب ڈاؤن لوڈ کیں۔

''چکن کچوری۔'' ہوں اس کے ہی سارے لوازمات کچن میں ہیں سو یہی ٹرائی کرنی چاہیے میں نے

سارے کچن کا جائزہ لے کر کچوریاں بنانے کا فیصلہ کیا۔
تیرے عشق نے ماری، کڑی کچ دی کنواری
دے میں چلے دے پہاڑاں والی شام وے منڈیا
میں اپنی ہی دھن میں گنگناتی تیزی سے ہاتھ چلاتی میدے کے چھوٹے چھوٹے پیڑے بنا رہی تھی۔ برتنوں کی کھٹ پٹ سن کر ہی حمنہ آپی شاید جاگ گئی تھیں اور سیدھی کچن میں آ گئیں۔
''لو جی..... ادھر تو نئے نئے کام شروع ہیں۔''
میری طرف دیکھتے ہی وہ فوراً بولیں۔
''پہلے ہی بہت مہنگائی ہے نجانے کیسے مہینہ پورا کرتی ہوں میں اس راشن میں، اب اگر اس طرح کے تجربات ہونے لگے تو پھر تو مہینے کے آخری دن آئل کی جگہ پانی میں ہی ابلی سبزیاں نصیب ہوا کریں گی۔''
وہ پیر پٹختی غصے سے جھلائی برآمدے میں پڑی کرسی پر بیٹھ گئیں۔ ماما بھی شور سن کر باہر آ گئیں اور حمنہ آپی کے مرچ مسالہ لگانے پر وہ بھی مجھے سنانے لگیں۔
''تمہارا بھلا کیا کام ہے ادھر۔ جاؤ اپنا کام کرو جا کر عقل نام کی چیز نہیں اور لگیں کھانے پکانے۔''
اس وقت آپی کیوں روئی تھیں یہ مجھے آج پتا چلا تھا۔
دراصل حمنہ آپی نے چولہے کو اپنی جاگیر سمجھ لیا تھا، وہ نہیں چاہتی تھیں کہ کوئی ان سے بڑھ کر کوئی جوہر دکھائے اور خاندان میں اس کی تعریف ہو۔ لیکن کوئی کون بسمہ آپی اور میں تو ان کی سگی بہنیں تھیں لیکن ہمیں ان سے زیادہ اہمیت ملے یہ انہیں قطعی گوارا نہ تھا اسی لیے انہوں نے ہمیشہ گھر کے ہر معاملے سے ہمیں دور ہی رکھا تھا۔
اف! یہ خونی رشتے بھی اتنے خودغرض ہوتے ہیں یہ مجھے آج پتا چلا تھا۔
اگلے چھ ماہ کے اندر بسمہ آپی سعودی عرب چلی گئیں۔ ہمیں تو تب پتا چلا جب وہ جانے سے ایک رات پہلے ملنے آئیں۔ میں ان کے دور جانے سے بہت اداس ہو رہی تھی اور خفا بھی کہ اچانک کیوں بتایا۔ ماما پاپا البتہ بہت خوش تھے اور حمنہ آپی بھی اوپر سے تو خوش ہی تھیں۔ اب اس خوشی کے پیچھے مقصد کیا تھا یہ تو وہ جانتی تھیں۔

ان کے جاتے ہی ماما کو احساس ہوا کہ حمنہ کی شادی میں مزید تاخیر نہیں کرنی چاہیے۔ عذرا خالہ (رشتے کرانے والی) نے ایک جگہ رشتہ طے کروا دیا۔ لڑکا خوب صورت، پڑھا لکھا اور بزنس مین تھا فیملی تو ان کی بھی اچھی خاصی بڑی تھی مگر پیسے کی فراوانی تھی۔
ہم سب بہت خوش تھے لیکن اس خوشی نے بھی ہمیشہ کی طرح حمنہ آپی کے غرور میں اضافہ کیا۔ رعونت، خود پسندی، غرور تو پہلے ہی ان میں تھا اور یہ شاید ماما کے انہیں حد سے زیادہ اہمیت دینے کی وجہ سے ہی ہوا تھا مگر اب تو ان کے لب و لہجے میں ہر کسی کے لیے حقارت تھی۔ مجھے ابھی بھی گھر کے معاملات اور کچن میں مداخلت کی اجازت نہ تھی۔ میرا بھی دل چاہتا میں کوئی کھانا پکاؤں اور ماما پاپا میری بھی تعریفیں کریں لیکن حمنہ آپی کے ہوتے ایسا ممکن نہ تھا۔
سوئے اتفاق ایک دن دونوں بازار میں کافی لیٹ ہو گئیں، میں نے موقع غنیمت جان کر جلدی سے چکن پلاؤ بنانے کے لیے چاول بھگو دیے اور پھر پلاؤ دم پر تھا جب وہ گھر لوٹیں۔
میں نے جلدی سے رائتہ سلاد بھی بنا لیا۔ وہ شاپنگ سے تھکی ہاری لوٹی تھیں سو کمرے میں گھس گئیں۔ خوشبو تو سارے میں پھیلی تھی لیکن نجانے کیوں آج انہوں نے توجہ نہ کی تھی۔ تھوڑی دیر میں ہی پاپا آ گئے۔ میں نے بڑی نفاست سے دسترخوان سجایا۔ وہ تو محض ہانڈی روٹی کر کے بھی جتانا اپنا فرض سمجھتی تھیں اور آج کھانے کے ساتھ سلاد، چٹنی رائتہ سب دیکھ کر پاپا نے مجھے خوب سراہا اور جیسے ہی سب نے ایک نوالہ لیا۔ ماما کے چہرے پر پھیلتی مسکراہٹ سے واضح ہو رہا تھا کہ کھانا ان کی توقع سے بڑھ کر ہے لیکن میرے اندر چھناکے سے کچھ ٹوٹا تھا۔ دل ان کے منہ سے تعریف کے دو بول سننے کو بے تاب تھا مگر حمنہ آپی کی محبت نے انہیں اس طرح اپنے حصار میں لیا تھا کہ وہ اس وقت میری تعریف کر کے گویا ان کی اہمیت کم کرنے کا گناہ نہیں کر سکتی تھیں۔
یہ سب کیا ہے؟ کیوں ہے..... بہت سارا وقت

انہیں سوالوں کے جواب کھوجتے گزر گیا تھا۔ وہ بیاہ کر اپنے گھر جا چکی تھیں اور اب کچن کا کنٹرول ماما کے ہاتھ میں تھا۔ میں تو خود ہی ان سے دور رہتی خود کو اپنی کتابوں میں مصروف رکھتی۔

چند ماہ نہیں گزرے تھے کہ ماما کی کوئی جاننے والی آئیں اور مجھے دیکھتے ہی اپنے بیٹے کے لیے رشتہ ڈال دیا۔ انہوں نے میری زندگی کے اس اہم ترین فیصلے کا مشورہ بھی حمنہ آپی سے کیا اور بالآخر بسمہ آپی کی طرح میں بھی ایک پھوہڑ لڑکی، جسے روٹی بھی نہیں بیلنا آتی تھی۔ پیا گھر سدھار گئی۔

☆☆☆

وقت نے پلٹا کھایا اور حمنہ آپی کو عرش سے فرش پر کر دیا۔ انوار بھائی ایک حادثے کا شکار ہو گئے۔ حمنہ آپی امید سے تھیں۔ یہ حادثہ ہم سب لوگوں کے لیے کسی قیامت سے کم نہیں تھا۔ آخری بیٹی کو چند ماہ پہلے رخصت کر کے ماما پاپا اب بہت پرسکون ہو گئے تھے کہ اب ان کے کندھوں پر کوئی بوجھ نہ رہا تھا مگر قدرت نے ایک بار پھر بہت بڑا بوجھ ان پر ڈال دیا تھا۔

وہ سگھڑ، عقل مند سلیقہ شعار تو بمشکل ایک ماہ سسرال کے ساتھ رہی تھیں اور پھر الگ ہو گئی تھیں، حمنہ آپی کی خود پسندی، رعونت، خود غرضی اور مغرور مزاج نے چند دن بھی سسرالیوں کو برداشت نہیں کیا تھا۔ اور اب وہ لوگ بھی انہیں اپنے ساتھ رکھنے پر بالکل آمادہ نہ تھے۔ انوار بھائی کا بزنس میں کتنا حصہ تھا یہ تو انہیں ہی معلوم تھا لیکن انہوں نے محض چند لاکھ آپی کو تھماتے گویا بڑا احسان کیا تھا اور وہ اپنا سامان سمیٹ کر ہمیشہ کے لیے ماما پاپا کے پاس آ گئی تھیں۔

☆☆☆

بسمہ آپی نے بہت کوشش کی مگر ہم دونوں بہنوں کی شادیوں پر نہ آ سکیں اور اب انوار بھائی کی موت کا سن کر ان سے رہا نہ گیا تھا اور انہوں نے اسی ہفتے آنے کی اطلاع دی تھی۔ میں تو بہت خوش تھی کیونکہ ان کے دونوں بچے بھی صرف اسکائپ پر ہی دیکھے تھے۔ زیان نے مجھے خوب دل کھول کر شاپنگ کرائی میں نے اپنی پسند سے ان کے لیے ڈھیروں کھلونے اور کپڑے بھی لیے۔ وہ جیسے ہی پاکستان پہنچے۔ اگلے دن ماما کی طرف گئے اور پھر اسی شام میرے گھر آنے کا پروگرام تھا کیونکہ انہوں نے ماما کے ہاں سے میری طرف آنا تھا۔ سو میں نے ماما لوگوں کو بھی مدعو کر لیا۔

بلیک کلر کے ایمبرائیڈڈ ڈیزائنر سوٹ کے ساتھ ماما (زیان کی ماما) نے مجھے فل میک اپ کرنے اور جیولری بھی پہننے کا کہا تھا۔

''میری شادی کو پانچواں مہینہ تھا لیکن وہ آج بھی مجھے دلہن کی طرح ہی سجنے کا کہتیں، زیان اپنے گھر کا اکلوتا اور بڑا بیٹا تھا اور میں اکلوتی بہو شاید اسی وجہ سے ابھی تک میرے لاڈ اٹھائے جا رہے تھے۔ میں اللہ کا لاکھ شکر ادا کرتی تھی کیونکہ میرے سسرالی بہت محبت کرنے والے لوگ ہیں۔

شام کو سب لوگ آئے۔ بسمہ آپی اور میں بار بار گلے ملتے تو ارسلان بھائی ہمارا مذاق اڑانے لگ گئے جس پر باقی سب مسکرانے لگے۔ وہ میرے لیے بہت سے تحائف لائی تھیں اور میں نے سب کی موجودگی میں یہ کہہ کر اپنی نند کے حوالے کیے کہ بعد میں ہم سب اپنی اپنی پسند کی چیز لے لیں گے۔

میری اس بات پر زیان کی ماما بے ساختہ ہی میرا منہ چومنے لگیں۔

''ٹیبل پر انواع و اقسام کھانے تھے، بسمہ آپی اور ارسلان بھائی نے ہر ہر کھانے کی دل کھول کر تعریف کی۔ ماما، پاپا اور حمنہ آپی بھی قائل ہوتے نظر آئے۔

''آئمہ! یہ کھانا کس ہوٹل سے منگوایا ہے؟''

بسمہ آپی پوچھے بنا نہ رہ سکیں۔

''ارے نہیں بیٹا! ہوٹل سے کیوں۔ جب گھر میں اتنی بچیاں ہیں پھر کھانا باہر سے منگوانے کی کیا ضرورت۔ یہ بریانی میری رانیہ نے بنائی ہے..... یہ چکن کڑاہی میری آنیہ نے..... یہ کھیر، سلاد، کباب اور نرم نرم پھلکے میری دانیہ نے اور یہ مٹن قورمہ جس کی تم لوگ سب سے زیادہ تعریف کر رہے ہو اور یہ رشین سیلڈ یہ میری یمنیٰ نے، میری سب بچیاں ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔''

سب نے حیرت سے میری ساس کو دیکھا تھا۔ میری آنکھ سے موتی گرا تھا۔ میں نے کسی کی نظر پڑنے سے پہلے صاف کیا تھا۔

''میرے لیے تو سب بیٹیاں برابر ہیں۔ میں نے تو سب کو گھر داری اور سلیقہ شعاری کی تربیت دی ہے۔ وہ ماں ہی کیا جو اولاد کی تربیت میں تفریق سے کام لے۔ اور کسی ایک کو اول پوزیشن دلوانے کے چکروں میں دوسروں کو نکما اور نالائق بنا دے۔''

زیان کی ماما بول رہی تھیں اور میری ماما نہ جانے کیوں پشیمان ہو رہی تھیں؟

والدین اپنی اپنی استطاعت کے مطابق جہیز تو بیٹی کو دے دیتے ہیں مگر سسرال میں اچھی تربیت اور گھر گرہستی کے گر ہی کام آتے ہیں۔ ویسے بھی اولاد میں تفریق کی جائے تو منفی جذبات پیدا ہوتے ہیں۔

اور اب میری ساری توجہ اپنی بیٹی یمنیٰ کی طرف ہے لیکن مجھے خوشی ہے کہ اس پر مجھے زیادہ محنت نہیں کرنی پڑے گی کیونکہ وہ تو مجھ سے صرف ریسپی پوچھتی ہے اور پھر اے ون بنا لاتی ہے، اللہ نے مجھے ساری بیٹیاں ہی سگھڑ اور سلیقہ شعار دی ہیں۔''

ماما (ساس) اپنی تقریر ختم کر چکی تھیں لیکن جو کیفیت اس وقت میری تھی وہ صرف بسمہ آپی ہی سمجھ سکتی تھیں۔

ماما کے یہ چند جملے کسی کے لیے تعریف تھے تو کسی کے لیے ندامت، تو کسی کو آئینہ دکھا گئے تھے مگر میرے دل میں صرف ایک جذبہ تھا۔ صرف جذبہ شکر، میں اپنے رب کا شکر ادا کر رہی تھی کہ اس نے میرے دامن میں دنیا جہاں کی نعمتیں بھر دی تھیں۔ اور ماما کے چہرے پر پھیلی پشیمانی اس بات کی شاہد تھی کہ وہ اپنے انداز تربیت کی تفریق پر یقیناً نادم ہیں۔

اگر ماما نے بھی ہماری تربیت میں فرق نہ رکھا ہوتا تو میں اور بسمہ آپی بھی گھر داری سسرال جا کے نہ سیکھتیں۔ یہ ان کا انداز تربیت ہی تھا جس نے حمنہ آپی کے مزاج میں خود پسندی اور دوسروں کے لیے حقارت پیدا کر دی تھی اور ہمارے اندر احساس کمتری۔

☆

ناولٹ

صدف آصف

دائرے کی قید میں

چنیدہ بیگم نے پہلے دائیں پھر بائیں گردن گھمائی اور میدان صاف دیکھتے ہوئے ہاتھ میں پکڑے ہوئے لفافے کو مٹھی میں دبایا اور عجلت میں بیٹے کے کمرے کی طرف قدم بڑھادیے۔

وہ کل شام سے تفکر کا شکار تھیں، جب اشعر یوسف اپنے آفس کے چند ملازموں کو نکالے جانے کے بارے میں افسردگی سے بتارہا تھا۔ وہ تھوڑا پریشان ہوگئیں کیوں کہ اشعر اپنی نوکری کے حوالے سے عدم تحفظ کا شکار ہورہا تھا۔

رات بھر سوچنے کے بعد وہ بیٹے کی محبت میں شوہر سے وعدہ خلافی پر بھی آمادہ ہوگئیں۔ کچھ سوچ کر وہ اپنی دھن میں مگن آگے بڑھیں۔

''اس سے پہلے کہ بڑے میاں کو خبر ہوجائے، اشعر کی مشکل حل کردیتے ہیں۔'' وہ سر جھٹک کر آگے بڑھیں۔

''ایک منٹ۔ ایک منٹ۔ ذرا ادھر تو آیئے۔'' پردے کے پیچھے سے ایک ہاتھ نے ان کا بازو دبوچ لیا۔

''اوئی..... اللہ!'' چنیدہ کے منہ سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی مگر یوسف علی کی آواز پر جان میں جان واپس آئی۔

''یہ کیا بچپنا ہے؟'' ان کے گھورنے پر بھی وہ مسکرائے۔

''نہیں بیوی! یہ تو دل کو دل سے راہ ہوتی ہے، ویسے سچ بتائیں، کیا آپ اپنا وعدہ توڑنے نہیں چلی تھیں؟''

''عمر گزر گئی مگر آپ کی عجیب وغریب حرکتیں نہ گئیں، ڈر کے مارے ہماری جان نکل جاتی تو؟'' چوری پکڑی جانے پر بات بدلنے کی کوشش کی گئی۔

''اللہ نہ کرے۔ مریں آپ کے دشمن۔ ابھی تو آپ نے دنیا گھومنی ہے۔ اپنی پسند کی چیزیں خریدنا ہیں..... اور..... اور.....'' یوسف علی نے انگلیوں پر گنوانا شروع کیا مگر چنیدہ نے بات کاٹی۔

''بس..... بس..... ہمیں تو معاف ہی

کردیں۔"

"کیا یاد کریں گی۔ جائیں معاف کیا مگر پہلے یہ لفافہ ہمیں واپس کردیں۔" بیوی کو مامتا کے ہاتھوں مجبور ہوتا دیکھا تو سخت لہجہ میں کہا۔

"توبہ! آپ کی آنکھوں میں تو دوربین فٹ ہے۔" وہ بلبلائیں مگر یوسف علی نے لفافہ چھین کر ہی دم لیا۔

"ہماری تو گزر گئی مگر اس بے چارے کا تو سوچیں۔ چھوٹے چھوٹے بچوں کا ساتھ ہے۔" اداسی سے سمجھانا چاہا۔

"بیوی! ان لوگوں کا ہی سوچتے ہوئے گزری ہے، اس بار تو اپنے بارے میں سوچنا ہے۔" سر پہ ہاتھ مار کر نفی میں سر ہلاتے ہوئے ان کا بازو تھام لیا اور گھسیٹتے ہوئے کمرے کی جانب بڑھ گئے۔ ان کے ہاتھ سے لفافہ لے کر واپس پرس میں رکھ دیا۔

☆☆☆

"اماں میں ذرا باہر جارہی ہوں، آپ پلیز ناشتہ کرلیجیے گا۔" ہما نے ہاتھ میں پکڑی لسٹ پر نگاہ دوڑائی اور عجلت میں بتایا۔

"خیر تو ہے بچے! کہاں جارہی ہو؟" چنیدہ بیگم نے عام سے لہجے میں پوچھا مگر بہورانی ساس کی تفتیش پر تپ گئیں۔

"آپ کو کیا بتاؤں اماں؟ میری جان کو سو جھمیلے لگے ہوئے ہیں، آپ کے بیٹے صاحب تو مہینے کی پہلی تاریخ کو ہتھیلی پر چند پیسے رکھ کر بری الذمہ ہوجاتے ہیں۔ ویسے بھی جب سے آپ لوگ یہاں آئے ہیں، مہمان نوازی کافی بڑھ گئی ہے۔ بسکٹ، نمکو اور جوس وغیرہ ختم ہوگئے ہیں، اس لیے سوچا جا کر لے آؤں۔" بہو کا جتاتا ہوا لہجہ ان کے دل پر ٹھک کر کے لگا۔

"بہو! مہمان داری کی تو تم فکر نہ کرو، ایسا کرو یہ لسٹ ہمیں دے دو، ہم اشعر کے ابا سے کہہ کر سب کچھ وافر مقدار میں منگوادیں گے۔" وہ ہمیشہ اپنے ہاتھوں سے خرچ کرنے والی خاتون تھیں۔ تڑپ کر بولیں۔

"اماں! میرا وہ مطلب نہیں تھا، بس آپ نے پوچھا تو بتانا پڑا۔ میں سب لے آؤں گی۔" ساس کی تنک مزاجی پر اس نے صفائی دی۔

"مجھے تو ویسے بھی باہر جانا تھا، آج عیناں کے اسکول میں پیرنٹس ٹیچر میٹنگ ہے، اس کے بعد ارسلان کے یونیفارم کی شرٹ پھٹ گئی ہے، وہ بھی لانی ہے، آپ تو جانتی ہیں، اس دور میں بچوں کو پالنا، پڑھانا لکھانا کوئی آسان کام تھوڑی رہا۔"

"ہاں بیٹا۔ ٹھیک کہہ رہی ہو، ہم نے تو جیسے کبھی بچے پالے ہی نہیں ہیں، اسد اور اشعر ہمیں یونہی پلے پلائے مل گئے تھے، اب بھلا ہمیں ان باتوں کی کیا سمجھ۔" ان کے لہجے میں طنز اُتر آیا۔ ہما اشعر نے بڑی مشکل سے خود پر قابو پایا۔

"نہیں اماں! مگر آپ لوگوں کا زمانہ بہت اچھا تھا، نہ اتنی مہنگائی نہ اتنے فیشن، اور نہ ہی بچوں کے اتنے نخرے، آج کے بچے تو ماں باپ کو ایک ٹانگ پر نچائے رکھتے ہیں۔" بہو کی دلیلوں پر چنیدہ کا دل چاہا کہ اپنا سر پیٹ لیں۔

"تم لوگوں نے زندگی کو خود مشکل بنایا ہوا ہے اور الزام دھرتی ہو زمانے پر۔ ہونہہ۔" ساس نے دل میں سوچا ضرور مگر بدمزگی کے ڈر سے زبان بند رکھی۔

"اچھا خیر، اب میں نکلتی ہوں، آپ دروازہ اندر سے بند کرلیجیے گا اور اگر کوئی آئے تو ایک دم سے دروازہ نہ کھولیے گا، ویسے بھی یہاں چوری چکاری کا خطرہ لگا رہتا ہے۔" ہما ہدایت دیتی ہوئی باہر چل دی۔

یوسف علی ہاتھ میں تازہ اخبار تھامے کمرے میں داخل ہوئے تو بہو کی بات پر ان کے لبوں پہ طنزیہ مسکراہٹ بکھر گئی۔

"اے۔ لو، ہم کیا باؤلے ہیں جو ایسے ہی دروازہ کھول دیں گے؟"

"خیر تو ہے بیوی! کس نے آپ کو باؤلا بناڈالا؟" انہوں نے انجان بن کر پوچھا۔

"دیکھیں نا میاں صاحب! بہو ہمارے ساتھ ایسے سلوک کرتی ہیں، جیسے ہم گاؤں سے نہیں بلکہ کسی جنگل سے آئے ہیں۔" یوسف علی کو بہو کی زبان درازی سے زیادہ اشعر میاں کی خاموشی کا دکھ کھائے جارہا تھا۔

''ارے۔نہیں نہیں.....ایسی کوئی بات نہیں۔ اصل میں آپ شروع سے رانیوں کی طرح اپنی حویلی پر حکومت کرتی آئی ہیں، یہاں کا ماحول تھوڑا مختلف ہے شاید اس لیے زیادہ حساس ہوگئی ہیں۔'' انہوں نے دلاسا دینا چاہا۔

''ایسا لگتا ہے جیسے ہم بیٹے کے گھر نہیں کسی غیر کے یہاں آئے ہوئے ہوں۔'' ان کے درد پر یوسف علی کا دل چاہا ہاتھ پکڑ کر اس گھر سے باہر نکل جائیں مگر انہیں جلدی نہیں، بلکہ صحیح وقت کا انتظار تھا۔

☆☆☆

یوسف علی مڑ کر دیکھتے تو تھکن زدہ مسکراہٹ لبوں کو چھو جاتی، پلوں کے نیچے سے کتنا پانی بہہ چکا تھا، بیٹوں کے اعلا مستقبل کی خاطر اپنی پوری جوانی کڑی مشقت میں گزار دی۔ زمینوں کی دیکھ بھال اور فصلوں کی کٹائی میں مصروف رہنے کے باوجود، کبھی بچوں کے عیش و آرام میں کمی آنے نہ دی۔

اللہ تعالی نے چُن کر جیون ساتھی دیا۔ اپنے نام کے گنوں والی چنیدہ یوسف نے بھی اولاد کی تعلیم و تربیت کی خاطر سنہری دنوں کے ارمانوں کو تھپک تھپک کر سُلا دیا اور شوہر کے ساتھ شانہ بشانہ کھڑی رہیں۔ نوکروں کی فوج ظفر موج ہونے کے باوجود بچوں کے منہ سے نکلی چھوٹی سی خواہش بھی پوری کرنے کے لیے جان لڑا دیتیں۔ دونوں بیٹوں کو اعلا تعلیم حاصل کرنے کا بہت شوق تھا۔ وہ پسماندہ علاقے سے نکل کر ترقی یافتہ شہر میں قدم جمانا چاہتے تھے۔ میاں بیوی نے بنا شکوہ کیے تنہائی کو گلے سے لگا لیا اور ان کے خوابوں کی راہ میں رکاوٹ نہ بنے۔

پہلے بڑے ـــــ اشعر نے اعلا تعلیم حاصل کرنے کے لیے بڑے شہر کا رخ کیا، اس کے بعد چھوٹے اسد کے بھی پر نکل آئے وہ بھائی سے دو قدم آگے جاتے ہوئے باہر جا کر پڑھنے کی ضد لگا کر بیٹھ گیا۔ ان کے لیے یہ اتنا آسان بھی نہ تھا مگر چنیدہ کی خواہش پر یوسف علی نے زمین کا بڑا ٹکڑا بیچ کر اسد کو باہر بھیج دیا۔ وہ دونوں بوڑھے ماں باپ کو بھلا کر ان کے پیسوں سے اپنا مستقبل سنوارنے میں لگ گئے۔

گھر کی منڈیر پر بیٹھے پنچھیوں نے اچانک ایسی اُڑان بھری کہ پھر مڑ کر پیچھے نہیں دیکھا یا شاید فرصت ہی نہیں ملی۔ ایک شہر میں بس گیا تو دوسرے کو امریکا کی کشش نے اپنے حصار سے نکلنے نہ دیا۔

وہ دونوں اب بھی ماں باپ کو یاد کرتے مگر اس وقت جب انہیں پیسوں کی ضرورت ہوتی۔، یوسف علی سے اب اتنی محنت نہیں ہوتی تھی مگر وہ ان کی فیسیں اور دیگر ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے زمین بیچ بیچ کر پوری کرتے رہے۔ یہ سلسلہ بھی اس وقت رک گیا، جب وہ دونوں اپنے پیروں پر کھڑے ہوگئے اور نئی دنیا بسالی، اس کے بعد تو مہینے میں ایک بار کال کرتے اور سمجھتے، فرض پورا ہوگیا، تکلفاً پیسے بھیجنے کا پوچھا مگر یوسف علی کی انا نے گوارا نہیں کیا، ہمیشہ دینے والے ہاتھ اب لیتے کیسے، یوں وہ اپنی زندگیوں میں کھو گئے۔

گاؤں میں رہنے والے دونوں میاں بیوی نے اپنے مشن کے مکمل ہوتے ہی سکھ کا سانس لیا، اب جو فرصت ملی تو وقت کاٹے نہیں کٹتا۔ یوسف علی مرد تھے دوستوں میں وقت گزار کر دل بہلا لیتے مگر چنیدہ کے لیے بچوں کے بغیر رہنا ممکن نہ تھا۔ اصل سے سود پیارا کے مصداق انہیں پوتا پوتی کی یاد بھی بری طرح سے ستاتی تھی۔ وہ بچوں سے کبھی کبھی فون پر بات کرتیں تو ان کی ممتا کی پیاس کم ہونے کے بجائے بھڑک اٹھتی۔ جوانی تو بچوں کے بغیر گزار دی تھی مگر اب اپنا بڑھاپا ان کے ساتھ گزارنا چاہتی تھیں، بیٹوں سے حویلی لوٹ آنے کی التجا کی مگر ان کے پاس ہر بار سو بہانے ہوتے۔ چنیدہ کی اداسی بڑھتی جا رہی تھی، بیوی کا حال دیکھ کر یوسف علی کو اولاد کی ناخلفی پر بہت غصہ آتا مگر جوان اولاد سے کچھ بول کر اپنا بھرم نہیں کھونا چاہتے تھے۔

وہ بیوی کو بہلانے کے لیے پاکستان کی سیر پر چلنے کا کہتے مگر ان کا دل تو بچوں میں ہی اٹکا ہوا تھا۔ ایک دن چنیدہ نے عجیب سی خواہش کا اظہار کیا

کہ وہ لوگ ہمیشہ کے لیے شہر چلتے ہیں، اس کے بعد امریکا کا چکر لگا آئیں گے۔

یوسف علی کو بیوی کی بے قراری بہت تکلیف دیتی مگر وہ اس عمر میں بیٹوں کے محتاج ہونا نہیں چاہتے تھے۔ اس لیے بیوی کو پیار سے سمجھاتے.....

کہ بیگم اپنا کھونٹا مضبوط رکھیں، آپ حویلی کی رانی ہیں، وہاں گئیں تو اپنا بھرم کھو دیں گی۔

چنیدہ شوہر کی فرماں برداری میں چپ تو ہو گئیں، مگر سینے کی گھٹن بڑھتے بڑھتے دل کا درد بن گئی، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اچانک ہلکا سا اٹیک ہوا۔ یوسف علی کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ ایسی حالت میں بھی چنیدہ اپنے بیٹوں اسد اور اشعر کو پکارتی رہیں۔

ان کی اس حالت پر یوسف علی خود کو وفا شعار بیوی کا مجرم سمجھنے لگے۔ بہت سوچ بچار کے بعد اپنی انا اور ضد کو سائیڈ پر کیا، اور اپنی حویلی اور بچی ہوئی زمین بیچ باچ کر شہر جانے کا عندیہ دے دیا۔ یوسف علی کی رضامندی نے چنیدہ کو نئی زندگی بخش دی۔ جانے کی تیاری کی خوشی میں وہ بستر چھوڑ کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ یوسف علی نے کچھ سوچ کر بیٹے کو اپنی آمد کی اطلاع نہیں بھیجی۔ ایک دن صبح صبح اشعر کے گھر کے دروازے پر پہنچ کر مسکراتے ہوئے بہو کے تاثرات سے لطف اندوز ہوئے۔

☆☆☆

آہٹ پر یوسف علی اپنی سوچ کے دائرے سے باہر آئے اور سامنے سے آتے پوتے کی طرف دیکھا۔ ارسلان ہاتھوں میں بڑا سا پیالہ تھامے بے فکری سے منہ چلاتا ہوا ان کو بغور دیکھ رہا تھا۔ ہما نے بچوں میں عجیب سی عادت ڈالی ہوئی تھی۔ وہ کچھ بھی کھاتے، سامنے والے کو کبھی بھی صلاح نہیں مارتے یا پھر کھانے کی چیز لے کر لیک کر کمرے میں گھس جاتے۔ بچوں کا ایسے چھپ کر کھانا، انہیں شرمندہ کر دیتا۔

''دادا جان! کیا آپ لوگ اب ہمیشہ میرے گھر پر رہیں گے؟'' ارسلان نے پاپ کارن منہ میں ڈالتے ہوئے معصومیت سے پوچھا۔

''بری بات ہے بچے گھر ''تیرا..... میرا'' نہیں ''سب کا'' ہوتا ہے۔'' چنیدہ نے پوتے کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے پیار سے سمجھایا۔

''کیوں ارسل! تم یہ بات کیوں پوچھ رہے ہو؟'' یوسف علی کا ذہن بچے کی بات میں اٹک گیا تھا۔

''بھائی! مما نے منع کیا تھا نا۔ میں ان سے تمہاری شکایت لگاؤں گی۔'' عیناں نے بھائی کو گھورتے ہوئے دھمکی دی جو اس کے پیچھے آئی تھی۔

''سوری دادا جان! میں نہیں بتاؤں گا۔ ورنہ مما ماریں گی۔'' وہ گھبرا گیا۔

''چلو چھوڑو۔ ارسلان تم جا کر پڑھنے بیٹھو۔'' چنیدہ نے بچے کو ٹوکا اور میاں کو آنکھیں دکھائیں۔

''بھائی۔ چلو۔ ہوم ورک کرتے ہیں۔'' عیناں نے بھائی کو اٹھنے کا اشارہ کیا اور کمرے کی طرف بھاگ گئی۔

یوسف علی نے جیب سے اس کی پسندیدہ چاکلیٹ نکالی اور اس کا ریپر کھولتے ہوئے پوتے کو مسکرا کر دیکھا۔

''ہاں تو بیٹا! وہ..... تم کیا بتا رہے تھے؟'' چاکلیٹ اپنے منہ کی طرف لے جانے کی ایکٹنگ کی۔

ارسلان نے عیناں کے کمرے سے جانے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے دادا سے چاکلیٹ اچک لی اور جلدی سے منہ میں رکھا۔

''دادا جان۔ آپ لوگوں کی وجہ سے۔ ہماری نانو یہاں رہنے نہیں آسکتی ہیں۔'' ایک چاکلیٹ پر وفاداری بدلنے کے بعد راز اگلا۔

چنیدہ کا چہرہ فق ہو گیا، یوسف علی کی ہنسی سے غم جھلک اٹھے مگر بظاہر بشاشت سے پوچھا۔

''اچھا بھئی! وہ کیوں؟ کیا ہم لوگ اتنے ڈراؤنے ہیں؟''

''وہ..... آپ، مما کو تو نہیں بتائیں گے نا۔

پرامس کریں.....''

''پرامس۔ اب بتاؤ؟'' ایک اور چاکلیٹ جیب سے نکال کر اس کی طرف بڑھائی۔

''کل مما' نانو مما سے فون پر کہہ رہی تھیں کہ جب سے آپ لوگ آئے ہیں، پاپا ان کی کوئی بات نہیں مانتے، خوب لڑتے ہیں۔ آپ آ کر کیا کریں گی۔ یہاں تو ہر روز ڈرامے چلتے رہتے ہیں۔'' ارسلان نے دھیرے سے بتایا اور بھاگ کھڑا ہوا۔

''اوف۔ یہ آج کل کے بچے۔'' چنیدہ کی دکھ بھری خود کلامی۔ وہ فاتحانہ انداز میں گویا ہوئے۔

''بیوی! بتایئے۔ اب آپ کے کیا ارادے ہیں؟''

''آپ بھی کہاں بچوں کی باتوں میں آ رہے ہیں۔ جانے بہو نے کیا کہا اور ارسل نے کیا سنا؟'' چنیدہ نے شاید اپنی ضد کا بھرم رکھا۔

''چلیں، ٹھیک ہے مگر۔ اپنا وعدہ یاد رکھیے گا۔'' یوسف علی نے تنبیہ کی۔

''جی اچھا۔'' وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بڑی لاچارسی دکھائی دیں۔

''ویسے ہمیں آپ سے ایسی عقل مندی کی امید نہیں۔'' ان کے چھیڑنے پر بھی چنیدہ کا موڈ بجھا بجھا ہی رہا۔

''آپ ابھی تیل دیکھیں اور تیل کی دھار..... جب تک ہم نہ کہیں منہ سے بھاپ بھی نہ نکالیے گا۔''

یوسف علی کو اپنے اندازوں پر یقین تھا، اس لیے سمجھاتے ہوئے چھڑی اٹھا کر باہر واک کرنے نکل گئے۔

''یوسف علی! آپ کی جیت پر ہمیشہ خوشی منانے والی پہلی بار آپ کو ہارتا دیکھنا چاہتی ہے۔'' چنیدہ نے شوہر کی پشت کو گھورتے ہوئے دل سے دعا کی۔

☆☆☆

دونوں میاں بیوی کی بیٹے کے گھر اچانک آمد پر پہلے تو سب نے بڑی خوشی کا اظہار کیا مگر ایک ہفتے

بعد جب یوسف علی نے بتایا کہ وہ ہمیشہ کے لیے یہاں آگئے ہیں تو ان لوگوں کے رویے میں آئی گرم جوشی مفقود ہونا شروع ہوگئی۔ خاص طور پر ہما کو ساس سسر کے یہاں شفٹ ہونے کا سن کر ہارٹ اٹیک آنے لگے۔ وہ تو شاید بہانے سے انکار کر دیتی مگر اشعر نے بیوی کو سختی سے سمجھا دیا کہ اس معاملے پر کوئی بحث نہیں ہوگی۔

ہما نے برداشت سے کام لیا ورنہ شوہر کا طعنہ سننے کو مل جاتا کہ ''تمہاری ماں تو ہر ہفتے بیٹی کو یاد کرتی یہاں آجاتی ہیں، مگر میرے والدین اتنے سالوں میں پہلی بار یہاں آئے ہیں اور تم سے برداشت نہیں ہو رہا۔''

ہما جانتی تھی کہ اشعر ماں باپ کے معاملے میں اسے بالکل رعایت نہیں دے گا۔ شوہر کی سختی کی وجہ سے وہ ویسے تو کچھ کہہ نہیں سکتی تھی مگر دوسروں پر رکھ رکھ کر سنانے سے باز نہیں آتی۔

چنیدہ نے دنیا دیکھ رکھی تھی، بہو کے من میں پلنے والی باتوں سے بخوبی واقف تھیں، مگر اتنے سالوں کے بعد بیٹے کے ساتھ رہنے کا سکھ ملا تو وہ جانتے بوجھتے بہت ساری باتوں کو نظر انداز کرتی چلی گئیں۔ اسی لیے وہ کام بھی بخوشی کر لیتیں جو اپنی حویلی میں کرنے کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔ ویسے بھی شوہر کے ساتھ جو ضد باندھی تھی، اس سے وہ اتنی جلدی دست بردار نہیں ہونا چاہتی تھیں۔ مگر یوسف علی اس ماحول میں بالکل ایڈجسٹ نہیں کر پا رہے تھے۔ کئی بار ان کے کانوں میں بہو کی تلخ باتیں پڑیں مگر وہ چنیدہ کی خوشی کی خاطر انجان بنے رہے۔ دکھ اس وقت بڑھ جاتا جب ہما، پوتا پوتی کو ان دونوں کے خلاف بھڑکاتی۔

یوسف علی نے ایک بار سوچا بھی کہ اشعر کو بٹھا کر صاف بات کر لیں مگر بیٹا کمانے کے چکر میں صبح کا نکلا رات گئے گھر میں گھستا، کھڑے کھڑے سلام دعا کے بعد تھکن سے بند ہوتی آنکھوں سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ جاتا۔ اس کے پاس ماں باپ تو کیا شاید خود کے لیے بھی وقت نہیں بچتا تھا۔ وہ چپ چاپ بیٹوں کی نالائقی پر کڑھتے رہتے۔ یہاں آنے سے پہلے ہی یوسف علی کو حالات کا ادراک تھا مگر بیوی کا دل رکھنے کی خاطر یہ کڑوا گھونٹ پیا اور کچھ سوچ کر ہونٹوں پر چپ کے پہرے بٹھا دیے۔ وہ اس دن کے انتظار میں تھے جب چنیدہ خود ان سے یہاں سے چلنے کا کہیں، اس سے پہلے انہیں کچھ انتظامات بھی کرنے تھے۔ اس لیے انہوں نے اپنے پرانے دوست چوہدری سلمان سے چپکے چپکے بات چیت شروع کر دی تھی۔

☆☆☆

چنیدہ نے خود کو گھر کے کاموں میں مصروف کر لیا، شاید اس طرح ہما کے چہرے پر بننے والے عجیب و غریب نقش و نگار میں کمی واقع ہو جائے۔ نئے معمولات میں وہ مگن ہو گئیں تاہم چند دنوں میں ہی یوسف علی بُری طرح اُکتا گئے تھے۔ اشعر انہیں کہیں تنہا جانے ہی نہیں دیتا تھا۔ وہ گاؤں کے معتبر زمین دار تھے، ہر وقت ان کی بیٹھک میں رونق میلا لگا رہتا، زیادہ دل گھبراتا تو کھلی فضاؤں میں نکل جاتے، رات کو اپنے پرانے دوستوں کے ساتھ کچہری لگاتے تو وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلتا۔ یہاں آتے ہوئے دل میں بڑے ارمان تھے، بیٹے کی گاڑی میں بیٹھ کر پورا شہر گھومیں گے۔ مہنگا اور آرام دہ جوتا خریدیں گے۔ اچھی سی واسکٹ سلوائیں گے، ایک مہنگی گھڑی خریدیں گے، پر کس کے پاس ان کے لیے اتنا ٹائم تھا؟ وہ دل مسوس کر رہ جاتے۔

''بیوی کو صاف بتا دوں گا کہ تمہاری اولاد کے ساتھ میرا گزارا مشکل ہو رہا ہے۔'' یوسف علی نے ہونٹ بھینچ کر سوچا اور ہاتھ میں پکڑے ہوئے ریموٹ سے ٹی وی آن کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہے۔

''ہاہاہا..... دادا جان! یہ کیا کر رہے ہیں؟''

ارسلان ہاتھ میں بیٹ بال پکڑے ہوئے کمرے سے نکلا تو اس نے دادا کی حرکت پر ایک

قہقہہ مارا۔
''تم کیوں ہنس رہے ہو؟ دیکھ نہیں رہے، ٹی وی آن کررہا ہوں۔'' انہوں نے پوتے کو گھورا۔
''کیا..... دادا جان! آپ نے ریموٹ الٹا پکڑا ہوا ہے، پھر یہ کیسے چلے گا۔'' اس نے ٹی وی آن کرتے ہوئے مذاق اڑایا۔
''آں..... جب ہی تو میں کہوں..... اصل میں چشمہ نہیں لگایا ہوا ہے نا۔ اچھا۔ سنو۔'' وہ بوریت دور کرنے کے لیے پوتے سے مخاطب ہوئے مگر اس نے لاپروائی سے بال اچھالی اور باہر نکل گیا۔
''کیا دیکھ رہے ہیں؟'' چنیدہ نے لاؤنج میں داخل ہوکر شوہر کی طرف چشمہ بڑھاتے ہوئے پوچھا۔
''پتا نہیں بیوی! کچھ دیکھنے کی کوشش کررہا ہوں، ساری زندگی اتنی مصروفیت میں گزری کہ اپنی پسند کی ہر چیز سے دور رہا ہوں، بچوں کی شہر جاکر پڑھنے کی خواہش، ان کی فیسوں اور ہاسٹل کے خرچے، اس کے بعد اسد میاں کی امریکا جاکر پڑھنے کی ضد پوری کرنے کے چکر میں خود گھن چکر بنا رہا۔ اب ایک دم سے جو یہ فراغت ملی ہے تو کچھ سمجھ میں ہی نہیں آرہا کہ کیسے ساری خوشیاں ایک ساتھ سمیٹ لوں۔''
یوسف علی کی بھرائی ہوئی آواز پر چنیدہ کا دل بیٹھنے لگا، وہ اپنی نم آنکھوں کو دوپٹے کے پلو سے پونچھتے ہوئے بولیں۔
''ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ آپ نے محنت بھی تو بہت کی ہے۔'' بیوی کا کاندھے پر رکھے ہاتھ کا تسلی بھرا لمس انہیں سکون دے گیا۔
بچوں کو سنانے کے لیے ان بوڑھا بوڑھی کے پاس قربانی کی ایک طویل داستان تھی مگر سننے والوں کو فرصت ہی نہیں تھی۔ کہنے کو تو ان کے دو دو گھر تھے ایک یہاں اور دوسرا امریکا میں مگر شاید ایک میں بھی اتنی گنجائش نہیں تھی کہ بوڑھے ماں باپ کو جگہ مل پاتی، یا شاید گھر بڑے ہونے کے باوجود دل چھوٹے پڑ گئے تھے۔ اسد سے جب بھی فون پر بات ہوتی، وہ ان کی سننے کی جگہ اپنی پریشانیوں کی ایسی طویل فہرست پکڑا دیتا کہ ان کے منہ پر قفل لگ جاتے۔

☆☆☆

چھٹی کے دن چنیدہ نماز سے فارغ ہونے کے بعد کچن میں گھس گئیں، بہو بیگم تو دیر سے اٹھتی تھیں، انہیں بھوک لگ رہی تھی، مگر ڈبل روٹی کھا کھا کر منہ بدمزہ ہونے لگا تھا، کچھ سوچ کر الماری سے اصلی گھی کا ڈبہ نکالا جو وہ اپنے ساتھ لائی تھیں، گھی میں کشمش بادام ڈال کر مزیدار سوجی کا حلوہ بنایا، ساتھ میں نرم ہاتھوں سے گھی لگا کر آٹا گوندھا اور سب کے لیے پرت والے پراٹھے اور چھولے کی ترکاری پکانے کے بعد ٹیبل پر ناشتہ لگا دیا۔ اس کے ساتھ ہی پُرجوش آواز میں سب کو بلایا۔
''چلو بچوں۔ مزے دار گرما گرم ناشتہ تیار ہے، جلدی سے آجاؤ''۔ وہ سب خوشی خوشی ٹیبل کے گرد جمع ہوگئے اور کھانا شروع کردیا۔ اشعر نے بہت دنوں بعد ماں کے ہاتھوں کا پکا کھایا تو اتنی تعریفیں کیں کہ ہما کا منہ بن گیا۔
''عیناں! بچے تم کیوں نہیں کھا رہیں؟'' وہ جوش میں پوتی کی پلیٹ میں پراٹھا ڈالنے لگیں۔
''سوری دادی اماں۔ مجھے پراٹھا پسند نہیں ہے۔'' عیناں نے ماں کے اشارے پر ناک چڑھائی اور فریج سے بریڈ لے آئی۔
''کیوں بیٹا! ایک بار کھا کر تو دیکھو۔ تمہاری دادی اماں نے بہت مزے کا ناشتہ بنایا ہے۔'' یوسف علی سے بیوی کا اترا ہوا چہرہ دیکھا نہیں گیا، پوتی کو پچکارا۔
''ہاں بیٹا! کھا کر دیکھو۔ پتا ہے بچپن میں اماں کے ہاتھ کے پہلے پراٹھے کو کھانے کے لیے مجھ میں اور تمہارے چچا میں بہت جھگڑا ہوا کرتا تھا۔'' اشعر بچپن کی یادوں کو تازہ کرنے لگا۔
''اچھا۔ تو پھر کون جیتتا تھا؟'' ارسلان نے چمچہ بھر کر حلوہ منہ میں رکھتے ہوئے پوچھا۔

''روز روز کے جھگڑوں سے تنگ آ کر تمہاری دادی اماں نے ایک شرط لگادی۔''

''اچھا۔ وہ کیا؟'' ارسلان نے دادی کو مسکرا کر دیکھا جو ماضی میں کھوئی، خوش دکھائی دے رہی تھیں۔

''ان دونوں میں سے جو نماز کے لیے سب سے پہلے اٹھے گا، اس کو ہی پہلا پراٹھا ملے گا۔'' یوسف علی نے بیٹے کے بولنے سے پہلے قصہ مکمل کیا۔

''پاپا۔ پھر تو چاچا ہی جیتتے ہوں گے۔'' سب ہنس پڑے۔

''بیٹا۔ دونوں ساتھ ہی اٹھتے تھے۔'' چنیدہ کا تو جیسے سیروں خون بڑھ گیا۔

''عینی! چکھ کر دیکھو۔ بہت مزے کا ہے۔'' ارسلان نے پراٹھے کا نوالہ منہ میں رکھا تو بہن کو لالچ دیا۔

''مجھے نہیں کھانا، اس میں سے عجیب سی اسمیل آ رہی ہے۔'' عیناں نے سب کے اصرار پر ایک نوالہ کھایا اور پھر منہ بنالیا۔

''میری گڑیا! یہ اسمیل نہیں اصلی گھی کی خوشبو ہے۔ تم نقلی چیزوں پر پلنے والے بچوں کو کہاں ان سب چیزوں کی عادت ہے۔'' یوسف علی نے ازراہ مذاق کہا۔

''یہ بات تو ٹھیک ہے پاپا۔ بندر کیا جانے ادرک کا سواد۔'' اشعر نے ہنستے ہوئے بیٹی کو چھیڑا۔

ہما بھنا کر بیٹی کی حمایت میں کود پڑی۔ اسے ویسے بھی اپنے کچن میں ساس کی مداخلت کچھ زیادہ بھائی نہیں تھی۔

''آپ لوگ عینی کے پیچھے کیوں پڑ گئے ہیں۔ اس کو عادت نہیں ہے۔ زبردستی مت کریں۔''

''مما۔ آپ بھی ہمارے لیے صبح صبح پراٹھا پکایا کریں نا۔'' ارسلان کی بات پر ہما کلس کر رہ گئی۔

''رکھ دو واپس..... اور نہیں کھانا ورنہ دن بھر پیٹ پکڑے پھرو گے۔'' ہما نے بیٹے کا ہاتھ ایک اور پراٹھے کی طرف بڑھتے دیکھا تو ٹوکا۔

''ویسے بھی تم لوگوں کو اصلی چیزوں کی عادت کہاں ہے؟'' بہو کے طنز پر یوسف علی کے چہرے پر سرخی چھا گئی مگر بیوی کے اشارے پر برداشت سے کام لیا۔

''اچھا ہما! رات کو کتنے بجے جانا ہے؟'' اشعر کو بھی ہما کے انداز پر غصہ آیا مگر موضوع بدلنے کی خاطر اس سے پوچھا۔

''کارڈ میں نکاح کا وقت آٹھ بجے لکھا ہوا ہے، مگر یہاں ٹائم پر کوئی نہیں آتا، اس لیے ہم بھی آرام سے چلیں گے۔''

چنیدہ ناشتہ چھوڑ کر اٹھیں اور تیزی سے اپنے کمرے کی طرف جانے لگیں، پیچھے سے اشعر نے پکارا۔

''اماں۔ آپ کہاں جا رہی ہیں۔۔ ناشتہ تو ختم کریں؟''

''ہم اپنے اور تمہارے ابا کے کپڑے استری کرنے جا رہے ہیں بیٹا! یہاں لائٹ جانے کا پتا نہیں چلتا ہے نا۔'' چنیدہ کے بولنے پر ہما نے گھور کر دیکھا۔

''آپ دونوں کو کہیں جانا ہے کیا؟'' اشعر نے گڑبڑا کر پوچھا۔

''اے لو۔ ابھی تو بہو نے بتایا ہے کہ نکاح کی دعوت آئی ہے۔''

''سوری اماں! یہ گاؤں نہیں کہ ہر جگہ پورا خاندان چل پڑے۔ وہاں سے صرف مسٹر اور مسز کا بلاوہ آیا ہے۔'' اشعر کے بولنے سے پہلے ہی ہما نے قطعیت سے کہا۔

''اچھا۔ ہم تو سمجھے۔ خیر چلو کوئی بات نہیں۔'' چنیدہ بجھ سی گئیں مگر چہرے پر بشاشت لاتے ہوئے جواب دیا۔

''جورو کا غلام۔ میں نے خود کارڈ دیکھا تھا اس پر بمعہ اہل وعیال لکھا تھا۔'' یوسف علی غصے سے سرخ ہوئے، مگر مصلحتاً خاموشی اختیار کی۔

''آپ فکر نہ کریں، میں پھر کسی دن آپ

لوگوں کو باہر لے جاؤں گا۔'' اشعر کو احساس ہوا تو انہیں بہلانے کے لیے کہا۔

ہم تو بچوں کو بھی آپ کے پاس چھوڑ کر جائیں گے۔'' ہما نے ہاتھ دبا کر شوہر کو خاموش کراتے ہوئے بہانہ کیا۔

''بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے۔'' یوسف علی نے بہو کے اشارے اور بیٹے کی مجبوری کو بغور دیکھا اور ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

☆☆☆

''ہیلو۔ ہیلو۔ بھئی۔ آج۔، زبان گھر پر رکھ کر بھول آئی ہو کیا؟''

گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے اشعر نے کئی بار گردن موڑ کر برابر والی سیٹ پر بیٹھی بجی سنوری ہما کو چھیڑا مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔

''میرا چپ رہنا ہی بہتر ہے، میں کچھ بولتی ہوں تو آپ کو برا لگ جاتا ہے۔'' اس نے ناک چڑھائی۔

''اللہ اکبر۔ مجھ معصوم سے انسان پر اتنا بڑا الزام۔'' اس نے ہنستے ہوئے موڑ کاٹا۔

''سمجھ میں نہیں آرہا، ایسے زندگی کیسے گزرے گی؟'' اس سے برداشت نہ ہوا تو شوہر کی طرف رخ کر کے پوچھا۔

''کیوں زندگی کو کیا ہوا ہے؟'' وہ انجان بن گیا۔

''اپنا ہی گھر اجنبی بن گیا ہے، اس پر اماں کی ہر وقت کی روک ٹوک، اب مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔ آپ اسد سے کیوں نہیں بات کرتے کہ وہ..... چند دنوں کے لیے ان دونوں کو اپنے پاس بلا لے۔''

''پھر وہی قصہ لے کر بیٹھ گئیں۔ یار سب کچھ ٹھیک ٹھاک تو چل رہا ہے۔'' اشعر کے سمجھانے پر ہما نے منہ بنایا۔

''اماں بے چاری تمہیں کیا کہتی ہیں؟ مجھے تو ان کے سامنے شرمندگی محسوس ہوتی ہے، وہ تمہاری الٹی سیدھی باتوں پر کس قدر ضبط سے کام لیتی ہیں، ورنہ تم نے ان کا جلال دیکھا ہی کہاں ہے۔'' وہ بھنایا۔

''معاف کردیں۔ دیکھنا بھی نہیں۔'' اس نے مذاق اڑایا۔

''میری ماں اپنی حویلی پر راج کرتی آئی ہیں، گاؤں کی ساری عورتوں پر ان کا ایسا دبدبہ تھا کہ ان کے مقابل کھڑے ہونے کی کسی میں ہمت نہیں ہوتی تھی، تمہیں اندازہ نہیں وہ یہاں تمہارے ساتھ کتنا ایڈجسٹ کر رہی ہیں۔''

''یہ ٹھیک ہے بھئی۔ خود تو پورا دن گھر سے باہر گزار کر رات کو بستر پر پڑ کر سو جاتے ہیں۔ سہنا تو مجھے پڑتا ہے، اس پر کام کا بھی اتنا زیادہ لوڈ ہے، آئے دن کی مہمان داریوں نے پاگل بنا کے رکھ دیا ہے، ابھی کل ہی کی بات دیکھ لیں آپ کے ابا حضور فون پر اپنے کسی پرانے دوست سلمان چوہدری کو گھر آکر ملنے کی دعوت دے رہے تھے۔'' وہ تیز لہجے میں سناتی چلی گئی۔

''ہاں تو وہ بھی انسان ہیں گھر میں پڑے پڑے بور ہو جاتے ہیں۔ اگر کسی کو بلوا لیا تو کیا ہوا۔ یار! اب تمہیں کچھ باتوں پر کمپرومائز تو کرنا پڑے گا۔'' اس نے سنجیدگی سے بیوی کو سمجھایا۔

''کیوں..... کیوں کروں میں کمپرومائز۔ یہ میرا گھر ہے، ویسے بھی ان لوگوں نے آنے سے پہلے بتایا کیوں نہیں، انسان کم از کم کچھ انتظام کر کے رکھتا۔ ایک دم سے آئے اور ہمیشہ کے لیے یہاں رہنے کا یک طرفہ اعلان کر دیا۔''

''ہاں تو کیا ہوا۔ ان کے بیٹے کا گھر ہے۔ تم کیا چاہتی ہو۔ میں اپنے ماں باپ کا ہاتھ پکڑ کر گھر سے نکال دوں، انہوں نے ساری زندگی ہمارے لیے اتنی قربانیاں دی ہیں، اب جب کہ ابا سے کام نہیں ہوتا تو کیا یہ میرا فرض نہیں کہ ان کو بٹھا کر کھلاؤں۔'' وہ بھی بیوی کی ہٹ دھرمی پر بھنا کر چلایا۔

''پتا ہے۔ پتا ہے۔ اپنی اولاد کے لیے سب کرتے ہیں۔ کوئی احسان نہیں۔'' اس نے ہاتھ لہرا

کر شوہر کی بات کو اہمیت نہ دی۔
ہما کے انداز پر اشعر چڑ گیا۔ کافی دیر تک گاڑی میں خاموشی چھائی رہی مگر ہما کہاں چپ رہنے والی تھی۔
''ایک بات تو بتائیں، ان کی گاؤں کی حویلی اور زمین کا کیا ہوا؟'' اشعر نے بیوی کو بہت غصے سے گھورا مگر اس پر ذرا اثر نہیں ہوا۔
''میں تو کہہ رہی ہوں۔ آپ اماں ابا کو بٹھا کر صاف بات کرلیں۔ ابھی تو ہمارے نئے گھر کی قسطیں بھی باقی ہیں، بچوں کی پڑھائی لکھائی، اس پر ہمارے خرچے کم ہیں کیا۔ آخر ان کے پیسوں پر ہمارا بھی حق ہے یا نہیں؟''
''شٹ اپ ہما! بہت سن لی تمہاری۔ بھول گئی ہو۔ اماں ابا نے ہماری کتنی مدد کی ہے۔ تم جس گھر کو بڑے فخر سے اپنا کہتی ہو نا، اس کی ایڈوانس ادائی کے لیے جب ہمیں خطیر رقم کی ضرورت تھی۔ اس وقت تمہارے گھر والوں نے کیسے ہری جھنڈی دکھائی تھی، ایسے میں میرے ایک فون پر ابا جی نے سارے پیسے یکمشت بھجوائے تھے۔ اب میں کس منہ سے ان سے حویلی اور زمینوں کی بات کروں، جتنا میرا حصہ تھا، اس سے زیادہ میرے والدین مجھے دے چکے ہیں۔ اب جو کچھ بھی ہے، وہ اماں کے نام ہے، ان کی مرضی خود پر خرچ کریں یا کسی یتیم خانے کو دے دیں۔'' شوہر کی بات پر ہما کے من کی دھن بڑھ گئی۔
''وہ کیوں۔ اپنوں کا زیادہ حق ہوتا ہے۔''
''بڑی آئیں ''اپنوں کا حق'' تم نے کبھی ان کو اپنا سمجھا ہے؟'' وہ طنزیہ انداز میں ہنسا۔
آپ کے ابا نے اسد کی پڑھائی پر بھی تو بے دریغ پیسے خرچ کیے ہیں۔ اب وہ وہاں مزے لوٹ رہے ہیں، ساری ذمہ داری بس ہم پر آپڑی ہے۔'' اس نے یاد دلانا چاہا۔
''اسد کی بات مت کرو، وہ بھی میرا بھائی ہے، اس کا بھی اماں ابا پر اتنا ہی حق ہے جتنا میرا۔ ویسے ان باتوں سے تمہارا مطلب کیا ہے۔ میں انہیں گھر سے نکال دوں؟ ایک بات یاد رکھنا، اگر تم نے میرے ماں باپ کے رہنے پر اعتراض اٹھایا تو پھر تمہارے گھر کا بھی کوئی فرد ہمارے یہاں نہیں آسکے گا۔''
اس نے دل بھر کر ہما کی درگت بنائی۔
''ہاں بھئی آپ کو تو میرے گھر والوں سے ہی چڑ ہے، کیسے موقع سے طعنہ مارا ہے۔''
وہ آنسو بہاتے ہوئے بولتی چلی گئی مگر اشعر نے کوئی اثر نہیں لیا بلکہ سامنے دیکھتے ہوئے خاموشی سے ڈرائیونگ کرنے لگا۔

☆☆☆

ہما نے جب یہ بات اچھی طرح سے سمجھ لی کہ اس کے سمجھانے کا اشعر پر رتی برابر اثر نہیں ہوگا تو اس نے ماں سے مشورہ کر کے اپنی حکمت عملی تبدیل کرلی۔ شگفتہ بیگم بھی بیٹی کے گھر آنے کو تڑپ رہی تھیں، ادھر ان کی بہو نے ساس کا جینا محال کر رکھا تھا، پہلے کبھی ایسا موقع آتا تو شگفتہ بڑے طنطنے کے ساتھ لڑ بھڑ کر بیٹی کے گھر چلی آتیں مگر اس کے ساس سسر کے آجانے کے بعد سے ہما کی ماں کے یہاں کے چکر لگنا بند ہو گئے تھے، جس پر وہ بیٹی کو بھڑکانے کے ساتھ دل بھر کر بڑے میاں اور بڑی بی کو کوستیں جن کی وجہ سے ان کی معصوم بیٹی کی زندگی مشکل ہوگئی تھی۔
''بہو نے پکایا کیا ہے، پتیلی تو خالی پڑی ہے۔'' چنیدہ نے پتیلی کا ڈھکن اٹھا کر اندر جھانکا اور سوچ میں پڑ گئیں۔
''ہم خود ہی پلاؤ پکا لیتے ہیں، اشعر کے ابا کب سے فرمائش کر رہے ہیں۔'' فریزر سے چکن کا پیکٹ نکالتے ہوئے انہوں نے سوچا مگر موقع کی تاک میں کھڑی ہما تیزی سے اندر داخل ہوئی۔
''اماں! آپ کچن میں کیا کر رہی ہیں؟''
''وہ بیٹا! دوپہر سر پہ آگئی ہے، تمہارے ابا کو ظہر نماز کے بعد کھانے کی عادت ہے، ہم نے سوچا چکن پلاؤ پکالیں۔'' وہ گھبرا کر صفائی دینے لگ

گئیں۔

''نہیں نہیں۔ کل رات کو ان کی کتنی طبیعت خراب ہوگئی تھی، آج سے میں آپ لوگوں کے لیے پرہیزی کھانا پکاؤں گی۔'' ہما نے بڑی سرعت سے چکن کا پیکٹ واپس فریزر میں رکھتے ہوئے بتایا۔

''بہو! تم کیوں فکر کرتی ہو۔ ہم خود ہی سب کچھ کرلیں گے۔'' وہ یوسف علی کا مزاج سمجھتی تھیں، اس لیے سمجھانا چاہا۔

''نہیں بھئی۔ آپ کے بیٹے نے سختی سے منع کیا ہے۔ وہ مجھ پر گرم ہوں گے۔'' اس نے بظاہر نرمی سے جتایا تو چنیدہ سرد آہ بھرتی ہوئی باہر کی طرف بڑھ گئیں۔

ہما نے ان دونوں کو تنگ کرنے کے لیے نیا وتیرا اختیار کرلیا۔ اب وہ اشعر سے کچھ نہیں کہتی تھی مگر اکثر ناشتہ یا دوپہر کا کھانا گول کر جاتی اور بچوں کے بھوک بھوک کرنے پر بازار سے کچھ منگوا کر کھلا دیتی۔ تازہ کھانا اور گرما گرم روٹی کھانے والے یوسف علی کو یا تو باسی کھانا ملتا یا پھر انڈے کا آملیٹ اور بازار کی سخت روٹی جو ان کے دانتوں سے چبائی نہیں جاتی تھی۔ چنیدہ چاہ کر بھی کچھ نہ کر پاتیں۔

یوسف علی کا پارہ ہائی رہنے لگا۔ ان سے یہ سب برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ چنیدہ نے گھر کا ماحول خراب کرنے سے بہتر سمجھا کہ خود ہی کچھ نہ کچھ پکا لیا کریں۔ کبھی وہ یوسف علی کا من پسند مٹن کا روغنی سالن اور بل دار پراٹھے پکا کر ٹیبل لگاتیں تو کبھی مرغ پلاؤ کی خوشبو ان سب کو ٹیبل پر کھینچ لاتی۔ ایسے میں ارسلان کے بھی مزے آجاتے، مگر عیناں ناک بھوں چڑھاتی رہتی۔

''بڑی بی کے ہاتھ میں بڑا ذائقہ ہے'' ساس کے اصرار پر کبھی کبھی ہما بھی کھانے کی میز پر بیٹھ جاتی تو دل میں اعتراف کرتے ہوئے اٹھتی۔

اشعر کو جب تواتر سے رات کے کھانے پر ماں کے ہاتھ کا سالن ملنے لگا تو اس نے ایک دن بیوی سے پوچھ لیا کہ تم اماں سے کیوں کچن کا کام کروا رہی ہو۔ اس وقت ہما نے بڑا معصوم سا منہ بنا کر سارا الزام ساس پر دھر دیا۔

''میں کیا کروں۔ اماں اور ابا کو دیسی گھی اور ایسے مرچ مسالے والے کھانوں کی چاٹ پڑی ہوئی ہے کہ میرے ہاتھ کا پکایا بھاتا ہی نہیں۔ اسی لیے میں نے خاموش رہنے میں ہی عافیت جانی، بلاوجہ کچھ کہوں گی تو آپ کی نظروں میں بری بنوں گی۔'' وہ کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولی تو اشعر سوچ میں پڑ گیا۔

''دیکھیں نا۔ کل بھی ابا جان کا پیٹ خراب ہوگیا تھا۔ رات بھر جاگتے ہوئے گزری، بلاوجہ کمزوری ہوگئی تو سنبھالنا مشکل ہوجائے گا۔'' اس نے مزید سلگایا۔

''ہاں۔ رات کو ایک بجے وہ لاؤنج میں ٹہل رہے تھے، اماں تو ان کی محبت میں ایسا کرتی ہیں مگر یہ مسئلہ کہیں بڑھ گیا تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔'' اس نے سر ہلایا۔

''اسی لیے تو سمجھاتی ہوں۔ چند دنوں کے لیے انہیں پرہیز کرنا ہوگا۔'' اس نے عقل کے اندھے کو نئی راہ سجھائی۔

''ٹھیک ہے، ایسا کرو۔ تم کل سے ان کے لیے سادہ کھانا پکانا۔'' اس نے ہدایت دی۔

''اور..... وہ..... اماں.....؟'' دل ہی دل میں خوش ہوتے ہوئے وہ فکرمندی سے پوچھنے لگی۔

میں اماں کو خود سمجھا لوں گا۔'' اس نے مسکرا کر جواب دیا تو ہما کے دل میں ٹھنڈ پڑ گئی۔

☆☆☆

ہما نے باکس میں سے فرائیڈ چکن اور فرنچ فرائز نکال کر پلیٹ میں رکھے اور کیچپ کی بوتل اٹھائی۔ دبے قدموں بچوں کے کمرے کی جانب چل دی، شومئی قسمت سامنے سے آتی ہوئی ساس سے ٹاکرا ہوگیا۔ وہ یوسف علی کے لیے کھانا لینے کچن کی طرف آئی تھیں، بہو کے ہاتھوں میں پکڑی پلیٹ پر ایک نگاہ ڈال کر قصداً دوسری طرف دیکھا۔ کہیں وہ

کچھ غلط نہ سمجھ لے، اس کے باوجود ہما نے بے مروتی کی حد کردی اور پلیٹ پر ہاتھ رکھ کر چھپاتے ہوئے تیز قدموں سے بچوں کے کمرے میں داخل ہوگئی۔

''یا اللہ! ہمیں ایسے دن بھی دیکھنے تھے۔'' ان کا دل بری طرح سے ٹوٹا، مگر شوہر کی بھوک کی وجہ سے مزید کچھ سوچنے کا موقع نہیں ملا۔

''بچوں آؤ۔ جلدی سے کھانا کھالیں۔'' ہما نے دروازے کو ہلکا سا بھیڑا اور بیڈ کے سائیڈ پر رکھی ہوئی میز پر پلیٹ رکھی اور پکارا۔

''واؤ مما! فرائیڈ چکن..... یہ لیگ پیس تو میں نے کھانا ہے۔'' ارسلان چھلانگ مار کر بیڈ سے نیچے اترا، مرغی کی ران کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

''نہیں۔ مجھے کھانا ہے۔'' عیناں بھی بھائی کی برابری میں چلائی اس کو دھکا دے کر پیچھے کیا۔

''لڑو نہیں بچوں مل کر کھاؤ۔ ویسے بھی تمہاری دادی نے مجھے یہاں آتے ہوئے دیکھ لیا تھا، ڈر لگ رہا ہے کہ کہیں بڑی بی کی نظر ہی نہ لگ جائے۔'' اس نے للچائے ہوئے انداز میں چھوٹا سا پیس منہ میں ڈالا اور فکرمندی سے بولی۔

''مما۔ تو دادی اماں کو بھی ایک پیس دے دیں نا۔'' عیناں نے معصومیت سے ماں کی طرف دیکھا۔

''تم دوسروں کی فکر چھوڑو اور پاپا کے آنے سے پہلے یہ سب کھا کر ختم کرو۔''

''ویسے مما! جب نانو ہمارے گھر آتی ہیں۔ تب تو وہ بھی ہمارے ساتھ ٹیبل پر بیٹھ کر چکن بروسٹ کی پارٹی کرتی ہیں، پھر دادی اماں کے ساتھ ہم کیوں پارٹی نہیں کرتے؟'' ارسلان نے فرنچ فرائز کھاتے ہوئے ماں سے پوچھا تو وہ ایک دم آگ بگولا ہوگئی۔

''وہ تو چند دنوں کے لیے مہمان بن کر آتی ہیں، ان لوگوں کی طرح ہمیشہ کے لیے یہاں آکر نہیں پڑ جاتیں۔''

اس کا تلخ لہجہ اندر آتی ہوئی چنیدہ کے کانوں میں پڑا تو آنکھیں نم ہوگئیں۔ وہ تو بہو سے بیمار شوہر کے کھانے کا پوچھنے آئی تھیں، مگر اندر ہونے والی گفتگو نے ان کے دل پر خراشیں ڈال دیں۔ احساس ہوا کہ ان جیسی خوددار عورت جس نے ساری عمر کسی کا احسان نہیں لیا، وہ ایک دائرے کی قید میں آگئی ہیں، اب مزید دائرے کی قیدی رہنا ان کی برداشت سے باہر ہو رہا تھا۔ اپنی ممتا کا دائرہ توڑ کر انہیں کھلی فضا میں سانس لینا تھا۔

☆☆☆

''لے جاؤ اسے یہاں سے۔ اب ہم سے مزید یہ باسی تاسی دلیہ کھایا نہیں جاتا۔'' یوسف علی نے ناگواری سے پلیٹ ہاتھ سے پرے کردی۔

''کھالیں۔ ورنہ اشعر ناراض ہوگا۔'' چنیدہ نے شوہر کو منانا چاہا۔

''حد ہوتی ہے، تین دن سے ایسا پھیکا بدمزہ کھانا کھلایا جا رہا ہے، جیسے خدانخواستہ ہم کوئی دائمی مریض ہوں۔'' وہ ہتھے سے اکھڑے۔

''اچھا ٹھیک ہے، ہم آپ کے لیے کچھ تازہ کھانا پکا کر لاتے ہیں۔'' چنیدہ کو بھی بہو کی حرکتوں پر شدید غصہ تھا۔

''نہیں۔ رہنے دیں۔ ہمیں پتا ہے کہ وہ آپ کو کچن میں گھسنے نہیں دے رہی ہیں۔'' وہ چڑچڑے ہو رہے تھے۔

''اچھا۔ کچھ تو کھالیں۔ ورنہ ہم بے چین رہیں گے۔'' ان کے لہجے میں نمی آگئی۔

''تھوڑی دیر بعد ایک کپ گرم دودھ اور بریڈ لا دیجیے گا۔'' وہ بیوی کے تفکر پر تھوڑا نرم پڑے۔

''ایک بریڈ سے کیا ہوگا، ایسے ہی چلتا رہا تو کمزوری ہو جائے گی۔''

''دل ہی نہیں چاہ رہا۔ ہم اشعر سے واپسی پر کچھ چٹ پٹا کھانے کے لیے منگوا لیتے ہیں، قسم سے منہ کا ذائقہ عجیب سا ہوگیا ہے۔'' یوسف علی بیماری میں بچہ بن جاتے تھے، اس وقت بھی ضد کی۔

''چلیں۔ ٹھیک ہے۔'' وہ تسلی دیتے ہوئے ان کا پاؤں دبانے لگ گئیں۔

''السلام علیکم۔ ابا جان کی طبیعت کیسی ہے؟''
اشعر آفس جانے سے پہلے گھڑی بھر کو ادھر آیا۔
''جیتے رہو۔ بیٹا بخار تو کب کا اتر گیا ہے پیٹ بھی ٹھیک ہے مگر کمزوری باقی ہے۔'' چنیدہ نے پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ بتایا۔
''دوائی تو کھا رہے ہیں نا؟'' وہ شاید جلدی میں تھا، جواب سنے بغیر اٹھ کھڑا ہوا۔
''اشعر! ذرا بات سننا۔'' چنیدہ نے پیچھے سے بیٹے کو پکارا۔
''جلدی بولیں اماں! مجھے دیر ہو رہی ہے۔'' اس نے گھڑی کی طرف دیکھا۔
''تمہارے ابا کے منہ کا ذائقہ خراب ہو رہا ہے، واپسی میں ان کے لیے باہر سے کچھ کھانے کے لیے لیتے آنا۔'' وہ بیوی کی باتوں کے زیر اثر تھا، الٹا ماں پر برس پڑا۔
''کیا ہو گیا ہے، اماں! ابھی تو ابا جان کا پیٹ ٹھیک ہوا ہے، آپ کی اسی بے احتیاطی کی وجہ سے یہ ہوا ہے، ہما بتا رہی تھی کہ آپ اس کے ہاتھ کا کھانا پسند نہیں کرتیں اور اصلی گھی میں مرچ مسالے والے کھانے پکا کر خود بھی کھاتی ہیں اور انہیں بھی کھلاتی ہیں۔ بیمار تو ہونا تھا۔''
''بیٹا سنو..... تو.....'' ہکا بکا سی چنیدہ نے بیٹے کو صفائی دینا چاہی مگر وہ گھر میں جاری چپقلش سے بیزار ہو چکا تھا، ایک نہ سنی، بولتا چلا گیا۔
''پیاری اماں! میں پہلے ہی کافی پریشان ہوں۔ ابا کی بیماری کی وجہ سے ایک دن آفس سے چھٹی بھی کرنی پڑی، پلیز میرے حال پر رحم کھائیں اور ہم لوگوں کا روٹین خراب کرنے کے بجائے اس ماحول میں خود کو ایڈجسٹ کرنے کی کوشش کریں۔''
ابھی اس کا جملہ مکمل بھی نہیں ہوا تھا کہ یوسف علی نے پیچھے سے آگے آتے ہوئے بیٹے کے چہرے پر زناٹے دار تھپڑ لگایا۔ وہ سن سا کھڑا رہ گیا۔
''یوسف علی! سنیں تو.....'' چنیدہ نے انہیں تنبیہی انداز میں پکارا مگر ان کا جلال کم ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔
''ایک منٹ۔ آپ چپ رہیں۔ ہمیں اس سے بات کرنی ہے۔'' انہوں نے چلا کر بیوی کو چپ کرایا۔
''بے غیرت انسان! تم نے بیوی کے کہنے میں آ کر ماں کے خلاف مقدمہ تو قائم کر لیا۔ مگر کیا سچ ہے کیا جھوٹ جاننے کی کوشش بھی کی؟''
''ک..... کیسی..... سچائی؟'' وہ شاک حالت میں ہکلاتے ہوئے گال سہلانے لگا۔
''عقل تو بیوی کے پاس گروی رکھ چھوڑی ہے مگر ماں سے زبان چلاتے شرم نہیں آئی۔'' لرزتی کانپتی چنیدہ کو بازوؤں سے سہارا دیا۔
''ابا جان۔ میرا وہ مطلب نہیں تھا۔ میں تو آپ کی طبیعت کی وجہ سے۔'' وہ گال پر ہاتھ رکھ کر پوچھنے لگا۔
''یہ تمہاری ماں حویلی میں کئی ملازمائیں ان کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑی رہتی تھیں، انہیں شوق نہیں تھا یہاں کھانا پکانے کا۔ تم نے کبھی جاننے کی کوشش کی کہ حقیقت کیا ہے؟ مگر ایسی اولاد سے تو بے اولاد ہونا اچھا تھا۔ کم از کم ہمیں یہ دن تو نہ دیکھنا پڑتا۔''
''چھوڑیں نا۔ یہ پہلے ہی بہت پریشان ہے۔'' چنیدہ نے شوہر کا بازو دبا کر دوبارہ خاموش کرانا چاہا۔
''نہیں بیگم! اب آپ کے لاڈلے کو آئینہ دکھانا ضروری ہو گیا ہے۔ تو جناب آپ کی بیوی نے ہم بوڑھا بوڑھی کا دانا پانی بند کر دیا تھا۔''
''نہیں، ہما ایسا نہیں کر سکتی۔'' اس کا سر نفی میں ہلنے لگا۔
''ہم کیا جھوٹ بول رہے ہیں۔ ارے نامعقول بہو کو یہ بات بھی گوارا نہ ہوئی تو اس نے تمہیں جانے کیا پٹی پڑھائی، تم نے ماں کے کچن جانے پر ہی پابندی لگا دی۔'' چنیدہ مستقل شوہر کو چپ کرانے کی کوشش کر رہی تھیں مگر وہ ہوش کھو چکے

تھے۔

''اوہ۔ میرا اللہ۔ مجھ سے یہ کیسا گناہ ہوگیا۔ آپ نے مجھے بتایا کیوں نہیں۔ میں نے تو اسے پرہیزی کھانا پکانے کا کہا تھا؟'' وہ شرمندگی سے نگاہیں جھکا کر بولا۔

''ناخلف۔ پلٹ کر چیک تو کرلیا ہوتا کہ ماں باپ کا کیا حال ہے، بہو جانتی تھی کہ ہم کھانے پینے کے شوقین ہیں۔ اس نے ایسا پرہیزی کھانا کھلایا کہ پتیلا بھر کر بدمزا سا دلیہ پکا کر فریج میں رکھ دیا اور ہم دونوں کو ناشتے، کھانے میں تواتر سے گرم کر کے پلیٹ بھر کر بس وہ ہی پیش کر دیا جاتا تھا۔ یقین نہ ہو تو جا کر اپنا فریج چیک کرلو۔ ابھی بھی بچا ہوا دلیہ مل جائے گا۔'' وہ تیزی سے بولتے چلے گئے۔ چنیدہ کی آنکھوں سے آنسو پانی کی طرح بہنے لگے۔

''مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ ہما اتنی چھوٹے دل کی مالک ہے۔ میں اس کو اس بات پر کبھی معاف نہیں کروں گا۔'' اشعر حیرت زدہ ہو کر بولا۔

''نہیں اشعر میاں! بہوویں بری نہیں ہوتیں۔ بیٹے برے ہوتے ہیں جو ماں باپ کو بھلا دیتے ہیں۔'' یوسف علی کے تھکے ہوئے لہجے پر وہ ہونٹ چباتا ہوا مڑا اور اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

☆☆☆

''پلیز۔ غصہ تھوک دیں۔'' یوسف علی کے کھانسنے پر چنیدہ نے فکرمندی سے ان کی پیٹھ سہلاتے ہوئے کہا۔

''ہاں بیوی! امید ہے کہ اب آپ کی ممتا کو بھی قرار آ گیا ہوگا۔'' نہ چاہتے ہوئے بھی ان کے لہجے میں طنز اتر آیا۔

''ہمیں معاف کر دیں۔ ہماری ضد نے یہ دن دکھائے۔'' وہ آنسو بہاتے ہوئے بولیں۔

''نہیں چنیدہ! نہیں۔'' یوسف علی نے گھبرا کر بیوی کا ہاتھ تھام لیا۔

''آپ جیت گئے یوسف! اب تو خوش ہیں نا۔'' وہ اعتراف کرتے ہوئے ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رونے لگیں۔

''اس میں آپ کی بھی جیت ہے، اسی لیے تو سمجھایا تھا کہ پیسوں کے بارے میں بیٹے کو کچھ نہ بتانا۔'' زندگی میں پہلی بار ان کی بوڑھی آنکھوں سے آنسو کا ایک قطرہ پھسل کر داڑھی کے بالوں میں جذب ہوگیا۔

کچھ دیر کی خاموشی کے بعد یوسف علی نے بیوی کی آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسو پونچھے، اور ہاتھ پکڑ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔ بیوی کو سہارا دے کر بستر پر بٹھایا۔ اس کے بعد کمرے کے بیچوں بیچ کھڑے ہو کر پرسکون انداز میں سانس اپنے اندر کی جانب کھینچی۔ آنکھیں سکیڑ کر جائزہ لیا۔ جھک کر سوٹ کیس نکالا اور سامان سمیٹنے میں مصروف ہوگئے۔

☆☆☆

چنیدہ ایک ٹرانس کی کیفیت میں اٹھیں۔ اپنے پرس کی زپ کھولی اور لفافے میں سے وہ چیک نکالا جو شوہر نے ایک وعدے کے ساتھ انہیں تھمایا تھا۔ یوسف علی پیکنگ کا کام چھوڑ کر بیوی کو پریشانی سے دیکھنے لگے مگر ان کے ہونٹوں پر اس وقت مسکراہٹ پھیل گئی جب چنیدہ نے چیک کو پھاڑ کر کئی ٹکڑوں میں تبدیل کر دیا اور سائیڈ میز پر رکھ دیا۔ یوسف علی نے اسی میز پر رکھا ہوا پیڈ اور قلم اٹھایا۔ اب کی بار چنیدہ شوہر کی طرف متوجہ ہوئیں۔ انہوں نے رائٹنگ پیڈ پر چند جملے گھسیٹے اور پرچہ چیک کے ٹکڑوں کے ساتھ رکھ دیا۔

''آپ سچ کہتے تھے، بے جان مکان سگی اولاد سے زیادہ وفادار ہوتا ہے، جو بڑھاپے میں بے آسرا ہونے سے بچاتا ہے، اچھا ہوا ہم اپنے وعدے پر قائم رہے اگر آخری پونجی بھی لٹا دیتے تو بہو بیگم نے تو جوتیوں میں دال دینی تھی۔ شکر ہے اللہ نے، کسی کا محتاج نہیں رکھا، اب بھی اتنی سکت باقی ہے کہ شہر میں اپنا گھر خرید سکتے ہیں۔'' چنیدہ نے شوہر کے کانوں میں سرگوشی کی۔

''ہمارے ہوتے ہوئے فکر کیوں کرتی ہیں۔ یہ لیں اپنے نئے مکان کی چابیاں۔'' یوسف علی نے ان کا ہاتھ تھپتھپاتے ہوئے جیب سے چابیوں کا گچھا نکال کر انہیں تھمایا۔

''یہ مکان کب لیا آپ نے؟'' وہ ہکا بکا سی رہ گئیں۔

''بہو کے بدلتے تیوروں نے ہمیں بہت کچھ سمجھا دیا تھا، اسی لیے ہم نے اپنے دوست چوہدری سلمان کے مشورے سے چند دنوں پہلے ہی مکان خرید لیا تھا۔'' ان کے بتانے پر چنیدہ کا چہرہ چمک اٹھا۔

''ایک اعتراف اور کرنا ہے ہم اس قدر بیمار نہیں تھے جتنی بیماری کی ایکٹنگ کرنا پڑی، تاکہ ان لوگوں کی سچائی کھل جائے۔'' وہ معصومیت سے اعتراف کرتے ہوئے بڑے بھلے لگے۔

''ویسے آپ کب سدھریں گے؟'' دونوں نے ایک دوسرے کو مسکرا کر دیکھا۔

''کبھی بھی نہیں۔'' ان کا خوش دلی سے لگایا گیا قہقہہ، چنیدہ کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ بکھیر گیا۔ دونوں کو لگا جیسے کاندھے پر سے بھاری بوجھ ہٹ گیا ہو۔

☆☆☆

اشعر نے باپ کے منہ سے ساری حقیقت جاننے کے بعد بیوی کو بری طرح سے آڑے ہاتھوں لیا، دونوں کے بیچ خوب جھگڑا ہوا۔ بچے ماں باپ کو لڑتا دیکھ کر سہم گئے بلکہ عیناں تو حلق پھاڑ کر رونے بھی لگی۔ اشعر نے بچوں کی وجہ سے بیوی کا لحاظ کیا۔ ویسے بھی اسے آفس جانا تھا، واپسی میں نمٹنے کا سوچ کر بکتا جھکتا بھوکا پیاسا گھر سے نکل کھڑا ہوا۔

ساس سسر کے شکایت لگانے پر ہما کو اتنی تپ چڑھی کہ دونوں بچوں کو لے کر اپنے کمرے کا دروازہ بند کر کے بستر پر پڑ گئی۔ چنیدہ نے جانے سے پہلے اس کے دروازے پر کئی بار دستک دی، ان کا دل جاتے جاتے پوتا پوتی کو دیکھنے کے لیے مچل رہا تھا، مگر ہما نے غصے میں دروازہ ہی نہیں کھولا، اسی لیے اسے ساس سسر کے جانے کی خبر بھی نہیں ہو سکی۔ چنیدہ مایوسی سے گردن ہلاتی ہوئی، شوہر کا ہاتھ تھام کر بیٹے کے گھر سے نکل گئیں۔

اشعر رات گئے شرمندہ شرمندہ سا دبے قدموں گھر میں داخل ہوا تو اپنے کمرے میں جانے کی جگہ، ماں باپ کے کمرے کی طرف آ گیا۔ ہر طرف اندھیرا چھایا ہوا تھا، اس نے کمرے کی لائٹ جلائی اور بے قراری سے پکارا۔

''اماں..... ابا جان..... کہاں ہیں آپ؟'' کوئی جواب نہیں آیا۔

''پورا کمرا خالی تھا، اشعر نے جھک کر بیڈ کے نیچے رکھے ہوئے سوٹ کیس ڈھونڈے۔ وہ بھی غائب دیکھ کر، اس کا دل عجیب انداز میں دھڑکنے لگا۔

''ہما۔ تم نے میری جنت کو مجھ سے دور کر کے اچھا نہیں کیا۔'' وہ پریشانی کی حالت میں دیوار سے متصل وارڈروب کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ سرد آہ بھرتے ہوئے اس کے پٹ کھولے، ان دونوں کے کپڑے بھی غائب تھے۔

''اس کا مطلب ہے کہ وہ دونوں مجھ سے ناراض ہو کر یہاں سے چلے گئے ہیں۔'' اشعر بالوں کو مٹھی میں جکڑ کر زمین پر بیٹھتا چلا گیا۔

''یہ لوگ کہاں جا سکتے ہیں؟'' وہ پریشانی میں ادھر ادھر دیکھ رہا تھا کہ نگاہ سائیڈ ٹیبل پر رکھے پرچے اور چیک کے ٹکڑوں پر پڑی۔

''یہ کیا ہے؟'' اس نے چیک کے ٹکڑوں کو اٹھا کر حیرت سے دیکھا، اس کے بعد لرزتے ہاتھوں سے رقعہ اٹھایا، باپ کی لکھائی اچھی طرح سے پہچانتا تھا با آواز بلند پڑھنا شروع کر دیا۔

''السلام علیکم اشعر بیٹا۔ تم جب یہ خط پڑھو گے تو ہم دونوں میاں بیوی اس گھر سے جا چکے ہوں گے۔

بیٹا! شہر آ کر اندازہ ہوا کہ ہمارے اور تمہارے بیچ میں کافی فاصلے آ چکے ہیں، جن کا سمٹنا اب ممکن

نہیں رہا۔اس لیے یہاں سے چلے جانا ہی بہتر لگا۔ بتا کر یا تم سے مل کر اس لیے نہیں جا رہے کہ تمہاری اتری ہوئی صورت دیکھ کر چنیدہ مزید اداس ہو جائیں گی۔ہم نہیں چاہتے کہ وہ ایک بار پھر ممتا کے دائرے کی قیدی بن کر جیے۔ویسے بھی اب جب کہ تم دونوں اپنی زندگیوں میں سیٹ ہو چکے ہو تو کیا یہ ہمارا حق نہیں کہ ہم بھی زندگی سے کچھ خوشیاں کشید کر لیں۔ بس اب ہمارا فرض ہے کہ انہیں وہ ساری خوشیاں دیں، جو جوانی میں نہیں دے پائے تھے۔

ایک بات شاید تم نہیں جانتے ہو گے کہ تم بھائیوں کی تعلیم مکمل ہونے کے بعد سے چنیدہ دن گن گن کر گزار رہی تھیں کہ کب تمہاری اچھی نوکریاں لگیں اور ہم سب مل کر ساتھ رہیں، وہ بہت ساری خواہشات بیٹوں کی کمائی سے پوری کرنا چاہتی تھیں، مگر یہ بھول گئیں کہ جوان ہونے کے بعد بچوں کی ترجیحات بدل جاتی ہیں، ان کی اپنی زندگی ہوتی ہے، اس میں شاید ہم بوڑھوں کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔اس بات کو سمجھنے میں چنیدہ کو زیادہ دن نہیں بس دو مہینے لگ گئے جو ہم نے تمہارے گھر پر گزارے۔

چنیدہ کی ایک خواہش یہ بھی تھی کہ حویلی اور زمین بیچنے سے ہمیں جو اچھے خاصے پیسے ملے ہیں ان سے شہر میں ایک بڑا گھر خرید کر تم لوگوں کو اپنے ساتھ رکھیں تا کہ زندگی کے آخری دن اپنے پوتا پوتی کے ساتھ کھیلتے ہوئے گزریں۔

انہیں اسد کی اتنی فکر نہیں تھی، کیوں کہ وہ تو امریکا میں سیٹ ہو چکا تھا، چنیدہ تمہاری طرف سے بہت فکر مند تھیں۔وہ چاہتی تھیں کہ تم کوئی شاپ کھول لو یا چھوٹا موٹا بزنس کر لو، ان کے خیال میں دوسروں کی غلامی سے بہتر اپنا کاروبار ہے۔اس لیے انہوں نے اپنے حصے کی ساری زمین اور حویلی جو ہم نے ان کے نام کر دی تھی بیچ کر اور سارے پیسے لے کر بڑے جوش و خروش کے ساتھ یہاں آئی تھیں مگر تم لوگوں نے اپنا بھلا خود نہ چاہا تو پھر ہم کیسے کرتے؟

ہمیں تمہاری ماں کے دل ٹوٹنے کی فکر تھی اسی لیے آنے سے پہلے ان سے وعدہ لیا کہ وہ پیسوں کے حوالے سے اس وقت تک کچھ نہیں بتائیں گی۔جب تک ہماری طرف سے گرین سگنل نہ مل جائے۔اس کے بعد ساری رقم کا چیک لکھ کر چنیدہ کے حوالے کر دیا۔وہ ان کی ہی امانت تھی۔جو بھی کرتیں ہمیں کیا اعتراض ہونا تھا۔اب تم سوچ رہے ہو گے کہ اس میں کیا رمز ہے۔

تو بیٹا! ہم نہیں چاہتے تھے کہ تم اور بہو پیسوں کے لالچ میں آ کر ہماری خدمت کرو۔ہم شاید تم کو نہیں خود کو آزما رہے تھے۔یہ بھی نہیں چاہتے تھے کہ ہمارے مرنے کے بعد چنیدہ کسی کی محتاج ہو کر رہیں۔مگر تم لوگوں نے تو ہماری زندگی میں ہی اپنی ماں کو آٹھ آٹھ آنسو رلا دیا ہمارے مرنے کے بعد کیا کرتے۔

اپنے پوتا پوتی کے لیے ہمارے دل میں بڑی گنجائش ہے، جاتے ہوئے انہیں پیار کرنے کو دل بہت مچلا، مگر بہو نے دروازہ نہیں کھولا۔ڈر ہے کہ جس طرح سے تم نے ہمیں بائیس کیا ہے۔کل کو ارسلان بھی اپنے باپ کے نقش قدم پر نہ چل پڑے۔اس کے باوجود ہم چاہتے ہیں کہ تم بہو سے اب اس معاملے پر کوئی بات نہیں کرنا کیوں کہ ہم اپنے بچوں کی زندگیوں کو مشکل بنانے نہیں آئے تھے۔

شاید تمہیں یاد ہو کہ شروع سے ہی چنیدہ گھومنے پھرنے کی بہت شوقین تھیں مگر تم دونوں کی پرورش اور پڑھائی لکھائی میں انہوں نے اپنے من کو مار لیا۔کبھی بھی اپنا نہیں سوچا۔کئی بار ہم نے پیسے جمع کیے اور گھومنے پھرنے کا پروگرام بھی بنایا مگر عین وقت پر تم دونوں بھائیوں میں سے کسی کا فون آ جاتا اور وہ پیسے تم لوگوں کی ضرورت پوری کرنے لیے بھجوا دیے جاتے۔یہ اس لیے نہیں بتا رہے کہ تم سے کچھ چاہیے بس ایسے ہی تذکرہ بیچ میں آ گیا۔

خیر ہماری فکر نہ کرنا، ہم دونوں میاں بیوی فی

الحال تمہارے انکل سلمان چوہدری کی طرف جارہے ہیں، ان کی مدد سے ایک بڑا سا مکان خریدا ہے۔ پھر وہاں شفٹ ہو جائیں گے۔ تم لوگوں کا اگر آنے کا ارادہ ہو تو چھ مہینے بعد جب دل چاہے بچوں کے ساتھ آجانا مگر بچوں کی ان چھٹیوں میں ہرگز مت آنا کیوں کہ ہم دونوں میاں بیوی عمرے پر جارہے ہیں، ٹکٹ بک ہو چکے ہیں۔ وہاں سے واپسی پر پاکستان کی سیر پر نکل جائیں گے۔ اس کے بعد اسد کی طرف بھی جانا ہے۔ ایک بات تو طے ہے کہ اب ہم دونوں میاں بیوی لوٹ کر کبھی تمہارے گھر نہیں آئیں گے ہاں۔ تمہارا جب دل چاہے ہمارے آنے کے بعد بچوں کو لے کر آتے جاتے رہنا۔

چلو شکر ہے کہ اللہ نے ہمیں اس قابل بنایا کہ کسی کی مدد کے بغیر ہم تمہاری ماں کی تشنہ خواہشات کو پورا کر سکیں۔ اگر تم لوگوں کی طرف دیکھتے تو..... اچھا اجازت۔

خوش باش رہو۔

تمہارا والد یوسف علی!"

اشعر نے افسوس بھرے انداز میں خط کو مکمل پڑھنے کے بعد تہہ کرتے ہوئے پرچہ جیب میں رکھا، پیچھے آہٹ ہوئی۔

"اماں۔ ابا۔ واپس آگئے۔" اس نے خوشی سے سوچتے ہوئے مڑ کر دیکھا اور چہرے کے تاثرات یک لخت بدل گئے۔

☆☆☆

ہما جو پیچھے کھڑی چپکے سے شوہر کو خط پڑھتے ہوئے سن رہی تھی، من میں خسارے کا احساس بڑھنے لگا۔ ایک دم سر چکرایا، پاس رکھی کرسی کو پکڑ کر سہارا لینا چاہا تو آہٹ پر اشعر نے مڑ کر دیکھا۔ بیوی کی شکل دیکھتے ہی غصہ بڑھنے لگا، مگر نظرانداز کرنا پڑا۔

"ہائے اللہ! یہ کیا ہوا؟ ہاتھ آئی دولت نکل گئی۔ یہ سب امی کا کیا دھرا ہے، سمجھانے کی جگہ ساس سسر کے خلاف بھڑکاتی رہیں۔" اس نے بھنا کر سوچا۔

"ہائے ابا جان! ایسے بغیر بتائے کیوں چلے گئے۔" وہ فرش پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ کر ہاتھ ملتے ہوئے بین کرنے لگی۔

اشعر کو بیوی کی باتوں میں کھوٹ اور بناوٹ واضح دکھائی دی، پھیکی سی مسکراہٹ لبوں پہ چھا گئی۔

"یہ سب آپ کی وجہ سے ہوا ہے مجھے نہیں پتا کہیں سے بھی دونوں کو ڈھونڈ کر لائیں، ہائے میرے اماں ابا جانے کہاں بھٹک رہے ہوں گے۔" اس کے نالوں پر اشعر نے گھورا مگر منہ سے کچھ نہ بولا۔

"میں تو انہیں اپنے ماں باپ سے زیادہ چاہتی ہوں۔ میرا تو سوچ سوچ کر دل گھبرا رہا ہے۔ وہ ہم سے ناراض ہو گئے ہیں۔ میں جب تک ہاتھ باندھ کر معافی نہ مانگ لوں، سکون نہیں ملے گا۔"

ہما کی باتوں کا اشعر کے دل پر ذرا بھی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ وہ سمجھ چکا تھا کہ ساس سسر کے پاس اتنے سارے پیسوں کا سن کر یہ تازہ تازہ پیار جاگا ہے۔

"آپ کیسے بیٹے ہیں؟ ایسے خاموش کھڑے ہیں۔ کچھ تو کریں۔ میرے حلق سے تو نوالہ بھی نہیں اترے گا۔"

اس نے کھڑے ہو کر شوہر کو جھنجھوڑا۔

"یا اللہ۔ میں تیرے امتحان میں پورا نہیں اترا مجھے معاف کر دے۔"

اشعر نے آسمان کی طرف دیکھا اور ہما جس کی زبان مسلسل چل رہی تھی۔ اسے سامنے سے ہٹاتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔ وہ جانتا تھا کہ یوسف علی کتنے ضدی ہیں۔ ان کے منہ سے نکلی ہوئی بات پتھر پر لکیر ہوتی ہے مگر وہ بھی ان ہی کا بیٹا تھا، اپنی غلطی کو سدھارنے اور والدین کو منانے کے لیے ہر حد تک جائے گا۔ اشعر گاڑی کی چابی اٹھاتے ہوئے انکل سلمان کے گھر کی طرف چل پڑا۔

نوشین فیاض

چاند دستک دیتا ہے

''کالی رات۔ گھپ اندھیرا۔ کالی ڈائن لگا لے پھیرا۔'' سرسراتی ہوئی آواز ہوا کے دوش پر تیرتی اس کی نیند میں مخل ہو رہی تھی۔

''کالی رات۔ گھپ اندھیرا۔'' منتر ایک بار پھر شروع ہو چکا تھا۔ کسمسا کر اس نے آنکھیں کھولیں۔ کمرہ گھور تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ ٹیرس کی طرف کھلنے والی کھڑکی سے ایک سایہ سا لہراتا نظر آ رہا تھا۔ منتر ابھی بھی جاری تھا۔ کوشش کے باوجود وہ ضبط نہیں کر سکی اور زور زور سے چلانے لگی۔ ''امی ی ی ی ی ی ی۔''

اور اب ڈرنے کی باری اس کی تھی جو باہر بیٹھا منتر پڑھ رہا تھا۔ ایک ہی جست میں وہ ریلنگ سے کمرے میں آ پہنچا تھا۔

''انو..... انو..... میں ہوں پاگل۔ چلا کیوں رہی ہے..... انو.....'' اس کے پاس کھڑا وہ اسے چپ کروانے کی کوشش کرنے لگا۔

''بھائی آپ۔'' اس کی چیخوں کو ایک دم بریک لگا تھا۔ آنکھیں پھاڑے وہ اس اندھیرے میں اسے دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

''ہاں میں۔'' اس کے چپ ہونے پر اس نے چین کا سانس لیا تھا۔

''کیا ہوا انعم.....! کیوں چیخ رہی تھیں؟'' امی نے اندر داخل ہوتے ہی سوئچ آن کیا تھا۔ سامنے بیڈ پر بیٹھے ارسل کو دیکھ کر وہ حیران رہ گئی تھیں۔ ابھی تو وہ سونے کے لیے گئی تھیں۔ وہ کب آیا انہیں پتا ہی نہیں چلا۔

''امی۔ بھائی نے ڈرایا ہے مجھے.....'' انعم کو ایک بار پھر اپنا دکھڑا یاد آ گیا تھا۔

''ہاں تو! پچھلی بار جب میں آیا تھا تو کون اتنی لمبی لمبی چھوڑ رہا تھا؟ میں تو نہیں ڈرتی اب۔ اکیلی سو

جاتی ہوں۔ لائٹ بھی نہیں جلاتی۔ میں تو بس چیک کر رہا تھا۔" اس کی نقل اتارتے ہوئے ارسل نے آرام سے جواب دیا۔

"تم آئے کب؟" عاصمہ نے مسکراتے

ہوئے ارسل کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرنا چاہا تو وہ بدک کر ان سے دور ہٹا۔

"جس وقت مجھے دیکھ کر آپ نے جلدی سے دروازہ بند کر لیا تھا۔ وہ تو شکر میں نے ڈپلیکیٹ چابی وقت پر بنوالی تھی۔ روز روز منہ اٹھا کر آجاتا ہوں۔ اسی لیے میری یہ قدر رہ گئی ہے۔"

مصنوعی رقت آمیز لہجے میں کہہ کر اس نے جیسے آنسو چھپانے کے لیے منہ پھیرا تھا۔ اصل میں تو وہ اپنی ہنسی چھپا رہا تھا۔

"میں نے نہیں دیکھا تمہیں آتے ہوئے ورنہ دروازہ کیوں بند کرتی؟ تم کون سا سونے کے نوالے کھاتے ہو جو بچانے کے لیے میں نے دروازہ بند کر دیا؟"

عاصمہ سنجیدہ ہوگئی تھیں۔

"ویسے یہ تو آپ نے بالکل سچ کہا۔ میں کون سا سونے کے نوالے کھاتا ہوں۔ آپ کے ہاتھ کا کچھ بھی بنا ہو صبر شکر سے کھا لیتا ہوں نہیں بھی ملا تو بھوکا سو جاؤں گا۔"

جان بوجھ کر وہ مسلسل انہیں جذباتی کر رہا تھا۔

"نہ میرا بیٹا۔ کیوں بھوکا سوئے؟ بھوکے سوئیں اس کے دشمن۔ بتاؤ، میرے بیٹے نے کیا کھانا ہے؟"

"بھوکے کو جو بھی مل جائے، کھا لیتا ہے۔ آپ جو مرضی کھلا دیں۔ صبح سے بس ناشتہ ہی کیا ہے۔" اپنے چہرے پر اس نے بے چارگی طاری کر رکھی تھی ورنہ جانتی تو عاصمہ بھی تھیں کہ اس کا ناشتہ کتنا ہیوی ہوتا ہے۔ دیسی گھی کے پراٹھے، دیسی گھی میں بنے دیسی انڈے اور بکرے کا گوشت جو اس کے لیے خاص طور سے بنتا تھا، چائے کی تازہ لسی اور پیالہ بھر دہی۔ زینب کے سارے لاڈ پیار کھانے پر ہی تو پورے ہوتے تھے۔ اب تو خود اس کی بھی ایسی عادت ہوگئی۔ نہ جانے یہاں آکر وہ کیسے کچھ بھی کھا لیتا تھا ورنہ گھر میں اس کے نخرے دیکھے تھے عاصمہ نے۔

"میں ابھی بناتی ہوں کچھ۔" وہ اٹھنے لگیں۔

"جہاں سارا دن بھوکے تھے رات بھی کٹ ہی جاتی۔ یونہی امی کو۔" انعم بڑبڑائی۔

"پھپھو! دیکھ لیں آپ کی بیٹی میری تذلیل کر رہی ہے۔" اس نے ہانک لگائی۔

"میری بیٹی تمہاری بھی بہن لگتی ہے۔" جواب آیا تھا۔

"ہنہ..... میری بہن۔ بہن تو یہ اس گینڈے زارون اور مینڈک افق کی ہے" زارون اتنا موٹا بھی نہیں تھا بس ارسل کو جم جا کر بنائی اپنی باڈی پر بڑا ناز تھا۔

استہزائیہ نظروں سے اسے دیکھتے وہ بستر سے اٹھ کھڑا ہوا۔ جانتا تھا ابھی حملہ شروع ہو جائے گا اور ہوا بھی یوں یہی۔ بیڈ پر پڑے تکیے اور کشن ایک ایک کر کے اس کی طرف آنا شروع ہو گئے تھے۔ جھکائی دے کر بال سنوارتا وہ باہر نکل گیا تو وہ مسکراتے ہوئے تکیے اٹھانے اٹھ کھڑی ہوئی۔

☆☆☆

افق اور ارسل موبائل پر گیم کھیل رہے تھے۔ زارون صوفے کے بازو پر گردن ٹکائے سوشل میڈیا کی سائٹس کھنگال رہا تھا۔ کانچ ٹوٹنے کی آواز پر زارون کے ہاتھ سے فون گرتے گرتے بچا تھا۔ وہ دونوں بھی گیم چھوڑ کر سیدھے ہو کر بیٹھ گئے تھے۔

"آ گئی میری شامت۔" زارون کے کہنے پر وہ اس کی طرف متوجہ ہوئے لیکن اس سے پہلے کہ وہ دونوں زارون سے اس کی بات کا مطلب پوچھتے عاصمہ اندر آ گئیں۔

"کس نے رکھا تھا پانی پی کر گلاس فریج کے پاس زمین پر؟"

"امی! میں تھکا ہوا تھا اس لیے۔" زارون کے صفائی دینے پر ان دونوں نے بمشکل ہنسی روکی۔

"اتنا ہی تھکے ہوئے تھے تو کچن تک جانے کی زحمت ہی کیوں کی تھی؟ ہمیشہ کی طرح بوتل کو منہ لگا کر پی لیتا تھا پانی۔"

اب وہ کیا کہتا کہ پانی تو اس نے منہ لگا کر ہی پیا تھا۔ وہ تو کھلی کھڑکی پر رکھا گلاس نظر آ گیا تو اٹھا کر نشانی کے لیے وہاں رکھ آیا تھا۔ اسے کیا پتا تھا، ٹوٹ

جائے گا۔
''افوہ امی! ایک بات بتائیں۔ ہم سے گلاس ٹوٹ جائے تو ہم نکمے اور آپ سے ٹوٹ جائے تو ہم نے وہاں رکھا ہی کیوں تھا۔ کیا یہ ناانصافی نہیں؟''
افق کی بات پر وہ اسے گھور کر رہ گئی تھیں۔
''بس میں ذرا سی دیر کے لیے ادھر ادھر ہو جاؤں قیامت مچ جاتی ہے گھر میں۔'' بڑبڑاتے ہوئے وہ دروازے کی طرف جا رہی تھیں جب ارسل نے آواز دے کر روک لیا۔
''وہ..... میں کہہ رہا تھا پھپھو! کیوں نہ ہم اپنے زارون کی شادی کر دیں۔ پانی تو کیا کھانا کھلانے والی بھی آ جائے گی۔ ویسے بھی اتنی تو عمر ہو گئی ہے ذرا اور وقت گزر گیا تو کل کو بچوں پر رعب ڈالنے کی عمر نہیں رہے گی۔ ڈاکٹر نے یوں ہی اونچا بولنے سے منع کر دینا ہے۔'' ارسل کی بات پر عاصمہ ہنس پڑیں۔
زارون کے لیے انہوں نے اپنی خالہ زاد بہن کی بیٹی عزہ پسند کر رکھی تھی۔ رافعہ بھی راضی تھیں۔ بس عزہ کی پڑھائی کی وجہ سے رکے ہوئے تھے۔ ورنہ جب سے زارون کی جاب ہوئی تھی، خود ان کی اپنی بہت خواہش تھی باقاعدہ طور پر رشتہ دینے اور منگنی کرنے کی۔
''خیر ہے، تمہیں اتنا خیال کیوں آ رہا ہے؟'' وہ جاتے جاتے مڑ کر بولیں۔
شادی سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ بیوی اپنی قسمت میں نہ چنگی ہے نہ ماڑی ہے
''سب مل کر بولیں واہ واہ واہ۔'' رقت آمیز لہجہ آخر میں بڑا ادبی ہو گیا تھا جس پر سب کا مشترکہ قہقہہ پڑا تھا۔
''ٹھہر جاؤ تم ذرا، میں کرتی ہوں زینب کو فون۔ کہتی ہوں تمہاری شادی کروا دے جلد از جلد۔''
''اوہو پھپھو! آپ تو سیریس ہی لے گئی ہیں بات کو۔ دیکھیں میں بڑا سادہ اور معصوم سا بندہ ہوں اور یہ جو لڑکیاں شادی سے پہلے پریاں نظر آتی ہیں۔ شادی کے بعد ان کی چڑیلوں والی خصوصیات نظر آتی ہیں اور کچھ نہیں تو میک اپ کے نیچے سے شکل ہی چڑیلوں والی نکل آتی ہے۔ اللہ کی پناہ۔'' اس نے مصنوعی جھرجھری لی۔
''تمہارے لیے تو میں زینب کی منت کر کے خود لڑکی ڈھونڈ کر لاؤں گی۔'' لاڈ سے اس کے بال بکھیر کر وہ بولیں۔
''پہلے اپنے اس بیٹے کے لیے تو ڈھونڈ لیں۔'' اس کا اشارہ زارون کی طرف تھا۔
''اس کی تم فکر مت کرو اس کے لیے لڑکی میں نے ڈھونڈی ہوئی ہے۔'' ان کی بات نے زارون کی بھی توجہ کھینچی تھی اور اس کے بعد ارسل نے اس وقت تک جان نہیں چھوڑی جب تک ان کے منہ سے عزہ کا نام نہیں اگلوا لیا۔ نام بتا کر وہ باہر نکل گئیں کہ کہیں وہ پھر باتوں میں نہ الجھا لے۔ وہ خوشی سے بھنگڑے ڈال رہا تھا جس میں افق کے ساتھ ساتھ زارون کو بھی زبردستی شامل کر لیا تھا۔

☆☆☆

''تم پھر آ گئے ہو یا گئے ہی نہیں؟'' دروازہ دھکیل کر اندر آتی عزہ اس کے کچھ بولنے سے پہلے ہی بول پڑی تھی۔
''تم بھی تو پھر آ گئی ہو۔ میں نے تو تمہیں کچھ نہیں کہا'' دروازہ بند کر کے وہ بھی اندر آ گیا تھا۔
''میں پورے ڈیڑھ ماہ بعد آئی ہوں۔'' صوفے پر بیٹھتے ہوئے اس نے جواب دیا۔ وہ اپنے امتحانات میں اتنی مصروف تھی کہ ہاسٹل سے گھر بھی اتنے دن بعد آئی تھی۔
''میں بھی پورے ڈیڑھ دن بعد آیا ہوں۔'' کچھ بولنے کے لیے اسے منہ کھولتا دیکھ کر وہ اسے سمجھانے لگا۔ ''اب دیکھو ڈیڑھ تو ڈیڑھ ہوتا ہے دن ہو یا ماہ۔ لیکن — یہ بات تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گی کیوں کہ تم میڈیکل کی اسٹوڈنٹ ہو اور میڈیکل میں میتھ نہیں ہوتا۔ ہو بھی تو اکثر لڑکیوں کا میتھ ویک ہوتا ہے کیونکہ لڑکیوں کا.....''
''خدا کی پناہ اتنی بک بک کیسے کر لیتے ہو تم؟'' اس کی بات کاٹ کر اتنی لمبی بات کے جواب میں اس

نے ایک جملہ کہہ کر اس کی بولتی بند کردی تھی۔
''یقین مانو، میرے ساتھ اتنی پیاری پیاری لڑکیاں پڑھتی رہی ہیں لیکن ان میں ایک بھی تم جیسی.....''
''ہو بھی نہیں سکتی کیوں کہ آئی ایم ون اینڈ اونلی سنگل پیس۔'' اس کی بات بیچ میں کاٹ کر شانِ بے نیازی سے بولی تھی۔ جرنل اور بیگ صوفے پر ڈال کر وہ گرنے کے انداز میں وہیں بیٹھ گئی۔
''وہی تو..... اب خود ہی دیکھ لو۔ لڑکے ایک دوسرے کو لڑکیوں کے بارے میں کہتے ہیں ''یار پیس چیک کر اور تم خود اپنے منہ سے خود کو پیس کہہ رہی ہو۔'' وہ اپنی دھن میں مست بول رہا تھا جب کہ عزہ کا مارے خفت کے چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔
''سارا گھر تمہارے حوالے کر کے کہاں گئے ہیں سب؟'' ادھر ادھر دیکھنے پر کوئی نظر نہ آیا تو اس نے اس سے ہی پوچھ لیا۔ خالہ گھر میں ہوتیں تو اس وقت یقیناً وہاں آچکی ہوتیں۔
''کس کا پوچھ رہی ہو سب کا یا اپنے سب کا؟'' اس کے سامنے صوفے پر بیٹھتے آگے جھک کر اس کی آنکھوں میں جھانکتے وہ خاصا رازدارانہ انداز اپنائے ہوئے تھا۔
''ایکسکیوزمی۔'' نا سمجھی سے اس کے کہنے پر آنکھ دباتا وہ پیچھے ہوا۔ اسی وقت اس کی پشت پر سیڑھیوں سے اترنے کی آواز آئی۔ دونوں نے بیک وقت سیڑھیوں کی اور دیکھا۔ زارون نیچے اتر رہا تھا۔
''لو مطلب کیا؟ جس کا پوچھ رہی تھیں وہ خود آگیا۔''
معنی خیز مسکراہٹ ہونٹوں پر سجائے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ زارون نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا جب کہ عزہ پہلے ہی اس کی بے تکی بات کا مطلب جاننے کے لیے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔
''کیا کہہ رہی تھیں تم؟'' وہ اسی جگہ پر آکر بیٹھ گیا جہاں کچھ دیر پہلے ارسل بیٹھا تھا۔
''یہ کہہ رہی تھی کہ ارسل کا دماغ خراب ہے، اس کا علاج کرواؤ۔ خالہ کہیں گئی ہیں؟''
اس کا بات پلٹنا زارون کو اچھا نہیں لگا تھا۔
''ہسپتال گئی ہیں کوئی کزن بیمار ہے شاید۔''
''اچھا۔ امی نے تو نہیں بتایا کسی کزن کے ایڈمٹ ہونے کا، شاید وہ بھی وہیں گئی ہیں گھر لاک کر کے۔ میری چابی صبح کمرے میں ہی رہ گئی تھی اس لیے میں ادھر ہی آگئی۔''
بیگ ٹٹول کر فون نکالتے اس نے خاصا تفصیلی لیکن مصروف سا جواب دیا۔ زارون دلچسپی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ نئے رشتے کی نوید سن کر اس کی نظر از خود بدل گئی تھی۔ جب کہ اسے پوری طرح نظر انداز کر کے وہ موبائل کی طرف متوجہ ہو چکی تھی تو اسے وہاں سے اٹھنا پڑا۔

☆☆☆

دسمبر کی یہ شام بہت خاص تھی۔ عاصمہ بیٹے کی رسم کرنے جا رہی تھیں۔ وہ عزہ کے تایا کی وجہ سے کرنا نہیں چاہتی تھیں لیکن ارسل نے جان کھالی تھی کہ جلد از جلد رسم کی جائے۔ مجبوراً انہیں اس کی ماننی پڑی۔ عزہ کے تایا اپنے بیٹے کے لیے عزہ کا رشتہ مانگنا چاہتے تھے۔ کچھ قریبی رشتے داروں سے انہوں نے ذکر بھی کیا تھا لیکن رافعہ سنی ان سنی کر گئیں۔
وہ جانتی تھیں کہ عثمان چھ ماہ کے کسی کورس کے لیے جرمنی جانے والا ہے۔ اس کے جانے سے پہلے اگر وہ بات کرتے تو تب کی تب دیکھی جاتی اور اگر وہ بات نہ کرتے تو رافعہ کا ارادہ تھا اس کے آنے سے پہلے ہی وہ جیٹھ کو عزہ اور زارون کے رشتے کے بارے میں آگاہ کر دیں گی۔ یہی وجہ تھی کہ ارسل کے اصرار پر عاصمہ رسم کرنے تو جا رہی تھیں لیکن کسی رشتے دار کو ساتھ نہیں لے کر جا رہی تھیں۔

آئی منگنی کی یہ شام
حور لنگور کے ہے ساتھ
گوری کرت سنگھار
گوری کرت سنگھار

ہیئر برش کو مائیک بنائے وہ ادھر سے ادھر ناچتا

گاتا پھر رہا تھا۔
''بکواس بند کر کے اپنا حلیہ سنوار لے کچھ۔''
زارون نے شیشے میں دیکھتے اس سے کہا۔
''تم سنوارو اپنا حلیہ۔ میں تو.....''
''نظر بٹو بن کر جاؤں گا۔'' زارون نے شرارت سے اس کا فقرہ مکمل کیا۔
''تو منگنی تمہاری ہے، تم شکل سنوارو کہ کہیں وہ تمہیں دیکھ کر انکار ہی نہ کر دیں۔'' اس نے بھی بدلہ اتارا اور اس سے پہلے کہ زارون کچھ کہتا عاصمہ نے اسے جھڑکا۔
''کتنی بار کہوں منگنی منگنی نہ کرو۔ بس شگن رکھنے جا رہے ہیں تا کہ تمہارا شوق پورا ہو لیکن تم نے تو جیسے بات نہ ماننے کی قسم کھا رکھی ہے۔''
رافعہ نے بھی کوئی ایسی خاص تیاری نہیں کی تھی جس سے اچانک آنے والے کو کسی خاص موقعے کا تاثر ملتا۔ یہاں تک کہ عزہ بھی سادہ سے کپڑوں پر شال لپیٹے پھر رہی تھی۔ ارسل تو اسے دیکھ کر حیران ہی رہ گیا۔ اب بھلا اتنی بھی کیا سادگی۔
''لڑکی! تمہارے سسرال والے آئے ہیں، وہ بھی پہلی بار اور تم ایسے پھر رہی ہو جیسے کہ ہم روز آتے ہیں۔''
''کون سے سسرال والے؟ میری تو خالہ آئی ہیں۔'' وہ محبت سے عاصمہ کے گلے لگی۔
''اور یہ بھی کیک پیسٹری بن کر خالہ ہی کے گھر آئی ہے۔ اس کی تو منگنی بھی نہیں۔'' عزہ کے گلے لگ کر ملتی انعم کی فرنچ ناٹ کھینچ کر اس نے اس کے بالوں کا اسٹائل برباد کر دیا تھا۔
''بھائی۔'' وہ حلق پھاڑ کر چلائی۔
''آآآ..... میرا بچہ۔ مجھ سے پیسے لے لینا پارلر کے۔'' وہ ہنسا۔
''امی نے بنائی تھی اور ابھی میں نے تصویریں بھی بنانی تھیں۔''
''اوہ۔ سو سوری انو پرنسز۔'' دونوں کان پکڑ کر وہ اس کے آگے جھکا تو وہ ہنس پڑی۔ عزہ نے ارسل کے

جھکے سر اور انعم کے ہونٹوں پر ہنسی کو دیکھا اور نظر پھیر لی۔
شام ہونے والی تھی۔ کھانے پینے سے فراغت کے بعد خوش گپیاں جاری تھیں۔ ارسل رسم دیکھنے کے لیے بے چین تھا اور عاصمہ، رافعہ کے ساتھ اندر کہیں گم ہو گئی تھیں۔ افق ان سب کی تصویریں بنا رہا تھا۔ وہ ارسل کی تصویر کھینچنے لگا تو اس نے منع کر دیا۔
''میں نے اپنا تحفہ دیتے ہوئے تصویر بنوانی ہے۔ پتا ہے لڑکیاں ہوتی ہی کوڑھ مغز ہیں اور یہ تحفہ لے کر بھول جائے گی پھر ساری زندگی طعنے مارے گی مجھے۔''
اس کی معصومیت سے کی گئی بات پر ماحول کشت وزعفران ہوا تھا۔ عزہ بھی جھینپ کر مسکرانے لگی تھی۔ ارسل آج کے دن بھی باز نہیں آیا تھا تو کم از کم اسے ہی لحاظ رکھنا تھا سو چپ رہی۔
ارسل نے اپنا لیا تحفہ عاصمہ کو دیا تھا کہ یہاں آ کر لے گا سو انہیں رسم کے لیے بلانے کے ساتھ ساتھ اپنا تحفہ لینے کے لیے وہ اندر کمرے کی طرف چل دیا جہاں کچھ دیر پہلے عاصمہ گئی تھیں۔
''عاصمہ حد ہوتی ہے بے وقوفی کی۔ تم اس لڑکے کو کیوں دم چھلا بنا کر پھرتی رہتی ہو؟ جب دیکھو ادھر ہی گھسا رہتا ہے۔ پھر انعم کے ساتھ اتنا فری ہوتا ہے۔ تم نے آنکھیں بند کر رکھی ہیں کیا؟''
عزہ کی ماں کے منہ سے یہ بات سن کر اس کے قدم اٹھنے سے انکاری ہو گئے تھے۔
''آپا کیا ہو گیا ہے آپ کو۔ بھائی ہے وہ انعم کا۔''
''بھائی صرف اپنے ہوتے ہیں۔ کسی بھی نقصان سے پہلے یہ بات سمجھ لو تو بہتر ہے۔''
ارسل کا دل چاہا زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔ انعم کے بارے میں وہ مر کر بھی ایسے سوچ نہیں سکتا تھا۔
''آپا! آپ تو سب جانتی ہیں پھر بھی۔۔''
''میں جانتی ہوں، تم جانتی ہو لیکن وہ جو یہاں ڈیرے ڈال کر بیٹھا ہے نا۔ وہ نہیں جانتا۔ پتا نہیں عباس کو بھی کچھ نظر کیوں نہیں آ رہا۔''

''اچھا، میں احتیاط کروں گی۔'' پھپھو کی شکست خوردہ آواز نے اس کے پیروں تلے سے باقی کی زمین بھی کھینچ لی تھی۔ تو ارسل عباس ان کے لیے اتنا ہی ناقابل اعتبار تھا۔ گہری سانس بھر کر خود پر قابو رکھتے اندر جا کر اس نے پھپھو سے اپنا تحفہ لیا اور باہر سب کے پاس آ گیا۔
''یہ میں تمہاری منگنی کا تحفہ لایا تھا۔'' سیاہ مخملی ڈبیہ عزہ کی گود میں پھینک کر وہ ایک لمحے کی تاخیر کیے بنا وہاں سے باہر نکل آیا تھا۔ عباس الجھ سے گئے تھے۔ وہ اتنا خوش آیا تھا تو پھر اب کیا ہوا؟''
مخملی ڈبیہ سے نکلنے والی انگوٹھی پر لگے ہیرے نے سب کی آنکھوں کو چندھیا دیا تھا جبکہ زارون کا دل اندھیر ہوا تھا۔ اس کا دل ارسل کے خلاف ہوا۔ امی منگنی کی اس نام نہاد رسم میں عزہ کے ہاتھ پر پانچ ہزار رکھنے والی تھیں۔ ایسے میں اتنا مہنگا تحفہ جیسے اس کی برتری کا اظہار تھا۔ اس کا دل چاہا، وہ اس انگوٹھی کو عزہ سے لے کر ڈسٹ بن میں ڈال دے۔ سب کی موجودگی میں وہ صرف سوچ ہی سکا۔
عاصمہ خود اس کے اس طرح چلے جانے پر حیران تھیں۔ وہی تو تھا جو ضد کر کے انہیں اس رسم پر راضی کر کے لایا تھا۔ گھر واپسی پر زارون کا موڈ خراب تھا تو عاصمہ اور عباس اپنی اپنی جگہ پریشان۔ عاصمہ انگوٹھی نہیں لانے والی یہ بات وہ جانتا تھا۔ عاصمہ نہیں چاہتی تھیں کہ پھر رافعہ کو بھی زارون کے لیے انگوٹھی لانی پڑے۔ کچھ رشتہ داروں کا بھی خوف کہ بات کھلنے پر اعتراض اٹھے گا خود ہی خود جا کر منگنی کر آئے۔
ارسل کے سامنے بات ہوئی تھی۔ اس نے خود جا کر اپنی پسند اور مرضی کی انگوٹھی لا کر عاصمہ کو دی تھی۔
''لڑکیوں کے بہت شوق ہوتے ہیں پھپھو۔ یہ موقعے کون سا بار بار آتے ہیں۔ ساری زندگی میں ایک بار تو یہ وقت آتا ہے۔ کل کو یاد کر کے خوش ہی ہو گی نا عزہ۔ پھر میں نے زارون اور عزہ کو کوئی تحفہ بھی تو دینا تھا تو میری طرف سے یہی تحفہ ہو گا۔ میری طرف سے تحفہ ہوا تو وہ بھی زارون کے لیے تردد نہیں

کریں گی۔ آپ زاردن کو بھی نہیں بتائیں گی۔ ان دونوں کے لیے سرپرائز ہوگا۔"

وہ اس دن کو یادگار بنانے والا تھا اور اب ایسے چپ چاپ بنا کچھ کہے چلا گیا تھا۔ عباس کے بتانے پر کہ وہ اچھے بھلے موڈ میں اٹھ کر اندر گیا تھا اور پھر انگوٹھی دے کر فوراً چلا گیا تو عاصمہ سوچے بنا نہیں رہ سکیں کہ شاید اس نے ان کی باتیں سن لی تھیں۔

☆☆☆

زاردن کی منگنی کو ہفتہ ہو چلا تھا لیکن ارسل نے ان کے گھر کا رخ نہیں کیا تھا۔ فون بھی اس نے اسی دن سے بند کر رکھا تھا۔ اس کے کون سے کاروبار تھے جو فون بند ہونے سے متاثر ہوتے۔ افسوس اگر رافعہ کی ذہنیت پر تھا تو دکھ عاصمہ کے اپنی حمایت میں نہ بولنے کا بھی تھا۔

وہ نہا کر تولیے سے بال خشک کرتا باہر نکلا تو عباس علی کو کمرے میں دیکھ کر ٹھٹک کر رک گیا۔ وہ کبھی ایسے اس کے کمرے میں نہیں آتے تھے۔

"السلام علیکم ابا جی۔"

"وعلیکم سلام پتر۔ طبیعت ٹھیک ہے میرے شہزادے کی؟"

"جی ابا جی۔" وہ ان سے نظر نہیں ملا رہا تھا۔ جیسے جانتا ہو کہ وہ کیا بات کرنے آئے ہیں۔

"آج کل لاہور والوں سے کوئی ناراضی چل رہی ہے؟" کچھ دیر میں ہی وہ اس بات پر آ گئے تھے جس کا ارسل کو پہلے سے ہی اندازہ ہو رہا تھا۔

"نہیں ابا جی! ایسی تو کوئی بات نہیں بس جم جا کر تھک زیادہ جاتا ہوں تو سارا دن کہیں نکلنے کا دل نہیں کرتا۔"

"باپ کے ساتھ جھوٹ بولتے دل کو کچھ ہوتا بھی ہے یا ایویں کچھ بھی بول دیتے ہو؟" وہ مسکراتے ہوئے پوچھ رہے تھے۔ ابا اس کے باپ کم اور دوست زیادہ تھے۔ جانتے تھے وہ ان سے نہ کوئی بات چھپا سکتا ہے نہ جھوٹ بول سکتا ہے۔ اس کی گاڑی روزانہ گھر میں دیکھ کر انہیں اندازہ تو ہو ہی گیا تھا کہ کوئی بات ہے جو وہ لاہور نہیں جا رہا۔ پھر عاصمہ کا فون بھی آ گیا۔ اب وہ اس انتظار میں تھے کہ ارسل آ کر خود ہی ان سے بات کر لے۔

ارسل کو ابا سے بات کرنے کے لیے موزوں الفاظ نہیں مل رہے تھے۔ وہ جانتا تھا ابا کو بھی اس کا روز روز لاہور جانا اتنا پسند نہیں۔

"رافعہ خالہ کی ایک بات بہت بری لگی تھی۔" اس کے علاوہ وہ کچھ اور نہیں بتا سکا۔

"تو اس میں عاصمہ کا کیا قصور؟" انہوں نے بات نہیں پوچھی تھی۔ جب وہ پردہ رکھ رہا تھا تو وہ کیوں کریدتے۔

"انہوں نے بھی کچھ نہیں کہا انہیں۔" بچوں کی طرح منہ پھلائے وہ بڑی سنجیدگی سے بات کر رہا تھا۔

عباس مسکرا اٹھے۔ "اوہ پتر۔ رافعہ میری بھی اتنی ہی خالہ زاد ہے جتنی تیری پھپھو کی پھر ہے بھی مجھ سے چھوٹی، اس کے باوجود سچ پوچھو تو آج تک میری ہمت نہیں ہوئی کبھی اس کی بات سے اختلاف کرنے کی تو یہ تو پھر تیری ڈرپوک سی پھوپھی ہے۔"

وہ بھی مسکرا دیا۔

"دیکھ بیٹا! زندگی میں بعض وقت ہم منہ میں زبان رکھنے والے گونگے اس لیے بن جاتے ہیں کہ ہمیں اگلے بندے کا مان عزیز ہوتا ہے۔ اگلا تب ہی بولتا ہے جب اسے مان ہوتا ہے کہ ہم سن لیں گے۔ لیکن ایسے بات سن لینے کا مطلب یہ تو نہیں ہو سکتا کہ ہم اس کی ہر بات سے متفق ہیں۔ اختلاف رکھنا بڑی بات نہیں اس اختلاف کے بعد احترام میں چپ رہنا بڑی بات ہوتی ہے اور ہم سب اچھی طرح سے رافعہ اور عاصمہ کی عادت کو جانتے ہیں۔ اس لیے دل پر نہ لے کچھ۔"

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ابا سے بات کرنے کا سب سے بڑا فائدہ یہی ہوتا تھا انہیں جتنا بتا دیا جائے اس سے زیادہ پر اصرار نہیں کرتے تھے اور آدھی ادھوری بات سن کر بڑے پیارے طریقے سے دل کا بوجھ ہلکا کر دیتے تھے۔ ابھی بھی یہی ہوا تھا اس کا دل بڑی حد تک ہلکا ہو گیا تھا۔

اسے سوچوں میں گم دیکھ کر پھر بولے۔
"سب سے اہم بات۔ غیر اہم لوگوں کی باتوں کو اہمیت دے کر اہم لوگوں سے منہ نہیں پھیر لیتے۔ عاصمہ فون پر فون کر رہی ہے۔ بات کر لینا اس سے۔"
پھپھو نے اگر ابا کو اس کے لیے فون کیا تھا تو اس کا مطلب یہی ہوا نا کہ ان کی نظر میں رافعہ کی بات کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ انہیں ارسل پر یقین تھا۔ ایک دم سے وہ پہلے والا ارسل بن گیا تھا۔ وہ اگلے ہی دن لاہور جا پہنچا۔
"قسم سے کئی سالوں بعد گھر میں ایک ہفتہ سکون سے گزرا تھا کہ ارسل واپس آ گیا۔" افق نے اسے دیکھتے ہی خلاؤں میں گھورتے ہوئے کہا۔ جواباً اس نے پاؤں سے جوتا نکال کر اس کی طرف اچھال دیا جو کہ سو فیصد ہدف پر لگا۔ کمر پر ہاتھ رکھتے وہ مصنوعی چیخیں مارتا اٹھ بیٹھا۔
"ویسے زارون کی منگنی کا صدمہ ختم ہو گیا؟"
کمر سہلاتے ہوئے اس نے طنز کیا تھا جس کا اثر ارسل پر تو پتا نہیں ہوا تھا کہ نہیں لیکن اندر آتے زارون کا سکون تباہ ہو گیا۔ افق کی بات سن کر اور سامنے کھڑے ارسل کو دیکھ کر۔ ارسل اس کی منگنی پہ خوش نہیں یہ وہ بات تھی جو وہ سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا۔
"ارے۔ زارون کہاں تک پہنچی پھر بات چیت۔ ہاں؟" اس پر نظر پڑتے ہی ارسل لپک کر اس کی طرف آیا۔
"کون سی بات چیت؟" اپنے کھردرے لہجے پر وہ خود بھی حیران رہ گیا جبکہ ارسل نے دھیان ہی نہیں دیا۔
"یار! منگنی ہوئی ہے تیری۔ منگیتر سے راہ و رسم کہاں تک پہنچے ہیں؟"
وہ ایسا خوش اور پر جوش تھا کہ زارون کو چند لمحے پہلے کی سوچ پر ہی ندامت ہونے لگی۔
"کک..... کہیں بھی نہیں۔"
"کیا مطلب؟ تمہاری بات نہیں ہوئی اس سے؟"
"نہیں۔ اسی شام تو وہ ہاسٹل چلی گئی تھی۔"
اس نے سادگی سے جواب دیا جس پر افق تو ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو گیا تھا۔
کندھے پر دباؤ بڑھاتے ارسل نے اسے صوفے پر بٹھا لیا۔ "یار کس دنیا میں رہتے ہو؟ ڈیجیٹل دور ہے میرے بھائی۔ فون، واٹس ایپ، آئیمو، اسکائپ اور اسنیپ چیٹ کا زمانہ ہے۔"
"میرے پاس اس کا نمبر ہی نہیں ہے۔"
زارون کو اپنی بے وقوفی کا احساس ہو رہا تھا۔
"وہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔ بس شام کو اپنی منگیتر سے کرنے کے لیے باتیں سوچ لو۔"
زارون کو یقین نہیں تھا کہ وہ ایسا کچھ کرے گا لیکن اس کی حیرت کی انتہا نہیں رہی جب وہ شام کو اس کے سامنے اپنی ڈیمانڈ لے کر آ کھڑا ہوا۔
"نمبر تو میں اپنی جان پر کھیل کر لے آیا ہوں لیکن تمہیں ایسے نہیں دے سکتا کیونکہ ہر چیز کی قیمت ہوتی ہے۔"
"اور اس نمبر کی قیمت ہے آئس کریم۔"
زارون کے پوچھنے سے پہلے افق نے قیمت بتا دی تھی۔ اب اس پر الہام بھی نہیں اترتے تھے۔ یہ تو بس افق کو پتا تھا ہر وہ کام جو افق، زارون یا انعم کے لیے ناممکن ہوتا تھا اسے سرانجام دینے کے لیے ارسل کی ڈیمانڈ آئس کریم ہی ہوتی تھی۔
"ہنہ۔ لڑکیوں والی فرمائشیں۔" ساتھ ہی چڑا بھی دیا۔
"اب اور کیا جائیداد میں سے حصہ مانگ لوں؟"
اس سے پہلے کہ بحث مزید بڑھتی، زارون نے اسے پیسے نکال کر تھمائے جسے لے کر وہ فوراً آئس کریم لینے چلا گیا اور جاتے جاتے نمبر زارون کی گود میں پھینک گیا۔ زارون نے احتیاط سے نمبر اٹھا کر جیب میں ڈال لیا۔ خوش گوار سی حیرت تھی کہ وہ کن کاموں میں پڑ گیا تھا۔
پہلے ارسل جس روز وہاں آتا شام سے پہلے

جانے کے لیے نکل پڑتا۔ بہت دیر بھی کی تو شام کے بعد واپسی کے لیے نکل جاتا۔ بہت کم ایسا ہوتا تھا کہ وہ رات دیر تک رک جائے اور آج وہ رات کے دس بجے بھی وہیں پر تھا۔

زارون کے دیے پیسوں سے آئس کریم اڑانے کے بعد اب وہ اور افق زارون کے سر ہو گئے تھے کہ وہ عزہ کو کال کرے۔ زارون کو ان دونوں کے سامنے بات کرنے کے خیال سے ہی پسینے چھوٹ رہے تھے۔ کچھ پہلی بار بات کرنی تھی یہ بھی جھجک تھی۔ جب وہ کسی طرح قابو نہ آیا تو ارسل نے اس کے فون سے عزہ کا نمبر ملایا اور فون اسے پکڑا کر بالکونی سے اندر کمرے میں چلا گیا۔

زارون بھی نسبتاً دور جا کر کھڑا ہوا۔

''السلام علیکم۔'' ائیر پیس سے ابھرتی عزہ کی آواز نے اس کا دل خوشی اور جوش سے بھر دیا۔

''وعلیکم السلام۔'' جواب دے کر اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اور کیا کہے۔

''جی کون؟''

''مم..... میں..... زارون۔'' وہ ایک دم گڑبڑایا۔

''زارون۔ خیریت؟ آپ نے اس وقت فون کیا؟'' وہ الجھن بھرے انداز میں پوچھ رہی تھی۔

بالکونی کی مدھم روشنی میں بھی ارسل نے زارون کے چہرے پر لکھی بے چارگی کی تحریر پڑھ لی تھی۔ تب ہی تو اس کے پاس آئے بنا نہیں رہ سکا۔

''خیریت..... تو ہے۔ بس۔ ویسے ہی مجھے بات کرنی تھی۔''

''اچھا ٹھیک ہے۔ کریں بات۔'' عزہ کی آواز اتنی بلند ضرور تھی کہ رات کے اس خاموش پہر اس کے قریب کھڑے ارسل نے اس کی بات لفظ بہ لفظ سن لی تھی۔ لبوں پر آئی مسکراہٹ اس نے رخ پھیر کر چھپائی۔

''نہیں..... میرا مطلب، کوئی خاص بات نہیں کرنی۔ بس ویسے ہی.....'' زارون اس لمحے نروس ہو چکا تھا۔

''او کے۔ گھر میں سب ٹھیک ہیں؟'' وہ روٹین میں بات کر رہی تھی۔

''ہاں ٹھیک ہیں سب۔ اور تم؟''

''میں بھی۔ اور کچھ؟''

''نہیں، کچھ بھی نہیں۔''

''اچھا میں کچھ ضروری کام کر رہی ہوں پھر بات کریں؟''

پوچھنے سے زیادہ اس کی بات میں بتانے کا عنصر تھا۔ اب وہ کیا کہہ سکتا تھا۔

''ہاں ضرور۔'' ایک گہری سانس لے کر اس نے فون کاٹ دیا۔ تین منٹ اور سترہ سیکنڈ کی کال اس کے اعصاب کے لیے اچھا خاصا امتحان ثابت ہوئی تھی۔

''بس؟'' ارسل نے ہاتھ کے اشارے سے پوچھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''ہونہہ۔'' کہہ کر اس کے ہاتھ سے فون جھپٹ کر وہ ایک بار پھر نمبر ملا چکا تھا۔

''السلام علیکم۔''

''وعلیکم السلام۔ ویسے آفرین ہے عزہ بی بی۔''

''میں نے کیا کیا ہے؟'' وہ حیران ہوئی۔

''مطلب ابھی اور کچھ کرنا تھا؟ اتنا خرچا کر کے بندے نے آپ کا نمبر لیا اور پھر اتنے چاؤ سے آپ کو فون کیا اور.....''

''اور یہ سب تمہارا مشورہ ہوگا۔'' اس کی بات کاٹ کر عزہ اس کی بولتی بند کر چکی تھی۔

''ہاں تو پھر کیا ہو گیا؟'' لمحے میں وہ اپنی جون میں واپس آیا تھا۔

''کچھ نہیں میں بھی سوچ رہی تھی کہ زارون اس قسم کی فضول حرکت کر ہی نہیں سکتا۔'' اس کے اطمینان سے کہنے پر جہاں وہ بھڑک اٹھا تھا وہیں زارون کے دل میں سکون اترا تھا کہ اتنا تو وہ اسے جانتی ہی ہے۔

''فضول حرکت؟ اللہ کی پناہ۔ تمہیں پتا ہے، اس نے تمہارے نمبر کے لیے مجھے رشوت کے طور پر کتنے پیسے دیے ہیں؟''

''جتنے میں تمہاری آئس کریم آ جائے۔'' ایک بار پھر اس کی زبان بند ہوئی تھی۔ اس نے گھور کر فون کو دیکھا۔

ارسل نے کچھ کہا پھر اس نے کچھ کہا پھر ارسل نے پھر عزہ نے۔ فون جو زارون کے ہاتھ میں آیا تو بیالیس منٹ اور چوبیس سیکنڈ کے دورانیے کی کال نے اس کے سینے پر بہت بھاری وزن لاد دیا تھا۔ ضروری کام کرنے والی سب کام بھول گئی تھی ارسل کے لیے۔ اگلے ہی لمحے اس نے فون سے اس کا نمبر ڈیلیٹ کر دیا تھا۔

☆☆☆

شہر کے پوش ایریا میں اس مہنگے شاپنگ مال کی پارکنگ میں کھڑے زارون کا دل چاہ رہا تھا ارسل کو جان سے مار دے۔ وہ مار بھی دیتا اگر اسے یقین ہوتا کہ اپنے بہن بھائی اور عزہ کی نظر میں وہ پہلے والا زارون بن جائے گا۔

آج انعم اور عزہ کی سالگرہ تھی۔ انعم عزہ سے سال بھر چھوٹی تھی لیکن ان کی تاریخِ پیدائش ایک ہی تھی۔ آفس سے واپسی پر اس نے انعم اور عزہ کے لیے تحفے لیے تھے۔

گھر پہنچ کر پتا چلا آج ارسل نہیں آیا۔ اسے لگا آج اس کی دعا قبول ہو گئی ہے۔ انعم کا تحفہ تو اس نے گھر آتے ہی اسے دے دیا تھا۔ اسے پتا تھا عزہ، انعم کے لیے ضرور آئے گی تو تب ہی موقع دیکھ کر وہ بھی اسے تحفہ دے دے گا۔ اسی لیے وہ اس کے آنے کا انتظار کر رہا تھا۔

وہ تو نہیں آئی البتہ ارسل ضرور آ گیا تھا۔ وہ جانتا تھا اب وہ کوئی مہنگا سا تحفہ یا شاید اتنے پیسے تحفے میں دے دے گا کہ زارون اور اس کا تحفہ پسِ منظر میں چلے جائیں گے۔ ہر بار یہی تو ہوتا آیا تھا۔ جہاں ارسل آ جاتا زارون خود بہ خود کنارے لگ جاتا۔ پہلے کبھی اس نے اتنا محسوس نہیں کیا تھا۔ جب سے عزہ سے منگنی ہوئی تھی ارسل اسے برا..... بے حد برا لگنے لگا تھا۔

اسے نہیں پتا ارسل نے کب کیسے امی کو ان سب کو باہر لے جانے کے لیے رضامند کیا۔ وہ بس یہ جانتا تھا کہ ہلسی خوشی پر جوش انداز میں وہ سب باہر جانے کے لیے تیار ہو رہے تھے۔ وہ سب ایسے پر جوش تھے کہ اپنی تمام تر خاموشی کے ساتھ زارون کو سب نے نظر انداز کر دیا تھا۔

ارسل کے ہوتے کسی کا اس کی طرف دھیان جاتا ہی نہیں تھا۔ سب تیار ہو گئے تو جانے کس نے اسے بھی اٹھایا اور غائب دماغی سے وہ بھی ان کے ساتھ آ کر گاڑی میں بیٹھ گیا۔

''آئس کریم کھانے تو نہیں جا رہے نا؟'' ڈرائیونگ سیٹ پر اس کے برابر بیٹھے افق نے اسے چڑاتے ہوئے تصدیق چاہی۔ انداز ایسا تھا کہ اگر ایسا سوچا بھی ہے تو ابھی ارادہ بدل دو۔

''بالکل بھی نہیں۔''

''شکر ورنہ جس طرح ہر وقت آئس کریم آئس کریم کرتے رہتے ہو مجھے لگا، آج بھی آئس کریم ہی کھلاؤ گے۔'' ایک کے بعد ایک گانا چیک کرتے افق نے کہا۔

''اوہ نہیں بھئی۔ آج تو اچھا سا کھانا کھائیں گے۔ وہ بھی زارون کی جیب سے۔ اس کی بہن کی بھی سالگرہ ہے اور منگیتر کی بھی۔''

اشارے پر گاڑی روکتے اس نے خوش مزاجی سے جواب دیا۔

اس کی بات پر زارون ہوش میں آیا تھا۔ جس ایریا میں وہ تھے یہاں اپنی جیب میں رکھے سارے پیسوں سے وہ آئس کریم بھی شاید ہی افورڈ کر پاتا۔ آنے سے پہلے پتا ہوتا تو شاید وہ آنے سے انکار کر دیتا یا پھر امی سے ہی کچھ پیسے لے آتا۔ اتنے اہم موقع پر وہ اپنے بہن بھائی اور عزہ کو نہ کر کے دل نہیں دکھانا چاہتا تھا۔ ارسل نے اسے ایسے زہر سے مارا تھا کہ وہ پانی بھی نہیں مانگ سکتا تھا۔

زارون اس وقت بہت تفصیل سے وہ سب سوچ رہا تھا جس کے خیال پر وہ وہم سمجھ کے سر جھٹک

لیتا تھا۔ثابت ہوا کہ ارسل عباس، عزہ کی نظروں میں گرانے کے لیے اسے یہاں لایا تھا۔نا صرف عزہ بلکہ اس کے اپنے بہن بھائی کی نظروں میں بھی۔وہ اپنوں کی نظر میں ذلیل ہونے والا تھا صرف اس ارسل کی وجہ سے۔ارسل کے لیے اس کے دل میں شدید ترین نفرت بھر گئی تھی۔

گاڑی کب کہاں رکی وہ کیسے باہر نکلے اسے کچھ پتا نہیں تھا۔وہ چاروں باتوں میں مگن اس سے کافی دور نکل گئے تھے جب اس کی غیر موجودگی کو محسوس کر کے ارسل اس کی طرف پلٹا۔ان سب کو آگے بڑھنے کا کہہ کر وہ اس کی طرف آ گیا۔

زارون کا دل چاہا، دھکا دے کر اسے خود سے دور کر دے۔کیا اسے زارون کی خاموشی، اس کی ناپسندیدگی، بے بسی کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا؟ یقیناً آ رہا تھا سب نظر۔نظر انداز نہ کرتا تو اس کی عزت دو کوڑی کی کیسے کرتا؟

''کیا یار! صدمے سے کوما میں تو نہیں چلے گئے؟''

قریب آ کر ہنستے ہوئے اس نے جیکٹ کی جیب سے ہاتھ نکالا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنی طرف کھینچا۔

''چھپھو سے بہت تھوڑے وقت کے لیے اجازت لی ہے۔اماں بھی گھر پر انتظار کر رہی ہیں۔ آجاؤ بس۔''

وہ افق انعم اور عزہ کی جانب مڑ گیا۔

زارون نے نظر جھکا کر اس ہاتھ کی طرف دیکھا جسے ارسل نے پکڑ کر کھینچا تھا۔

نہیں، اس نے ہاتھ پکڑ کر کھینچا نہیں تھا بلکہ غیر محسوس طریقے سے اس کے ہاتھ میں کچھ تھمایا تھا۔ مدہم زرد روشنی میں وہ اپنے ہاتھ میں پکڑے پانچ پانچ ہزار کے نوٹ با آسانی دیکھ سکتا تھا۔

ایک لمحے کے لیے اس کا سانس رکا۔ارسل اگر چاہتا تو خود ان سب کو کھانا کھلا سکتا تھا، شاپنگ کروا سکتا تھا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔اس نے زارون کو موقع دیا تھا کہ وہ ان سب کی خوشیوں کی وجہ بنے۔

وہ جانتا تھا اگر اس نے زارون کو گھر میں پیسے دینے چاہے یا ایسا کچھ کہا تو وہ وہیں انکار کر دے گا۔اگر وہ سب اس پر ڈال کر گھر سے نکلتا تو زارون کہیں بھی جانے کے لیے راضی ہو جاتا لیکن اس ایریا میں اس شاپنگ مال میں نہیں۔وہ اس دن کو سب کے لیے یادگار بنانا چاہتا تھا۔اس لیے اس نے بڑی ترکیب سے پروگرام سیٹ کیا کہ زارون فرار کے لیے کوئی بہانا نہ کر سکے۔

ارسل نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔اس کی آنکھوں میں نرم سی التجا پڑھنے میں زارون کو کوئی مشکل نہیں ہوئی۔سن ہوتے دماغ کے ساتھ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا وہ ان سے آ ملا۔

''اچھا اب ایسا ہے کہ تم عزہ کو لے جاؤ اور کوئی اچھا سا تحفہ دلا لاؤ۔میں اس بھوکی کو کچھ بھی سستا سا دے دلا کر فارغ کر لوں۔پھر کھانے پر ملتے ہیں۔''

ارسل کی بات پر انعم نے اس کے کندھے پر مکا مارا۔ جواباً اس نے اس کی گردن میں بازو ڈال کر اسے ایک طرف گھسیٹا۔افق کی گردن اس کے دوسرے بازو میں تھی۔زارون یا عزہ کو کچھ کہنے کا موقع دیے بنا وہ تیزی سے ان سے دور ہوئے۔عزہ نے ایک نظر ان تینوں کو دیکھا اور لبوں پر مسکراہٹ سجا کر زارون کی طرف نگاہیں پھیر لیں۔

برقی زینہ طے کر کے وہ شاپنگ مال کے اوپری حصے میں پہنچے۔روشنی سے مزین دکانیں ساز و سامان سے بھری پڑی تھیں۔ایک سے ڈیڑھ گھنٹے تک وہ ایک دوکان سے دوسری دوکان تک بے مقصد گھومتے پھرے۔اس دوران عزہ کے نہ نہ کرتے بھی زارون نے اس کے لیے ایک بہت خوبصورت اور نفیس سا ہار لیا تھا۔عزہ جانے اس کا خیال کر رہی تھی یا تکلف برت رہی تھی۔اس کے بعد اس نے زارون کو کچھ بھی لینے نہیں دیا۔

اگرچہ عزہ کے ساتھ اس کی کوئی خاص بات نہیں ہوئی تھی پھر بھی وہ ساتھ تھی یہی بات خاص

ھی۔عزہ کے ساتھ گزرے خواب جیسے اس وقت کا اعجاز تھا کہ جب وہ کھانے کے لیے نکلنے لگے تو زارون وہ زارون تھا ہی نہیں جوان کے ساتھ آیا تھا۔

''بس یہ ایک ہار لے کر دیا ہے تمہارے اس کنجوس منگیتر نے؟'' انعم کے پوچھنے پر وہ اسے زارون کا دیا تحفہ دکھا رہی تھی جب بیک ویو مرر میں اسے دیکھتے ارسل نے چڑایا۔

حیرت انگیز طور پر زارون کو یہ سب برا نہیں لگ رہا تھا۔ بلکہ وہ تو اس چھیڑ چھاڑ سے لطف اندوز ہو رہا تھا اور اتنی ہی حیرت انگیز بات یہ بھی تھی کہ عزہ کو اس کا ایسے بولنا برا لگ گیا تھا۔

''اب ایسی بھی بات نہیں ہے۔میں نے خود ہی کچھ اور لینے سے منع کر دیا تھا۔''

''اوئے ہوئے۔ کفایت شعار بیوی۔ یار زارون! اس نے تو ابھی سے تیرا اور تیری جیب کا خیال رکھنا شروع کر دیا ہے۔''

زارون مسکرا دیا۔اسے عزہ کا اپنے حق میں بولنا اچھا لگا تھا جبکہ عزہ خفت کے مارے سرخ ہوئی تھی۔اس کا دل چاہ رہا تھا سب چھوڑ چھاڑ کر کہیں بھاگ جائے۔منہ بنا کر وہ سب کی خوشی برباد نہیں کرنا چاہتی تھی تب ہی اتنی ناپسندیدگی کے بعد بھی پر سکون بیٹھی رہی۔

اچھے سے ریسٹورنٹ میں کھانا کھا کر وہ رات گئے گھر پہنچے۔ارسل نے دروازے سے ہی رخصت لے لی کیونکہ ہمیشہ کی طرح وہ اس بار بھی انعم کی سالگرہ بھول گیا تھا اور ہمیشہ کی طرح اس کا انتظار کر کر کے شام ڈھلے جب انعم نے اسے فون کیا تو اس وقت تک اماں کو بھی فون کر کے گھر آنے کا کہہ چکا تھا۔اب کافی دیر ہو چکی تھی اور اماں انتظار کر رہی ہوں گی یہی سوچ کر وہ جلد از جلد گھر کے لیے نکل جانا چاہتا تھا۔

''ارسل۔''

آواز پر اس نے مڑ کر دیکھا۔زارون اس کی طرف ہی آ رہا تھا۔ارسل نے ہاتھ اٹھا کر اسے کچھ بھی کہنے سے منع کیا لیکن وہ پھر بھی آ کر اس سے بغلگیر ہوا۔

''یارررر.....''

''کچھ نہیں ہوتا۔جا جا کے اندر سو اور عزہ کے ساتھ زندگی کے پیارے پیارے خواب دیکھ۔''

''ہوتا تو ہے یار۔ یہ میری زندگی کا سب سے بہترین دن تھا — ویسے تو ہے بہت بڑا کمینہ۔''

الگ ہوتے اس نے ارسل کے سینے پر مکا مارا۔

''میں شکریہ نہیں ادا کر سکتا۔بس یہ تیرا احسان ہے مجھ پر۔جتنی جلدی ہو اپیے بھی۔''

''لوگ کہتے ہیں پیسوں سے خوشیاں نہیں خریدی جا سکتیں۔ اگر میں اپنے لیے اپنے بہن بھائیوں کی خوشیاں خرید سکتا ہوں تو احسان مند مجھے ہونا چاہیے نا؟ باقی اگر تم بھائی نہ سمجھو تو جو مرضی کرو۔''

یہ شاید پہلی بار تھا جب زارون نے اسے سنجیدہ دیکھا تھا۔

''او نہیں یار۔ بھائی ہے تو میرا۔اس میں کیا شک ہے۔''

ایک بار پھر اس نے ارسل کو گلے لگا لیا۔اپنی ساری سوچوں پر اسے بے حد ندامت ہو رہی تھی تب ہی تو خلافِ عادت جذباتی ہو رہا تھا۔یہ اس کی زندگی کے بہترین دنوں میں سے ایک تھا اور اس کی وجہ ارسل تھا۔احسان مند ہونا تو بنتا تھا۔

☆☆☆

تایا کا عرفان آج جرمنی جا رہا تھا اور امی ابو نے اسے رخصت کرنے جانا تھا۔امی اسے ساتھ لے جانے پر بضد تھیں۔نہ نہ کرتے بھی وہ اسے ساتھ لے کر ہی گئیں۔

''بھابھی نے اتنی دفعہ کہا ہے۔برا لگتا ہے۔''

تایا تائی تو اسے ائیر پورٹ تک چھوڑنے گئے تھے جب کہ ان سب نے اسے گھر سے ہی رخصت کر کے واپسی کا ارادہ بنا لیا تھا۔برا ہوا کہ پھپھو کی ساس کے انتقال کی خبر آ گئی اور امی ابو وہیں سے پھپھو

کے ساتھ ان کے گھر چلے گئے۔ جبہ تو ان کے جانے سے پہلے ہی سو چکی تھی۔ وہ پھپھو کی طرف جاتی یا تایا کی طرف ٹھہرتی اس کا اگلا دن تو پکا ضائع تھا۔ اس لیے وہ ہر صورت گھر جانا چاہتی تھی۔ امی نے مہربانی یہ کی کہ عاصمہ خالہ کو فون کر دیا کہ افق کو اسے لینے بھیج دیں۔

زارون کی تو لاٹری نکل آئی تھی۔ افق کرکٹ کھیلتے ہوئے زخمی ہو گیا تھا اور یہ بات وہ نہیں جانتی تھی۔ جب دروازے پر عزہ نے اسے دیکھا تو حیران ہوئی۔ راستے میں اس نے افق کی چوٹ کے بارے میں بتایا۔ سارے راستے میں ایک یہی بات تھی جو ان کے درمیان ہوئی۔ وہ اسے اتنا کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن مناسب الفاظ نہیں مل رہے تھے۔ سارا راستہ وہ لفظوں کے جوڑ توڑ کرتا آیا تھا۔ زارون کی بائیک پر اس کے ساتھ بیٹھے ہوئے بھی عزہ اس کے ساتھ نہیں تھی۔

"کیا بھائی۔ باہر جا کر فون تو اٹھا لیا کریں۔"
وہ گھر پہنچے تو انعم ان کے انتظار میں باہر ہی بیٹھی تھی۔

"کیوں کیا ہوا؟"

"ہونا کیا ہے۔ میرے کمرے کا واحد انرجی سیور بھی اللہ کو پیارا ہو گیا ہے اور میں بتا رہی ہوں میں اندھیرے میں نہیں سونے والی۔"

"تو زیرو کا بلب آن کر کے سو جاؤ۔" موبائل پر اس نے وقت دیکھا۔ رات کے ساڑھے گیارہ کا وقت تھا۔

"اس وقت تک تو دکانیں ویسے بھی بند ہو چکی ہوتی ہیں۔"

"وہ پہلے سے ہی خراب ہے۔۔" اس نے منہ بسورا۔

"ایسا کرو زارون! تم انعم کے کمرے میں سو جاؤ اور یہ دونوں افق کے کمرے میں چلی جاتی ہیں۔ میں تمہارے کمرے میں افق کے پاس سو جاتی ہوں۔" امی نے آسانی سے مشکل کا حل نکالا تھا۔

"میں گھر چلی جاتی ہوں۔" عزہ جانتی تھی کہ خالہ نہیں مانیں گی پھر بھی آدھی رات کو اس طرح بے آرام کرنا اسے اچھا نہیں لگ رہا تھا سو کہے بنا رہ نہیں سکی۔

"یہ بھی تو گھر ہی ہے۔ ساری رات گھر میں اکیلی رہو گی تو مجھے نیند نہیں آئے گی۔ صبح چلی جانا اب یہیں سو جاؤ۔"

ان کی محبت کے سامنے وہ مزید کچھ کہہ نہیں سکی۔ انعم کے پیچھے وہ بھی خاموشی سے افق کے کمرے کی طرف چل پڑی۔

کمرے کے اندر داخل ہوتے ہی دائیں اور بائیں طرف ایک ایک سنگل بیڈ لگا ہوا تھا جن کے ساتھ ایک ایک سائیڈ میز رکھی تھی۔ ایک بیڈ کے پاؤں کی طرف کپڑوں کی الماری تھی جس کے ساتھ ہی اٹیچ واش روم کا دروازہ تھا۔ دوسرے بیڈ کے سامنے میز پر کمپیوٹر پڑا تھا جس کے سامنے دو کرسیاں پڑی تھیں۔

وہ سب جلدی سو جانے کے عادی تھے۔ خالہ اس کے لیے اور انعم اندھیرے کی وجہ سے جاگ رہی تھی۔ تب ہی تو کمرے میں داخل ہوتے ہی دھم سے بستر پر گری اور فوراً نیند کی وادی میں اتر گئی۔ عزہ کو اس کی نیند پر رشک آ رہا تھا۔ وہ کبھی اس طرح کی نیند نہیں سو سکی تھی۔ بے پرواہ اور اچانک آنے والی گہری نیند۔

اسے پتا تھا اسے یہاں نیند نہیں آنے والی، اس لیے کرسی پر بیٹھی تھی۔ دوپہر سے مسلسل بیٹھے رہنے کی وجہ سے اس کی کمر میں اکڑاہٹ سے درد شروع ہو گیا تھا۔ بستر پر لیٹنے کا سوچا تو سب سے پہلا خیال کپڑوں کا آیا۔ نفیس سا برانڈڈ سوٹ پہن کر سونا تو دور وہ لیٹنے کا بھی نہیں سوچ سکتی تھی۔ اسی لیے اخلاقیات کو طاق پر رکھتے اس نے انعم کا کندھا ہلایا۔

"انو! میں یہ کپڑے پہن کر نہیں سو سکتی۔ ڈو سمتھنگ پلیز۔"

"ایسا کرو الماری۔ نن..... نہیں..... الماری سے نہیں۔ واش روم میں سے افق کی کوئی بھی شرٹ

پہن لو۔ صبح کسی کے بھی آنے سے پہلے بدل لینا۔ الماری میں سے کچھ مت لینا ورنہ صبح اس نے وہی پہننا ہوگا۔ بلاوجہ سر کھائے گا۔'' جواب دے کر وہ پھر سو گئی۔

عزہ جھنجھلا کر رہ گئی۔ کتنی ہی دیر ادھر سے ادھر چکر کاٹتی رہی اور جب ہمت جواب دے گئی تو سارے میز ز ایک رات کے لیے کھڑکی سے باہر پھینک کر واش روم میں گھس گئی۔ دو تین شرٹس کھونٹی پر لگی تھیں لیکن ان میں سے کوئی بھی ایسی نہیں تھی جس کے بارے میں وہ سوچ ہی سکتی۔ ''کتنے گندے ہوتے ہیں لڑکے۔'' چڑتے ہوئے وہ یہی سوچ سکی۔ تب ہی اس کی نظر ہینگر میں لگی ایک شرٹ پر پڑی۔ نیلے چیک والی یہ شرٹ پہنی ہوئی بھی نہیں لگ رہی تھی۔ شاید پہننے کے لیے رکھی ہو اور ابھی پہنی نہ ہو۔

شاور لے کر اپنے ٹراوزر پر شرٹ پہن کر وہ باہر آ گئی۔ شرٹ میں سے اٹھتی پرفیوم کی مہک بتا رہی تھی کہ یہ شرٹ پہنی ہوئی ہے۔ مجبوری کا نام شکریہ کیا ہو سکتا تھا اب۔ کانوں میں پہنے سونے کے چھوٹے چھوٹے ٹاپس اتار کر جیب میں ڈالتے چپ چاپ جا کر وہ بستر پر لیٹ گئی۔ انجان بستر اور شرٹ سے اٹھنے والی بھینی خوشبو۔ نیند آنکھوں سے میلوں دور اور خواب پلک جھپکنے کی دوری پر تھے۔ ایک الہام کی صورت خوشبو نے بھید کھولا اور کچھ جانے پہچانے لمس کی بانہوں میں وہ جانے کب نیند کے جھولے میں جھول گئی۔

اتنی دیر سے سونے کے باوجود صبح اس کی آنکھ جلدی کھل گئی۔ شرٹ احتیاط سے اتار کر ہینگر پر لٹکا کر اس نے اپنے کپڑے پہن لیے تھے۔ خالہ نماز کے لیے اٹھیں تو انہیں جانے کا بتا کر وہ بغیر ناشتہ کیے گھر چلی گئی۔

☆☆☆

اس شام عاصمہ نے بریانی بنائی تھی لیکن ارسل جو پچھلے کتنے دنوں سے صرف تھوڑی دیر کے لیے چہرہ دیکھنے اور دکھانے آ رہا تھا آج بالکل فارغ ہو کر آ بیٹھا اور اس کی فرمائش تھی کہ بریانی نہیں کڑاہی کھانی ہے۔ بہت کم وہ کسی چیز کی فرمائش کرتا تھا اور جو وہ کوئی فرمائش کرتا تھا تو عاصمہ پر اس فرمائش کو پورا کرنا جیسے فرض ہو جاتا تھا۔ اب بھی وہ کچن میں کڑاہی بنا رہی تھیں اور ارسل، افق کے کمرے میں کمپیوٹر آن کر کے بیٹھا ہوا تھا۔

ایڈشیرن کا شیپ آف یو فل والیوم میں سنتا' آنکھیں بند کیے انجوائے کر رہا تھا۔

''پچھلی رات تم میرے کمرے میں تھے۔''

وہ گانے میں اتنا کھویا ہوا تھا کہ اسے کھلے دروازے سے اندر آنے والے زارون کا پتا ہی نہیں چلا۔ کمرے میں کسی کی موجودگی محسوس کر کے اس نے آنکھیں کھولیں تو زارون کو سامنے کھڑے پایا۔ اس کی آنکھوں میں کچھ ایسا تاثر تھا جیسے اسے چوری کرتے ہوئے پکڑ لیا ہو۔ اس نے گانا بند تو نہیں کیا تھا البتہ آواز کچھ کم کر دی تھی۔

''آؤ زارون! بیٹھو۔''

ایک کٹیلی نظر اس پر ڈال کر زارون کچھ کہے بنا باہر چلا گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اسے ہوا کیا ہے۔ سسٹم شٹ داؤن کر کے وہ بھی کمرے سے باہر نکل آیا۔ کوریڈور کے اختتام پر پڑا فون کب سے بج رہا تھا۔ جب تک اس نے ریسیور اٹھایا نیچے سے انعم فون اٹھا چکی تھی۔ دوسری طرف عزہ تھی۔

''انو! رات میں نے جو شرٹ پہنی تھی افق کی۔ اس میں میرے گولڈ کے ٹاپس رہ گئے ہیں نکال کر سنبھال کر رکھ لو یا جا کر امی کو دے آؤ۔''

''کون سی والی پہنی تھی؟'' اس نے عزہ کو شرٹ پہنے دیکھا نہیں تھا اس لیے پوچھنے لگی۔

''نیلی چیک والی۔ ہینگر پر لگی تھی۔ میں اتار کر وہیں ہینگ کر آئی تھی۔

''افق کی تو کوئی..... اوہ اچھا۔ وہ ارسل کی شرٹ ہے۔ میں بھی کہوں، افق اتنا تمیز دار کہاں سے ہو گیا۔'' انعم کی وضاحت پر فون کے دوسری طرف خاموشی چھا گئی تھی۔ ساری رات بے چین رکھنے والی

خوشبو نے دن کا سکون بھی چرا لیا تھا۔

''جس کی بھی تھی۔ تم بس جا کر ٹاپس نکال لو۔ اللہ حافظ۔''

آہستگی سے فون کریڈل پر ڈال کر ارسل تیزی سے کمرے میں واپس چلا گیا۔ اسے پتا تھا اب انعم فوراً اوپر آئے گی۔

عزہ نے اس کی شرٹ کیوں پہنی؟ اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔ وہ سوچ رہا تھا شاید کوئی غلط فہمی ہوئی ہو حالانکہ اس کی گنجائش تو نہیں تھی۔ پھر بھی انعم کے ہاتھ میں اپنی شرٹ دیکھ کر اس کی غلط فہمی دور ہوئی تھی۔

''کیا ہوا؟'' اپنی شرٹ کنگھالتے دیکھ کر اس نے انعم سے پوچھا۔ جواباً انعم نے اسے رات کا قصہ سنایا تو اسے زارون کا رویہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی۔

انعم کے جانے کے بعد اپنی شرٹ کو احتیاط سے تہہ کر کے ساتھ لیے وہ کسی کو بتائے بنا خاموشی سے اس گھر سے نکل گیا۔ ابھی وہ راستے میں تھا جب پھپھو کا فون آ گیا۔ ڈیش بورڈ پر پڑے فون پر نمبر دیکھ کر اس نے کال وصول کی۔

''ارسل! کدھر ہو بیٹا؟ میں کھانا بنا کر لائی ہوں اور تم غائب؟''

''پھپھو! ایک حادثے کی وجہ سے جلدی نکلنا پڑا۔ بتانے کا وقت نہیں تھا۔'' اس نے جھوٹ نہیں بولا تھا۔ حادثہ ہی تو ہوا تھا اس کے ساتھ۔

''اوہو۔ اللہ خیر کرے، سب ٹھیک تو ہے؟ زیادہ نقصان تو نہیں ہوا؟''

''پتا نہیں پھپھو۔ ابھی تو کچھ بھی نہیں پتا۔ میں آپ کو بعد میں فون کرتا ہوں۔''

اس نے فون نہیں کاٹا تھا بلکہ ان سے رابطہ کاٹا تھا۔ زندگی بھر کا۔

☆☆☆

''اور بھئی جوانو! طبیعت شبیعت تو ٹھیک ہے نا؟''

نیند سے خالی رات گزار کر وہ جاگنگ کے لیے نہیں جا سکا۔ ابا جانتے تھے کہ وہ بلاوجہ جاگنگ کے لیے جانا نہیں چھوڑتا اس لیے اس کے کمرے میں چلے آئے۔

''جی ابا! ٹھیک ہوں، بس ایسے ہی۔''

کیسے ہی؟'' وہ شرارت سے مسکرائے۔

''ویسے ہی..... ایسے..... اور کیسے؟'' اس نے بھی شرارت سے جواب دیا۔

''ایسے یا ویسے..... جیسے بھی۔ جلدی اٹھ کر کھانے کے لیے پہنچ نہیں تو تیری اماں کھانا اٹھا کر اندر ہی لے آئے گی۔''

بستر سے اٹھتے وہ باہر جاتے ہوئے بولے تو سر ہلا کر وہ تازہ دم ہونے کے لیے واش روم میں گھس گیا۔

تازہ دم ہو کر وہ ناشتہ کرنے ان کے ساتھ آ کر بیٹھ گیا۔ دیسی گھی میں چپڑی روٹی پایوں کے شوربے میں ڈبو ڈبو کر اس نے ہمیشہ کی طرح پیٹ بھر کر کھانا کھایا۔

ہر بار کھانا کھا کر وہ سب سے پہلے اٹھتا تھا لیکن آج وہ بڑے سکون سے بیٹھا تھا۔

''آج خیر تو ہے؟'' کھانے کے بعد دعا کر کے ہاتھ چہرے پر پھیر کر ابا اس کی طرف متوجہ ہوئے۔

''خیر تو ہے۔ میں بس یہ کہہ رہا تھا، میں بھی آپ کے ساتھ کام پر جاؤں گا۔''

برتن اٹھاتے زینب نے رک کر ایک نظر اس کا چہرہ دیکھا۔ ان دونوں کے لیے بڑی غیر متوقع بات تھی۔

''اب لگے ہاتھ بتا دو، کام کا خیال آیا کیسے۔'' ہزار خواہش کے بعد بھی انہوں نے کبھی رسمی طور پر بھی اسے کام کی ذمہ داری اٹھانے کا نہیں کہا تھا۔ اسی لیے حیران تھے کہ اسے یہ خیال آیا کیسے۔

''دیکھیں ابا۔ اب میں بڑا ہو گیا ہوں اور اماں سے پوچھ لیں۔ اماں کی بھی بڑی خواہش ہو گی اپنے اکلوتے بیٹے کے سر پر سہرا سجانے کی۔ پوتے پوتیاں

کھلانے کی۔ ویسے بھی اماں کی ساری عمر چولہے چوکے میں گزر گئی ہے۔ اب کوئی تو ہو جوان کی ذمہ داری سنبھال سکے۔ پھر آپ نے بھی ساری زندگی کاروبار میں لگادی۔

اب آپ دونوں انجوئے کریں۔ آپ کا کام میں سنبھالتا ہوں، اماں کو بہولا دیتے ہیں۔ آپ کو تو پتا ہی ہے آج کل لڑکی والوں کے کتنے مطالبات ہوتے ہیں اور سب سے پہلا مطالبہ تو کام اور کاروبار کا ہوتا ہے۔ بس اسی لیے۔"

شرارتی لہجے میں بات مکمل کر کے اس نے ان دونوں کا چہرہ دیکھا جہاں خوف تھا۔ عجیب سا خوف۔

"کوئی لڑکی پسند کر لی ہے؟" اسے لگا یہ ان کے خوف کی زبان ہے۔ لیکن نہیں یہ خوف اولاد کا اپنی مرضی کی شادی کر لینے کے خوف جیسا نہیں تھا۔ یہ تو کچھ اور ہی تھا۔ بظاہر ہلکے پھلکے لہجے میں بات کرتے ان کے الفاظ کانپ رہے تھے۔

"اوہو۔ نہیں ابا! یہ تو اماں کے کام ہیں۔ اماں کے بھی تو ارمان ہوں گے نا تو یہ کام اماں پر چھوڑ رکھا ہے۔"

ہشاش بشاش لہجے میں کہتے وہ اتنا سچا لگا تھا کہ عباس علی کے سارے اندیشے بے موت مر گئے تھے۔

"مجھے لگا لاہور میں کوئی پسند کر لی ہے۔"

"کہاں ابا۔ لاہوری لڑکیاں مجھ پینڈو کو لفٹ ہی نہیں کرواتیں۔" اس نے منہ بسورا۔

"پھر تو سارے لاہور کی لڑکیاں اندھی ہوئیں۔ ہیرے جیسا بیٹا ہے میرا۔" ان کے چہرے پر اولاد کی محبت کے سارے رنگ موجود تھے۔

"اماں اور آپ کو ہی لگتا ہوں۔ کمہار کا برتن کتنا بھی ٹیڑھا ہو، اسے اچھا ہی لگتا ہے۔ اچھا اب بتائیں پھر کب سے چلوں آپ کے ساتھ فیکٹری؟" موضوع بدلتا دیکھ کر وہ پھر اس بات پر آ گیا تھا۔

"ابھی چلو۔ ادھر ہی جا رہا ہوں۔ پہلے یہ بتا دو، تمہارے لاہور والوں کا کیا ہو گا؟ ادھر نہیں جانا کیا؟" اٹھتے ہوئے عباس علی کو اچانک یاد آیا۔

"وہ اپنے گھر میں خوش ہیں اور میرا گھر تو یہاں ہے آپ کے ساتھ میری اماں کے ساتھ۔ بہت انجوائے ہو گیا۔ اب بس آپ دونوں کے لیے آسانیوں کا وقت آنے والا ہے ان شاء اللہ۔"

سنجیدگی سے کہتے آگے بڑھ کر اس نے ان کے کندھے پر سر رکھا اور پاس کھڑی زینب کو بازو سے پکڑ کر پاس کھینچتے دونوں کے پہلو سے لگ گیا۔

الگ ہونے پر اس نے زینب کے چہرے پر وہ محبت دیکھی تھی جس کی خواہش اس کے ساتھ پل کر جوان ہوئی تھی۔

☆☆☆

دو ماہ کی قلیل مدت میں اس نے اتنی محنت کی تھی کہ عباس علی کو اپنی قسمت پر رشک آنے لگا تھا۔ فیکٹری کے سارے معاملات اس نے اپنے ہاتھ میں لے لیے تھے جس سے عباس علی کی ذمہ داریاں از خود اس کے کندھوں پر منتقل ہو گئی تھیں۔

بوڑھے کندھوں سے بوجھ سرکا تو سینہ خود بخود چوڑا ہو گیا۔ اور کیوں نہ ہوتا، ان کا بیٹا ان کا فخر اور مان جو بن گیا تھا۔ حقیقی معنوں میں اس نے فیکٹری میں جان لگا دی تھی۔ ان دو ماہ میں اس نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا تھا۔

پھپھو کے فون آتے تھے لیکن ہر بار وہ طریقے سے انہیں ٹال دیتا تھا۔ اتنے سال ماں باپ کی ناپسندیدگی دیکھتے ہوئے بھی وہ ان سے جڑا رہا تھا۔ وہ اس گھر کا فرد نہیں تھا اور ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ جانتا تھا اور برا بھی نہیں مانتا تھا۔

بات اب وہ تھی جس کے بارے میں وہ اپنے آپ سے بھی بات نہیں کر سکتا تھا۔ آنکھیں بند کر کے، کان لپیٹ کر اسے اب زندگی کو ایک ایسے دائرے میں قید کرنا تھا جس کے کسی زاویے پر وہ دو آنکھیں نہ ابھر سکیں جو یاد کا دامن کھینچ کر ہر لمحہ اسے بلاتی تھیں۔

☆☆☆

جم میں ایک لڑکے کے ساتھ اس کا جھگڑا ہو گیا تھا۔ وہ سیڑھیوں کے قریب کھڑا تھا اس لیے غیر ارادتاً لگنے والے دھکے سے لڑھکتا ہوا نیچے جا گرا۔ اس لڑکے کا مقصد اسے اس بری طرح سے زخمی کرنا نہیں تھا اس لیے اسے اس طرح خون میں لت پت دیکھ کر خود ہی اسے اٹھا کر ہسپتال لے گیا۔ سر پر لگنے والا زخم کچھ زیادہ ہی گہرا آ گیا تھا۔ اس کا خون نہیں رک رہا تھا۔ اس وقت اسے اماں ابا کی فکر تھی۔ ذرا سا وقت ملتے ہی اس نے ابا کو فون کر دیا تھا۔

''اماں کو بتا دیں، میں دیر سے آؤں گا۔ پریشان نہ ہوں۔''

مختصر سی بات کر کے اس کے اندر سکون اُتر آیا تھا کہ اب وہ پریشان نہیں ہوں گے۔

مرہم پٹی کروا کر اسے وہ لڑکا ہی گھر تک چھوڑ گیا تھا۔ جم قریب ہونے کی وجہ سے وہ پیدل ہی چلا جایا کرتا تھا۔ اس لیے چابی سے گیٹ کا ذیلی دروازہ کھول کر وہ بنا کسی آواز کے اندر داخل ہوا اور دبے پاؤں اپنے کمرے کی طرف چلنے لگا۔ اماں کے کمرے کی بتی جل رہی تھی۔ وہ اس خون آلود شرٹ میں ان کے سامنے نہیں جانا چاہتا تھا۔ کمرے سے کافی پیچھے ہی اسے اماں کے کمرے سے بوا الفت کی آواز آ رہی تھی۔

اس وقت بھی بوا زور و شور سے اماں کو لتاڑ رہی تھی۔

''بالوں میں چاندی اترنے کو آئی لیکن نہ آئی تو عقل نہ آئی۔ جا کے سن، سارا خاندان کیا باتیں کر رہا ہے۔''

بوا کی باتیں ایسی ہی ہوتی تھیں۔ سنسنی خیز۔ اسی لیے موضوع پر دھیان دیے بغیر وہ نپے تلے قدم اٹھاتا کمرے کی طرف جانے لگا۔

''بوا! خاندان والوں کا تو کام ہی باتیں کرنا ہوتا ہے۔ ویسے بھی ارسل اب ادھر ہی رہتا ہے۔ گھر میں۔ کہیں نہیں جاتا۔ لاہور بھی نہیں۔ فون تک نہیں کرتا۔ مجھے خود عاصمہ نے بتایا ہے۔''

کمرے کے سامنے سے گزرتے اس نے زینب کی پرسکون آواز سنی۔

''تو جو بھی کہہ لے۔ عاصمہ نے دل بڑا کر کے اپنے کلیجے کا ٹکڑا تجھے دے تو دیا لیکن کوشش کے باوجود چھوڑ نہیں سکی۔ تب ہی تو آج بھی تیرا دل اور گھر دونوں خالی ہیں۔''

الفت نے کھڑکی کے قریب سایہ دیکھ کر پہلے سے بھی بلند آواز میں کہا۔ ارسل کے قدم وہیں جم گئے تھے۔ بوا کیا کہہ رہی تھیں۔

''ایسا کچھ نہیں ہے بوا! بس خون کی کشش اس گھر میں لے جاتی رہی ہے۔ ظاہر ہے ماں باپ بہن بھائی ہیں اس کے۔''

''تو مان لے نا، اتنے سال پرورش کر کے بھی تو ارسل کی ماں نہیں بن سکی۔''

درد کی ایک تیز لہر تھی جس نے پورے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ ارسل، عاصمہ عباس کا بیٹا تھا۔ قسمت نے اس کھیل میں ان کا کیسا ساتھ دیا تھا کہ نام کی مماثلت کے باعث وہ اس حقیقت سے لاعلم ہی رہا۔

بجلی کی تیزی سے وہ اپنے کمرے کی طرف لپکا تھا۔ گاڑی کی چابیاں اٹھا کر باہر نکلتے اسے اس بات کی پروا نہیں تھی کہ ٹھوکر سے کون سا گلدان لڑھکا، کتنے ٹکڑوں میں بٹا اور کتنا شور مچا۔

زینب باہر کی طرف بھاگی تھی اور اس کے ساتھ الفت بھی۔ زینب کٹے شہتیر کی طرح گری تھی۔ اپنی ''کرنی'' کو ''ہونی'' کی شکل میں ڈھال کر عباس علی کو فون کرتی الفت بڑی مسرور تھی۔ سالوں کی بھڑکتی آگ پر ٹھنڈی بوندیں برسنے لگی تھیں۔

کیا ہوا جو وہ عباس سے دو تین سال بڑی تھی۔ خالہ کی بیٹی ہونے کے ناتے اس پر پہلا حق تو اسی کا بنتا تھا نا۔ جب خالہ نے خاندان کی سب سے یتیم مسکین لڑکی کے نام سے اس کا نام جوڑا تو آگ تو تب ہی بھڑک اٹھی تھی۔ پھر ان دونوں کی اولاد سے محرومی پر یک گونہ سکون ملا تو چہیتی بہن نے اپنے

آنگن کے پھول سے ان کا گھر مہکا دیا۔ اللہ کی کرنی کہ دھن دولت بھی اس بچے کی قسمت کا ٹوٹ کے برسا۔ وہ انگاروں پر لوٹتی تھی۔ ہر بار جان بوجھ کر وہ زینب کے دل پر اپنی باتوں سے بوجھ بڑھا جاتی اور ان باتوں کا اثر ایسا ہوا کہ زینب ساری زندگی اس بچے پر ممتا نچھاور نہ کر سکی۔ اب جا کر تو اس کے دل سے ارسل کے چلے جانے کا خوف نکلا تھا کہ جادوگرنی نے جادو کی چھڑی گھما کر سارے منظر بے رنگ کر دیے تھے۔

☆☆☆

انعم اور افق کے درمیان ریموٹ کے لیے جنگ عظیم چھڑی ہوئی تھی جب کوئی باہر کا دروازہ زور زور سے دھڑ دھڑانے لگا۔ اتنی بری طرح سے دروازہ پیٹا جا رہا تھا کہ ریموٹ بھول کر افق دروازے کی طرف بھاگا۔ الماری میں دھلے کپڑے رکھتی عاصمہ بھی "یا اللہ خیر" کہتی باہر آ گئیں۔ دروازہ کھلتے ہی ارسل خون آلود شرٹ میں ان کے سامنے تھا۔ آنکھیں جانے ضبط کی شدت سے سرخ تھیں یا شدتِ گریہ سے۔

"یہ کیا ہوا ہے؟" افق کا سوال ان سنا کر کے وہ اندر آ گیا۔

"بھائی..... امی..... امی جلدی سے آئیں۔ بھائی کو چوٹ لگی ہے۔ خون بہہ رہا ہے۔" انعم بری طرح گھبرا گئی۔ کمرے کے دروازہ میں کھڑی عاصمہ بھی باہر آ گئی تھیں۔

"یا میرے مالک۔ ارسل! کیا ہو گیا بچے؟ زارون! باہر آ بیٹا، بھائی کو ہاسپٹل لے کر جاؤ۔"

ایک آگ تھی جس کی لپیٹ میں ارسل نئے سرے سے آنے لگا تھا۔ یہی وہ۔ دہلیز تھی جس پر وہ اتنے سالوں سے محبت کا بھکاری بن کر آتا رہا تھا۔ وہ محبت جو اس کا حق تھی۔ جو لکھنے والے نے ازل سے اس کے نام لکھ دی تھی لیکن ان زمینی خداؤں نے اس سے سب چھین لیا تھا۔

"یہ تو کچھ بھی نہیں ہے جو آپ نے میرے ساتھ کیا ہے۔"

اس کے لہجے کی برفیلی ٹھنڈک عاصمہ کے وجود میں اتر کر اسے سُن کر گئی تھی۔ آگے بڑھتے قدم اپنی جگہ جم گئے تھے۔ تو آج یومِ حساب آن پہنچا تھا۔

"آپ نے میرے ساتھ ہی کیوں کیا ایسا؟ اس لیے کہ زارون پہلا بچہ تھا۔ افق چھوٹا اور لاڈلا۔ بیٹی آپ کے پاس تھی ہی ایک۔ لے دے کر ایک میں بچا تھا۔ بے کار۔ ناکارہ۔"

اس کے الفاظ پر عاصمہ کا دل کٹ کر رہ گیا۔ عباس بھی ان کے پہلو میں آ کھڑے ہوئے تھے۔

"ارسل! میرے بچے ایسی کوئی بات نہیں۔"

"میں بتاتا ہوں، کیا بات تھی۔ یہ سب کر کے آپ یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ آپ خدا سے زیادہ رحم دل ہیں۔ اسے تقسیم کا سلیقہ نہیں۔ تب ہی تو آپ نے اپنی من مرضی کی تقسیم کر لی۔ جو بھی ہوا ہوگا۔ ہو گیا۔ مجھے بس ایک بات کا جواب دیں کہ آپ کو اگر اپنے بھائی کا دکھ نظر آ گیا تھا تو اپنے بیٹے پر ترس کیوں نہیں آیا؟ جانتی ہیں، میں کتنا ترسا ہوں محبتوں کو؟"

اسے رہ رہ کر اپنی مرحوم میاں یاد آ رہی تھیں، رلا رہی تھیں۔

"آپ جانتی ہیں، لوگ پتھر کے خداؤں کو سجدہ کر کے کیسے سکون پا لیتے ہیں؟ کیونکہ وہ انہیں سچا سمجھ رہے ہوتے ہیں۔ وہ عورت جو یہ جانتی تھی کہ میں اس کے وجود کا حصہ نہیں، وہ کیسے مجھ سے اپنی ممتا سیراب کر سکتی تھی؟ آپ نے بہت ظلم کیا ہے میرے ساتھ۔ میں ساری زندگی آپ لوگوں کو معاف نہیں کر سکتا۔"

شرٹ کی آستین سے آنکھیں پونچھتا وہ عاصمہ کے دل پر کند چھری چلا رہا تھا۔ ان کی سسکیاں زارون سے برداشت نہیں ہو رہی تھیں۔ وہ جانتا تھا کہ اپنی جگہ سب نے اسے اس گھر کے فرد کی طرح محبت دی ہے۔

"کون سا ظلم ہوا ہے تم پر؟ ہاں۔ اللہ نے ہر

شے سے نواز رکھا ہے۔ پھر بھی ناشکری فطرت۔"

"کتنی مادی سوچ ہے تمہاری زارون عباس۔ روپے پیسے کو تم "ہر شے" سمجھتے ہو۔ سمجھ سکتے ہو کیونکہ تمہیں اس سب کی اہمیت کا اندازہ نہیں جو سب تمہیں ہمیشہ میسر رہا ہے۔ جس کے لیے میں ہمیشہ ترسا ہوں۔ بھائی کی شرارتیں، بہن کی محبت۔ اور اب تو عزہ بھی تمہارے نام ہوگئی ہے۔ اب تمہیں کس چیز کی کمی ہے سوائے دیکھنے والی نظر کے۔"

اس کے لہجے میں ایسی چبھن، ایسی تڑپ تھی کہ زارون نے ایک لمحے میں فیصلہ کرلیا تھا۔

"اوہ۔ تو ملال عزہ کے مجھ سے منسوب ہو جانے کا ہے۔ ظاہری بات ہے ہوگا ہی۔ آخر تم دونوں ایک دوسرے کو چاہتے ہو۔ کباب میں ہڈی بننے کا مجھے کوئی شوق نہیں، میں ابھی اسی وقت اس لڑکی کو اپنے تعلق سے آزاد کرتا ہوں جس کے دل میں کوئی اور ہو۔"

زارون کی بات پر وہاں کھڑے سب لوگوں پر ایک بم گرا تھا۔

"کتنے گھٹیا ہو تم زارون! شرم تو نہیں آئی ایک پاک باز لڑکی پر الزام لگاتے؟ تم اس کے قابل ہو ہی نہیں۔"

ارسل ایک دم بھڑک اٹھا تھا۔ اس کے ردعمل نے زارون کے شک پر یقین کی مہر لگادی تھی۔

"بالکل۔ کیونکہ تم جو ہو اس کے لائق۔ اتنی پاک باز ہے تو تم کیوں نہیں اپنا لیتے اسے؟" زارون آج مرنے مارنے کی حالت میں تھا۔

"لعنت بھیجتا ہوں میں تم پر اور تمہاری سوچ پر۔"

ہاتھ میں پکڑا فون اس نے پوری قوت سے دیوار پر دے مارا تھا۔

"اور جیسے آپ لوگوں نے مجھے اپنے گھر سے نکال باہر کیا تھا۔ آج میں آپ سب کو اپنی زندگی سے باہر کر رہا ہوں۔ میں کھلونا نہیں جس سے کبھی آپ اپنا دل بہلائیں اور کبھی اٹھا کر دان کر دیں۔"

اپنی حالت نظر انداز کر کے وہ اپنے پیچھے زور سے دروازہ بند کرتا باہر نکل گیا تھا۔ وہ کیا کرنے آیا تھا اور کیا کر کے چلا گیا تھا۔

کچھ دیر بعد عباس علی اور زینب بھی پہنچ گئے تھے۔ سب کو یہی لگا تھا وہ واپس گوجرانوالہ چلا گیا ہو گا۔ لیکن باہر کھڑی اس کی گاڑی نے ان کے مفروضے کو غلط ثابت کر دیا تھا۔ گرمی کی یہ مختصر رات ایک بار پھر طویل ہونے والی تھی۔

☆☆☆

اگست کی حبس بھری دوپہر ڈھل چکی تھی لیکن اس کے باوجود فضا میں محسوس کی جانے والی تلخی گھلی تھی۔ عاصمہ ابھی زارون کو سلا کر اٹھی تھی۔ پچھلی رات اس نے بیٹھک میں چوہا دیکھ لیا تھا اسی لیے منگوائی ہوئی چوہے مار گولیاں لے کر بیٹھک کی طرف بڑھ گئی۔

دروازے پر دستک کی آواز سن کر گولیاں میز پر چھوڑ کر وہ باہر پلٹ گئی۔ عباس علی اور زینب کو دیکھ کر وہ اس وقت خوش نہیں ہو سکی۔ پورے دنوں کے ساتھ وہ گھر اور بچے کو بہت مشکل سے سنبھال رہی تھی اور آج تو ظہر کے وقت سے ہی طبیعت بیزار تھی۔ کمر میں رک رک کر اٹھتا درد اس کی ہمت سلب کر رہا تھا۔ اس وقت مہمان نوازی کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ وہ چاہ کر بھی زیادہ خوشی نہیں دکھا سکی۔ خود وہ بھی دونوں اتنا الجھے ہوئے تھے کہ انہوں نے بھی اس کی بے دلی محسوس نہیں کی۔

تھوڑی دیر پہلے ڈاکٹر نے ان سے جو کہا تھا وہ ان دونوں کے کانوں میں گونج رہا تھا۔ چار سال سے وہ اولاد کے لیے پُرامید تھے۔ دیر سویر رب سوہنے کے کام ہیں لیکن اب زینب تعویذ گنڈوں کے چکر میں پڑنے لگی تھی۔ پسماندہ دیہات سے تعلق رکھنے والی زینب اس کے علاوہ کر بھی کیا سکتی تھی۔

عباس علی خود بھی اتنا پڑھا لکھا تو نہیں تھا لیکن دنیا کی کچھ سمجھ بوجھ تھی اسے۔ اسی لیے زینب کو لاہور کے ایک اچھے ہسپتال میں لے گیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا

کہ زینب یہ سمجھے کہ وہ اسے تاخیر کا ذمہ دار سمجھ رہا ہے اس لیے اس کے ساتھ ساتھ اس نے خود اپنے ٹیسٹ بھی کروا لیے تھے۔ آج وہ رپورٹس لینے آئے تھے اور جو ڈاکٹر نے کہا اس نے اگر زینب کے پاؤں تلے سے زمین کھینچی تھی تو آسمان عباس علی کے سر پر بھی نہیں چھوڑا تھا۔ کم از کم سائنس کے پاس تو عباس علی کی محرومی کا کوئی علاج نہیں تھا۔

عاصمہ سکنجبین بنا کر لائی تو ان دونوں کی چپ کو بھی محسوس کیا لیکن پھر گرمی اور سفر کی تو جیہہ سے خود کو مطمئن بھی کر لیا۔ گھر میں گوشت موجود نہیں تھا۔ ہمسائی کو گوشت لینے بھیج کر وہ ہانڈی کا مسالا بنانے بیٹھ گئی۔

اس کی رکھی ہوئی ٹھنڈی سکنجبین پڑے پڑے گرم ہو گئی تھی۔ کمرے میں موجود نفوس بالکل خاموش تھے۔ اس خاموشی کی چادر کو عباس علی کی آواز نے چیرا۔

"زیبے۔ میں اپنی کمی سے تیری زندگی اجاڑنے کا گناہ نہیں کر سکتا۔"

"پھر؟" زینب صوفے پر گھٹنوں میں سر دیے بیٹھی تھی۔

"ایسا کر۔ تو اپنی زندگی نئے سرے سے، کسی نئے شخص کے ساتھ۔۔"

"رب دا واسطہ ایسی گل نہ نکال منہ سے۔ مجھے تیرے پیروں کی دھول بن کر مٹنا منظور ہے۔"

"جذباتی نہ ہو زیبے۔"

بات اگر زینب نے کاٹی تھی تو پوری عباس علی نے بھی نہیں ہونے دی تھی۔

"یہ کوئی ایک دو دن یا ایک دو روز کی بات نہیں۔ پوری زندگی کی بات ہے۔ تیری کھیتی ہری ہے۔ میرے ساتھ تو کیوں بنجر ہونے کا دکھ جھیلے؟ ماں بننا تو عورت کا پہلا حق ہوتا ہے۔ میں تو مرد ہوں۔"

دانتوں تلے زبان دبا کر اس نے بات روک لی۔ زینب کے دل پر مکا پڑا تھا۔

"رب نے اگر مجھے بنجر کیا ہوتا؟"

"تو پھر میں اپنے لیے ضرور کچھ سوچتا۔" کٹھور جواب پر وہ چپ ہو گئی تھی۔

"میں جذباتی نہیں ہوں۔ حقیقت پسندی کا تقاضا یہی ہے کہ تو اور میں الگ ہو جائیں۔ اگر اللہ نے تجھے محروم رکھنا ہوتا تو یہ کمی تجھ میں رکھتا۔ یہ تو میرے بھاگ کی محرومی ہے۔ تو حصے دار نہ بن۔ ادھر سے تجھے خالہ کے گھر چھوڑ آؤں گا اور کاغذ۔۔"

"میں مر جاؤں گی۔ نہیں تو اپنے ہاتھ سے مار دے مجھے۔" وہ رو رہی تھی۔

اس لڑکی نے نہ ماں دیکھی تھی نہ باپ۔ ہوش سنبھالنے پر دیکھی تو خالہ صغراں۔ جو رشتے میں جانے کیا لگتی تھی اور پھر اس کی بیٹی الفت۔ یہی دو رشتے تھے اس کے پاس۔ خالہ کھیتوں میں سارا دن محبت کرتی کہ کھانے پینے، پہننے اوڑھنے کے علاوہ اسے ان دونوں کی گھر سے ڈولی بھی اٹھانی تھی۔ وہ اپنی پیٹ جنمی بیٹی کو وقت نہیں دے پاتی تھی تو اسے کیا پیار دیتی۔ رہی الفت تو اسے جانے کون سا بیر تھا اس بے زبان سے۔

شادی کے بعد جب اسے عباس علی کی توجہ اور محبت ملی تو اس نے اسی محبت کو اپنا دین ایمان بنا لیا۔ آج وہی اسے منکر ہونے کا کہہ رہا تھا۔ وہ مر سکتی تھی لیکن اس کے بغیر زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔

"کوئی نہیں مرتا زیبے! سب اپنی آئی مرتے ہیں۔" جھکے کندھے اور جھکے سر کے ساتھ وہ بول رہا تھا۔ زینب کی نظر اس کی طرف اٹھی اور پھر میز پر رکھی سرخ گولیوں پر ٹک گئی۔ ایک لمحے میں اس نے فیصلہ کر لیا تھا۔

"مرنے والے مر جاتے ہیں۔"

"کوئی نہیں مرتا کسی کے لیے۔"

زینب نے گولیاں پھانک کر سکنجبین کا گلاس منہ سے لگا لیا۔

گھٹنے پر کہنی رکھے ہاتھوں سے آنکھیں

ڈھانپے عباس علی نے کچھ گرنے کی آواز پر ہاتھ آنکھوں سے ہٹایا۔زینب دونوں ہاتھوں سے گلا پکڑے صوفے سے نیچے گری ہوئی تھی۔اس کے منہ سے جھاگ نکل رہے تھے۔وہ اٹھ کر تیزی سے اس کے پاس آیا اور پھر عاصمہ کو آواز دے کر رکشہ لانے بھاگ کھڑا ہوا۔

عاصمہ نے دیکھ لیا تھا سرخ گولیاں اپنی جگہ پر نہیں تھیں۔وہ نہیں جانتی تھی کہ ان دونوں میں ایسی کون سی بات ہوئی کہ زینب کو گولیاں کھانی پڑ گئیں۔ ڈاکٹروں کے بتانے سے پہلے اس نے عباس علی کو بتا دیا تھا کہ زینب نے چوہے مار گولیاں کھائی ہیں۔ کیوں کھائی ہیں، اس کا جواب عباس علی نے دینا تھا۔

ایک بھائی اپنی بہن کے سامنے کس طرح قسمت سے اپنی ہار کا اظہار کرتا؟ اور ایک بہن کس طرح اپنی جان پر اس دکھ کو جھیلتی؟ ایک زینب کی پریشانی۔ایک بھائی کا دکھ اور اس پر اس کی اپنی حالت۔اس رات زینب کے ساتھ اسے بھی ہسپتال میں داخل کرنا پڑا تھا۔

☆☆☆

گرمیوں کی یہ مختصر رات اتنی طویل ہوئی تھی کہ عمروں پر محیط تھی۔پہاڑ جیسی رات کے اختتام پر اللہ نے زینب کو زندگی سے نوازا تھا اور عاصمہ کو ایک نئی جان سے۔عباس ابھی سب سے آگاہ نہیں ہوا تھا۔وہ بچے کو گود میں لیے عاصمہ کے پاس آیا تو اس نے بچے کو دیکھے بنا اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔

"میرے بھائی کو جینے کے لیے آسرا دے دیں۔یہ بچہ اس کی جھولی میں ڈال دیں۔"

ایک عورت جو ابھی قبر کی دیواروں کو ہاتھ لگا کر لوٹی ہو اگر وہ اپنے جگر کا ٹکڑا دے سکتی تھی تو عباس کیا کہہ سکتا تھا۔رفاقت کے گزرے برسوں میں اس عورت نے کبھی اس سے کچھ نہیں مانگا تھا اور اب مانگا بھی تو کیا؟ وہ نہ کر ہی نہیں سکا۔

عاصمہ نے اپنے بیٹے کی شکل نہیں دیکھی تھی۔ اس نے تو زینب کے پہلو میں لیٹا زینب کا بیٹا دیکھا تھا۔جس نے اس کے بھائی کو نامکمل قبول کیا تھا، اس کے لیے عاصمہ کے دل میں عزت اور محبت کئی گنا بڑھ گئی تھی۔

اس محبت کے لیے اس نے نئی جان کی محبت کو بھلا دیا تھا۔یہاں تک کہ آنے والے وقت میں بھائی کے گھر کا راستہ بھی بھول گئی تھی۔جب کبھی جانا ہوتا ارسل کو نظر بھر کر دیکھتی بھی نہیں تھی۔ایک فاصلہ تھا جو اس نے اختیار کر لیا تھا۔پاس نہیں تھا تو کیا ہوا۔ زندہ سلامت تھا اور بھائی کے پاس تھا۔دینے والا جو دے کر لے لیتا۔وہ کیا کر لیتی۔اسے صبر آتا تو جانے کب آتا۔مگر اس نے صبر کر لیا تھا۔

اس رات کی صبح جاں ستاں لمحے کو شکست دے کر زینب نے آنکھ کھولی تو بستر پر اس ننھی جان کو پہلو میں لیٹے پایا۔وہ حیرت زدہ تھی۔کیا فلموں کی طرح اس کی بھی یادداشت چلی گئی تھی؟ جو تکلیف اس نے کاٹی کیا وہ تخلیق کی تھی؟ نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔زندگی میں یہ سب نہیں ہوتا۔پاس بیٹھے عباس علی نے اس کو ہوش میں آتے دیکھ لیا تھا۔اس کی سوالیہ نگاہوں کے سوال اس نے پڑھ لیے تھے اور جواب بھی دے دیے تھے۔

ایک گرہ تھی جو کھل گئی تھی۔۔ایک گرہ تھی جو بندھ گئی تھی۔

زینب اس بچے کو گھر لے گئی۔الفت دوسرے دن ہی اس کے پاس آ پہنچی۔

"کر لے جتنی جان کھپائی کرنی ہے۔بل پلا جائے گا تو چھوڑ کر وہیں چلا جائے گا جہاں سے آیا ہے۔ایسی باتیں چھوٹی تھوڑا ہیں۔لکھ کر رکھ لے زینب بڑھاپا تم دونوں کا سر پھوڑتے گزرے گا۔میری مان عباس علی کی دوسری شادی کروا دے۔کوئی بیوہ، کوئی مطلقہ دیکھ لے۔اولاد بھی دے گی اور ساری زندگی احسان مانے گی۔پیر دھو دھو کر پیے گی۔پہلی بیوی پہلی محبت کی طرح ہوتی ہے۔زندگی سے نکالی نہیں جا سکتی۔عباس علی بھی تیری قدر کرے گا کہ تو نے اس

کی نسل کے لیے سوتن کا عذاب جھیلا۔"

اولاد نہ ہونا عام طور پر عورت کی خامی سمجھا جاتا ہے اور الفت بھی یہی سمجھی تھی۔ اسی لیے ایسے مشورے دے رہی تھی۔ خود وہ سال بھر پہلے اپنے شوہر سے طلاق لے چکی تھی۔ زینب نہیں جانتی تھی کہ وہ اپنی راہ ہموار کرنے کے لیے اس کے دل میں بول بو رہی تھی۔ وہ تو بس وہیں اٹک کر رہ گئی تھی کہ یہ بچہ نہ اس کا ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔ جلد یا بدیر اسے زینب کو چھوڑ جانا ہے۔

ان ہی باتوں کا اثر تھا کہ اس کا خیال رکھتی، اس کی ہر ضرورت پوری کرتی لیکن وہ اس بچے سے پیار نہیں کر پائی۔ دل کی زمین پر اس کے لیے محبت کا کوئی سوتا نہیں پھوٹ سکا۔ اتنی ایثار والی ماں کا بیٹا، زینب کی گود ہری دیکھنے کے لیے اپنی مردانہ انا مار دینے والے کے سائے میں پلتے اس بچے کی فطرت میں محبت ہی محبت تھی۔ مگر زینب نے دل پر جو قفل چڑھائے تو تا عمر اسے دل تک رسائی نہ دی۔

نویں میں تھا جو اپنڈکس کا درد اٹھا۔ بھائی کو بہن کی قربانی کی قدر تھی، اسی لیے اس تکلیف کے وقت میں اسے دور نہیں رکھا بلکہ آپریشن کے لیے گوجرانوالہ سے لاہور لے آیا۔ اس دن۔ اس دن زینب کو اپنے سارے اندیشے واہمے سچ ہوتے نظر آ گئے تھے۔ وہ لاہور کا ہو کر رہ گیا تھا۔ یہاں تک کہ کالج میں داخلہ بھی اس نے لاہور میں ہی لیا تھا۔ زینب نے اپنا مرا ہوا دل کچھ اور مار لیا۔

معجزہ تب ہوا جب اتنے سال بعد وہ ان کے پاس لوٹ آیا۔ پورے مان اور محبت کے ساتھ۔ زینب اس دن ماں بنی تھی ارسل کی۔ ممتا جس سے وہ خود بھی لاعلم تھی از خود اس کے ہر ہر عمل میں در آئی تھی۔ ابھی تو اس نے پوری طرح جینا شروع کیا تھا اور اب۔ اب وہ چلا گیا تھا۔ عباس علی ایک بار پھر بانجھ ہو گیا تھا۔ اس نے جتنا ارسل کو چاہا تھا شاید آج اپنی اولاد بھی ہو جاتی تو اسے بھی اتنا پیار نہ دے سکتا تھا۔ وہ چاروں اپنی اپنی جگہ زندگی سے ہارے تھے۔

☆☆☆

منگنی کے بعد عزہ نے عاصمہ کی طرف آنا چھوڑا تو نہیں تھا لیکن کم کر دیا تھا۔ اب کی بار تو وہ ہاسٹل سے ہی دو ماہ بعد آئی تھی۔ عاصمہ کی پیلی رنگت اور اندر تک دھنسی آنکھیں دیکھ کر اسے جھٹکا لگا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی۔ اگر وہ بیمار تھیں تو امی نے اس سے ذکر کیوں نہیں کیا۔

"خالہ! کیا ہو گیا ہے آپ کو؟ طبیعت ٹھیک ہے آپ کی؟"

"ٹھیک ہوں خالہ کی جان۔ کچھ نہیں ہوا مجھے۔"

ان کی گھٹی گھٹی آواز سے وہ مزید تشویش میں مبتلا ہو گئی تھی۔ دروازے میں چابی گھومنے کی آواز پر دونوں نے دروازے کی طرف دیکھا۔ زارون آفس سے لوٹا تھا۔ جانے تھکن تھی یا کیا۔ وہ بھی مرجھایا ہوا لگ رہا تھا۔

"السلام علیکم۔" اسے نظر انداز کر کے وہ ماں کی طرف بڑھا اور عاصمہ کے سر پر ہاتھ پھیرنے پر عزہ کے سامنے صوفے پر جا بیٹھا۔ آصمہ کچن میں پانی لینے کے لیے چلی گئی تھیں۔

"خالہ کو کیا ہوا ہے زارون؟" وہ چاہ کر بھی اس کا حال نہیں پوچھ سکی۔

"تم فارغ ہو کر میرے کمرے میں آنا، مجھے بات کرنی ہے تم سے۔"

"کوئی کمرے میں نہیں جا رہا۔ یہیں کرلو جو بات کرنی ہے۔" عاصمہ پانی لے آئی تھیں۔ عزہ اگر زارون کی بات پر حیران تھی تو عاصمہ کے رد عمل پر پریشان ہو گئی تھی۔

"اچھا ٹھیک ہے۔ کھانا لا دیں، میں کپڑے بدل کر آتا ہوں۔" بریف کیس اٹھا کر ایک نظر اس پر ڈال کر وہ کمرے میں چلا گیا۔

"عزہ بیٹا! کھانا کھا کر جانا۔ میں بس روٹی بنا کر آتی ہوں۔"

خالہ کے جانے کے بعد بھی وہ بیٹھی تھی۔ سمجھ

میں نہیں آرہا تھا کہ زارون کے کمرے میں جائے یا وہیں بیٹھی رہے۔ابھی وہ سوچ ہی رہی تھی کہ زارون اسی لباس میں اس کے سامنے آ بیٹھا جو کچھ دیر پہلے اس نے پہن رکھا تھا۔غالباً وہ عاصمہ کے سامنے بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔

''تم جانتی ہو، ارسل ہمارا سگا بھائی ہے۔ ماموں عباس کی کوئی اولاد نہیں تھی تو امی نے انہیں دے دیا تھا؟''

''کیا.....'' یہ سوال نہیں ردعمل تھا۔وہ کم وبیش چار پانچ سال سے ان کے گھر آ جا رہی تھی اور اسے آج پتا چل رہا تھا۔

''ہم تو بچپن سے ہی جانتے تھے۔اسے اب پتا چلا ہے اور وہ غصے میں گھر چھوڑ گیا ہے۔ڈیڑھ ماہ ہونے کو آیا ہے لیکن اس کا کچھ اتا پتا نہیں وہ کہاں ہے۔'' انگلیوں میں انگلیاں پھنسائے وہ نظر جھکائے بول رہا تھا۔عزہ کے ہاتھ اس کے منہ پر تھے۔وہ نہیں جانتی تھی کہ اصل جھٹکا تو اسے اب لگنے والا ہے۔

''عزہ۔''

''ہوں۔''

''میں نے خود کو بہت جھٹلا لیا ہے، اب مزید نہیں جھٹلا سکتا۔میرا وہم بھی ہو تو میں پوری زندگی اس وہم کے ساتھ نہیں گزار سکتا کہ میرا بھائی میری بیوی کو چاہتا ہے۔''

یہ سب باتیں اس نے اسی وقت طے کر لی تھیں جب اس رات ارسل اپنی بات میں عزہ کو لے آیا تھا۔اس نے ارسل سے جو بھی کہا تھا، اسے غصہ دلانے کے لیے کہا تھا تا کہ وہ مان جائے۔اقرار کر لے۔لیکن وہ چلا گیا تھا اور وہ جانتا تھا ارسل کو واپس آنا ہی ہے۔تب ہی اس کے لیے راستے آسان کر رہا تھا۔

عزہ کے سر پر کوئی پہاڑ ٹوٹ کر گرا تھا۔

''میں تمہاری بہت عزت کرتا ہوں لیکن محبت تم سے ارسل کرتا ہے۔جانتے بوجھتے میں تمہیں اپنی زندگی میں شامل نہیں کر سکتا۔میں تم سے شادی نہیں کر سکتا عزہ۔''

''پتا نہیں کون سی مائیں ہوتی ہیں جن کو اولاد کی حرکتوں کی وجہ سے دل کے دورے پڑ جاتے ہیں یا دماغ کی نسیں پھٹ جاتی ہیں۔جانے کس مٹی سے بنی ہوں میں جو اتنا ہو جانے پر بھی زندہ سلامت چل پھر رہی ہوں۔''

روٹی لے کر آتی عاصمہ نے اس کا آخری فقرہ سنا تھا۔کھانا میز پر پٹختے وہ غصے سے بول رہی تھیں۔

''اللہ نہ کرے امی! کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ۔ادھر بیٹھیں میرے پاس۔میں بتاتا ہوں آپ کو۔'' اس نے پکڑ کر انہیں اپنے پاس صوفے پر بٹھایا۔

''عزہ بیٹا! اس بات کو یہیں دفن کر کے جانا۔گھر میں کسی سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔اللہ نے بڑھاپے میں اس اولاد کے ہاتھوں جانے کتنا خوار ہونا لکھا ہے۔''

''امی۔۔ایسا کیوں سوچ رہی ہیں؟ آخر آپ کو وہ سب کیوں نظر نہیں آ رہا جو مجھے دکھائی دے رہا ہے۔ارسل عزہ کو پسند کرتا ہے۔پہلے مجھے بھی لگا تھا میرا وہم ہے۔۔''

''رافعہ کو بھی لگتا تھا کہ وہ انعم میں دلچسپی لے رہا ہے۔سب کو کچھ نہ کچھ نظر آ رہا ہے سوائے میرے۔''

''امی! آپ نے کبھی غور نہیں کیا انعم کے ساتھ اس کی بے تکلفی دراصل ان دونوں کے بچپنے کی شوخی تھی۔وہ ہمارے سامنے بھی اس کے ساتھ ایسے ہی ہلکی مذاق کرتا رہتا تھا۔اگر اس کے دل میں چور ہوتا تو وہ کچھ تو لحاظ رکھتا کہ ہمارے گھر میں۔۔'' دانستہ بات ادھوری چھوڑ کر وہ عاصمہ کی طرف دیکھنے لگا جو سچ مچ چکرا گئی تھی۔

''اگر ایسی کوئی بات تھی تو اس نے تم دونوں کی منگنی کی اتنی جلدی کیوں مچائی تھی، مجھے تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔'' ایک کے بعد ایک سوچ چلی آ رہی تھی۔

''شاید وہ عیاں ہو جانے سے ڈرتا ہو۔یا مجھے نہیں پتا لیکن ایک بات تو میں یقین سے کہہ سکتا ہوں

کہ وہ عزہ کو چاہتا ہے۔ آپ کو یاد نہیں، اس نے کیا کہا تھا۔ اسے لگتا ہے میرے پاس سب کچھ ہے اور اب تو عزہ کی شادی بھی مجھ سے ہو رہی ہے۔ اب تو۔ امی آپ کو کیوں نہیں سمجھ میں آ رہا کہ وہ عزہ کو چاہتا ہے۔ امی! میرا یقین کریں۔ وہ میرا بھائی ہے۔ میں اس کا دل نہیں اجاڑنا چاہتا۔ آپ رافعہ خالہ سے بات کر کے انہیں اس رشتے کے لیے منائیں۔ ابھی کون سا منگنی کی بات کھلی ہے۔ پلیز امی۔"

انہیں یقین دلانے کے لیے وہ کسی بھی حد تک جانے کو تیار نظر آ رہا تھا اور اس کے پر یقین لہجے پر خود عاصمہ بھی سوچ میں پڑ گئی تھیں۔

"ہتھیلی پر سرسوں نہیں جمتی زارون! مجھے سوچنے کے لیے وقت دو۔" صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر انہوں نے آنکھیں موند لیں تو عزہ بھی ایک ٹرانس کی کیفیت میں اٹھ کر باہر نکل گئی۔ میز پر پڑا کھانا ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ زارون اسے جاتے ہوئے دیکھ کر اس کے پیچھے لپکا۔

"عزہ! کم از کم تمہیں میرا یقین کرنا چاہیے۔ میں جھوٹ کیوں بولوں گا؟"

اس کی حالت سے بے خبر وہ ایک بار پھر اسے اپنے اندازے کی درستی کا یقین دلا رہا تھا۔ ایک سپاٹ نظر اس پر ڈال کر وہ اپنے دروازے میں داخل ہو گئی۔ یہ بھی شکر تھا کہ رافعہ اپنے کمرے میں فون پر مصروف تھیں ورنہ عزہ کی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ ان کے کسی بھی سوال کا جواب دے سکتی۔

☆☆☆

یہ عزہ کا پری میڈیکل کا پہلا سال تھا جب تایا ابو نے دادا کا گھر رکھ کر ابو کو ان کا حصہ دے کر الگ کر دیا تھا۔ تب ابو نے ایک چھوٹا سا گھر لے کر باقی کی رقم اپنی دونوں بیٹیوں کے نام پر بنک میں جمع کروا دی تھی۔ امی ان دنوں بہت خوش تھیں کہ اسی گلی میں ان کی خالہ زاد بہن کا گھر بھی تھا۔ سالوں بعد ملنے والی کزنز چار دنوں میں ہی سگی بہنوں سے بھی زیادہ قریب ہو گئی تھیں۔ جب تک ان کے سامان کی ترتیب نہیں لگ گئی، رافعہ کے نہ نہ کرنے کے باوجود عاصمہ روز تین وقت کھانا بنا کر لاتی رہیں اور جب کام ختم ہوا تو اگلے ہی روز گھر پر دعوت رکھ دی۔ عزہ کالج تو جا رہی تھی لیکن شام میں فی الحال فارغ تھی کیونکہ جس کوچنگ میں وہ جا رہی تھی، وہ یہاں سے کافی دور پڑتی تھی۔ جس کی وجہ سے اسے وہاں سے چھوڑنا پڑا اور ابھی تک نئی کوچنگ اس نے شروع نہیں کی تھی۔ دعوت اگرچہ دوپہر کی تھی لیکن کالج سے دیر سے لوٹنے کی وجہ سے وہ شام ڈھلے ان کی طرف پہنچے۔

کھانا ان کے ساتھ کھا کر خالہ کے تینوں بچے اپنے اپنے کوچنگ سینٹر چلے گئے۔ امی اور خالہ اپنی باتوں میں مگن ہو گئیں۔ ابو، عباس انکل کے ساتھ ٹی وی کے سامنے بیٹھ گئے اور سیاست پر تبصرے شروع ہو گئے۔ حبہ فون پر گیم کھیلنے لگ گئی اور وہ جی بھر کر بوریت محسوس کرنے لگی۔ دفعتاً عاصمہ کا دھیان اس کی طرف گیا۔

"بیٹا! آپ جا کر گھر دیکھ لو۔"

وہاں سے اٹھنے پر اس نے شکر ادا کیا۔ مہمان مہمان کھیلنے سے وہ کافی اکتا گئی تھی۔ اس نے تو بچپن میں بھی کبھی ایسا کوئی کھیل نہیں کھیلا تھا۔

سارا گھر گھوم پھر کر دیکھنے کے بجائے وہ سیڑھیوں پر جا بیٹھی۔ یہاں سے باہر سڑک کا منظر واضح دکھائی دے رہا تھا۔ اپنے دھیان میں بیٹھی وہ اس وقت حواس میں لوٹی جب اس نے ایک لڑکے کو دو دو سیڑھیاں پھلانگ کر اوپر آتے دیکھا۔ ٹی شرٹ کی آدھی آستین سے جھانکتی بازوؤں کی مچھلیاں پھڑک رہی تھیں۔ بالوں میں لگا سیاہ چشمہ جس کے نیچے کشادہ پیشانی۔ شرارت اور ذہانت سے بھرپور چمکتی آنکھیں اور ان آنکھوں کے نیچے کھڑی مغرور ناک۔ ہونٹ کچھ گنگنا رہے تھے۔ اسے دیکھ کر وہ ایک لمحے کے لیے رکا اور پھر آ کر عین اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

"نظر لگا رہی ہو؟"

''کیا.....؟'' اس کا دماغ بھک سے اڑا تھا۔
''ہاں تو تم کون سا میری گرل فرینڈ ہو جو آنکھوں ہی آنکھوں میں میری بلائیں لوگی۔''
عزہ کو آج سے پہلے اپنی لغت کے اتنا مختصر ہونے کا کبھی احساس نہیں ہوا تھا۔ اسے جواب دینے کے لیے الفاظ نہیں مل رہے تھے۔
''ایک ترکی مصنفہ ہے ایلف شفق۔ اس کی بڑی مشہور کتاب ہے چالیس چراغ عشق کے۔ پڑھی ہے؟''
اس کا سر از خود نفی میں ہل گیا۔
''گڈ۔ میں نے بھی نہیں پڑھی۔ ورنہ تمہیں امپریس کرنے کے لیے مجھے خود سے جھوٹ گھڑنے پڑتے۔'' وہ بڑے مزے سے کہہ رہا تھا اور عزہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔
''وہ۔ لڑکیاں کتابیں بہت پڑھتی ہیں ناں۔ تو میں نے سوچا شاید تم بھی۔'' دو زینے چڑھ کر وہ اس کے برابر بیٹھ گیا۔
''ویسے چالیس میں سے دو چراغ تمہاری آنکھیں ہو گئیں باقی کے اڑتیس چراغ مصنفہ نے جانے کیا سوچ کر لکھ ڈالے ہیں۔ مجھے تو اس کے کردار پر ہی شبہ ہونے لگا ہے۔''
یہاں آ کر عزہ اپنا صبر کھو بیٹھی تھی۔
''کتنی بکواس کرتے ہو ویسے تم۔''
''اس سے بھی کہیں زیادہ کرتا ہوں۔ کر کے دکھاؤں؟'' دائیں آنکھ دبا کر مسکراتا ہوا اٹھ کر وہ اوپر چلا گیا اور عزہ اپنے دماغ کی کھولن پر قابو پاتی نیچے اتر گئی۔
''پتا نہیں کون تھا..... جو بھی تھا..... تھا حد سے بھی زیادہ بدتمیز۔'' امی کے پاس بیٹھے وہ اسی کے بارے میں سوچ رہی تھی جب ایک بار پھر وہ اس کے سامنے آ گیا۔
''اچھا پھپھو۔ چلتا ہوں۔''
''اتنی جلدی؟''
''میں بس شوز بدلنے آیا تھا اور آنٹی.....!''

عاصمہ کو جواب دے کر وہ رافعہ کی طرف مڑا۔
''آپ کو اس لڑکی کی ضرورت نہیں ہے کیا؟ ابھی ریلنگ پر اتنا جھکی ہوئی تھی کہ مجھے لگا کپڑے سکھانے کے لیے ڈالے ہیں۔ وہ تو اس کے پیروں پر نظر پڑ گئی تب پتا چلا لڑکی ہے۔ ذہنی طور پر تو نارمل ہے ناں؟''
جہاں رافعہ بے یقینی سے عزہ کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ وہیں وہ صدمے کی حالت میں اسے ایسے سفید جھوٹ بولتا دیکھ رہی تھی۔
''دھیان رکھا کریں اور کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھائیں۔ اچھا پھپھو! اللہ حافظ۔ اللہ حافظ انکل۔''
''بڑا شرارتی ہے۔ سنجیدہ مت لینا اس کی باتوں کو۔''
عاصمہ کی بات پر رافعہ کا رکا ہوا سانس بحال ہوا تھا۔ اس قسم کی بچکانہ حرکت کی توقع کم از کم وہ عزہ سے نہیں کر سکتی تھیں۔
یہ ان دونوں کی پہلی ملاقات تھی۔ آنے والے دنوں میں عزہ کو اندازہ ہو گیا تھا کہ ارسل کو برداشت کرنے کا مطلب اس کی زبان کو مزید بڑھاوا دینا ہے۔ وہ شوخ طبیعت کی نہیں تھی لیکن ارسل کی شوخ باتوں کے جواب جانے کیسے اس کی زبان سے ادا ہوتے تھے۔ افق تو یہاں تک کہتا تھا کہ ارسل صرف عزہ کے قابو میں آ سکتا ہے۔
وہ جلدی کسی سے بے تکلف نہیں ہوتی تھی لیکن ارسل عباس ''کسی'' میں کبھی شامل نہیں رہا تھا۔ اسے کچھ پتا ہی نہیں چلا۔ وہ کب اس کے عاصمہ کے گھر میں آنے کی وجہ بنا، وہ نہیں جانتی تھی۔ یونہی بے مقصد تکرار میں۔ نوک جھونک میں ارسل اس کے دل میں اتر گیا تھا۔ دل میں تو شاید وہ پہلے لمحے سے ہی اتر گیا تھا لیکن اسے احساس نہیں ہوا تھا اور جب احساس ہوا بھی تو وہ کچھ نہیں کر سکتی تھی۔
اسے لگا وہ انعم کو پسند کرتا ہے۔ ہنسی مذاق تو جیسے اس کی فطرت میں شامل تھا۔ پھر اگر وہ اس کے ساتھ بھی کر لیتا تھا تو کیا فرق پڑتا تھا۔ وہ تو سب کے

ساتھ ہی ایسا تھا۔

زارون کے ساتھ منگنی بھی اس نے اسی لیے کر لی تھی کہ ارسل نہیں تو کسی نے تو ہونا ہی تھا پھر زارون ہوتا تو کیا ہو جاتا۔اب زارون اس سے کہہ رہا تھا کہ ارسل عباس اس کا طلب گار ہے۔وہ ارسل عباس کی خواہش ہے۔

ایک خواب جو آنکھوں نے دیکھنے کی جسارت بھی نہیں کی، وہ حاصل ہونا چاہتا ہے۔محبوب کی محبت۔ اس کی آنکھوں میں یہ خواب سجانے والا زارون تھا تو راستے ہموار کرنے والا بھی وہی تھا۔اگلی شام آفس سے آ کر وہ رافعہ کے پاس آ گیا تھا۔

رافعہ حیران بیٹھی تھیں۔وہ جانتی تھیں کہ عاصمہ نے ارسل، بھاوج کو دیا ہوا ہے۔انعم کے ساتھ انہیں اس کی بے تکلفی اسی لیے کھلتی تھی کہ ارسل نہیں جانتا وہ اس کی بہن ہے۔ایسے میں دل کا حال تو خدا ہی جانتا ہے۔اپنے طور پر وہ احتیاط ہی کر سکتے تھے جو عاصمہ کر نہیں پا رہی تھیں۔اس کے علاوہ انہیں ارسل کے ساتھ کوئی ذاتی عناد نہیں تھا۔

مضبوط ڈیل ڈول کا حامل ارسل شخصیت اور کردار کا بھی مضبوط ہی تھا۔ پھر تعلیم بھی اس نے اچھے اور مہنگے اداروں سے حاصل کی تھی۔اس کا پہننا اوڑھنا، بات چیت کا سلیقہ۔ ہر ہر بات عاصمہ کے دوسرے بچوں سے منفرد تھی۔زارون نوکری کر رہا تھا جب کہ ارسل تو عباس علی کے کاروبار کا وارث تھا۔ہر بات میں وہ زارون سے بہتر تھا۔ہر لحاظ سے وہ ایک بہترین چوائس تھا اس کے باوجود محض زارون کے کہنے پر وہ پرانا رشتہ ختم کر کے نئے کی نوید نہیں سنا سکتی تھیں۔ ہاں مگر جب زارون نے ارسل اور عزہ دونوں کی ایک دوسرے کے لیے پسندیدگی کا بتایا تو وہ کچھ کہہ نہیں سکیں۔

زارون ان کے پاس آیا ہی اسی لیے تھا کہ بیٹیوں کے معاملات ماؤں سے بہتر کون سمجھ سکتا ہے۔عزہ سے پوچھنے پر اس کی خاموشی نے زارون کی کہی ان کہی ہر بات کی تصدیق کر دی تھی۔اب ان کے پاس مان لینے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔عاصمہ، عباس تو پہلے ہی مان چکے تھے۔شاید جانے ان جانے میں اس کے ساتھ کی گئی زیادتی کا مداوا کرنے کی سوچ کارفرما تھی کہ کسی کو بھی اس نئے رشتے سے اعتراض نہیں تھا۔زینب کے درد کا احساس کرتے وہ سب اس کے پاس گوجرانوالہ گئے تھے۔ان کے ساتھ عزہ بھی تھی۔وہیں زارون نے زینب کو بھی ہم نوا بنایا تھا۔اس شام انہوں نے ارسل کے جانے کا غم نہیں منایا تھا بلکہ زینب کے ہاتھ ایک نئی امید کی ڈور تھمائی تھی۔وہاں نہ صرف ارسل اور عزہ کا رشتہ پکا کیا گیا تھا بلکہ ان کی شادی کے دن بھی طے کر لیے تھے۔ارسل جب بھی آتا اس کے فوراً بعد شادی کے دن رکھے تھے۔

اس روز عزہ اس جنت میں تھی جس کا اسے مکین ہونا تھا۔ارسل کے کمرے میں اس نے کافی وقت گزارا تھا۔وہیں اس نے اپنی وہ شرٹ دیکھی جو اس نے چند گھنٹوں کے لیے پہنی تھی۔سب سے الگ وہ شرٹ شاید اس کے امتیاز کی خاطر رکھی گئی تھی۔وہاں ایک ہاتھ جتنا گلدان سرخ گلابوں سے سجا کر گویا اپنا وجود محبت سے بھر کر اس کمرے میں چھوڑ آئی تھی۔ آتے ہوئے زینب سے وہ ارسل کی شرٹ لانا نہیں بھولی تھی۔ چاروں گھروں کے مکین اس کے خیر و عافیت سے جلد لوٹ آنے کے لیے دعا گو تھے۔ جانے وہ تھا کہاں۔

☆☆☆

اس دن عاصمہ کے گھر سے نکل جانے کے بعد اسے نہیں پتا تھا وہ کہاں جائے گا اور کیا کرے گا۔ خون زیادہ بہہ جانے کی وجہ سے اس کا سر چکرا رہا تھا اس کے باوجود وہ نامعلوم منزل کی تلاش میں چلتا ہی جا رہا تھا۔یہاں تک کہ جب اعصاب نے جواب دیا تو وہ فٹ پاتھ پر ہی گر گیا۔

اس کے بعد جب آنکھ کھلی تو اس نے خود کو سرکاری ہسپتال کے بستر پر پایا۔آن ڈیوٹی ڈاکٹر نے اسے بتایا کہ تین لڑکے اسے یہاں یہ کہہ کر چھوڑ گئے

تھے کہ وہ انہیں سڑک پر بے ہوش پڑا ملا تھا۔ پاس کوئی شناختی کارڈ۔ فون یا پرس والٹ وغیرہ کچھ نہیں تھا، اس لیے وہ لوگ یہی سمجھ رہے تھے کہ وہ اسٹریٹ کرائم کا شکار ہوا ہے۔ اس نے بھی تردید کرنا ضروری نہیں سمجھا۔

شام میں ان تین لڑکوں میں سے ایک اسے دیکھنے آیا تھا۔ رافع کریم دراز قد، خوش شکل اور خوش اخلاق نوجوان تھا۔ ارسل کا حال چال پوچھنے کے بعد وہ حسب توقع اس سے پچھلی رات کی واردات کے بارے میں پوچھنے لگا۔ ارسل کے پاس کہنے کو کچھ تھا ہی نہیں اس لیے چپ رہا۔ وہ اس سے گھر والوں کے بارے میں پوچھتا رہا اور جواب میں فقط ایک خاموشی۔ ذہین بندہ تھا سمجھ گیا کہ وہ بات نہیں کرنا چاہتا۔ اس لیے دوبارہ اس نے ایسا کچھ نہیں پوچھا جس کا تعلق براہِ راست اس کی ذات سے ہو۔

"کیا کسی لڑکی کے لیے ناراض ہو کر نکلے ہو؟" ہلکی پھلکی چند باتیں کرنے کے بعد وہ جانے کے لیے اٹھا تو اس نے اچانک پوچھ لیا۔

اس کے ہونٹوں پر بڑی پیاری مسکراہٹ تھی جسے دیکھ کر ارسل عباس ایک لمحے کیلئے سب بھول کر مسکرا اٹھا۔ جواب پھر خاموشی۔

"کسی چیز کی ضرورت ہو تو بلا جھجک کہنا۔" دوبارہ آنے کی یقین دہانی کروا کر وہ چلا گیا اور حسب وعدہ اگلے روز جب وہ آیا تو اس کے ساتھ ایک اور لڑکا تھا اسد مرزا۔ سانولا رنگ اور رافع کریم کے سامنے دبتا قد ورنہ عام حالات میں اس کا قد اتنا چھوٹا بھی محسوس نہیں ہوتا تھا۔

رافع اسے شاید پہلے سے منع کر چکا تھا جو اسد نے اس سے کسی قسم کا سوال نہیں کیا۔ وہ دونوں اپنی ہی باتیں کرتے اسے ہنساتے رہے۔ ان کے ہوتے ہوئے ارسل کو کوئی تکلیف دہ یاد نہیں ستا رہی تھی۔ معمولی سے کپڑوں میں بھی وہ دونوں کتنے خوش نصیب اور خوش تھے۔ کاش میں بھی ان جیسا ہوتا۔"

یہ ان کی محبت ہی تھی کہ ہسپتال سے ڈسچارج ہو کر ارسل کو ان کے ساتھ جانا پڑا۔ وہ تین تھے جو مختلف شہروں سے اور مختلف مقاصد سے اس کرائے کے ایک کمرے میں اکٹھے تھے۔ مشترکہ ان سب کے حالات تھے۔ گھر میں جوان بہنیں یا بوڑھے بیمار ماں باپ جن کے علاج کے لیے پیسے چاہیے تھے۔ ایک کو اچھے مستقبل کی امید لیے بہت سا پڑھنا تھا اور ایک کو اپنی بیوی اور چار بچوں کے لیے ذاتی گھر کی ضرورت نے بے گھر کیا تھا۔

چوکور ڈبے نما کمرے میں تین چارپائیاں ایسے بچھی تھیں کہ ان کے درمیان خالی جگہ جمع کا نشان بناتی معلوم ہوتی تھی جب کہ چوتھی سمت میں کمرے کا دروازہ تھا۔ ارسل کو مہمانوں جیسی عزت دیتے اسد مرزا نے اپنا بستر پیش کر دیا اور خود دروازے کے ساتھ زمین پر اس طرح بستر لگا لیا کہ آدھا بستر ساتھ بچھی چارپائی کے نیچے جا گھسا تھا۔

ارسل ان لوگوں کو تنگ نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن وہ اگر یہاں سے نکلتا بھی تو جاتا کہاں؟ یہی وجہ تھی کہ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ انہیں تنگ کرنے پر مجبور تھا۔ ان میں سے دو علی الصبح اپنے اپنے کام کے لیے نکل کھڑے ہوئے تو ارسل کرائے کے اس کمرے میں اسد مرزا کے ساتھ تنہا رہ گیا۔

اسد ہی تھا جس کے کہنے پر باقی دونوں نے ارسل کے ساتھ نیکی کا خطرہ مول لیا تھا۔ فرخ نے تو سب کے سامنے اس کی اچھی کلاس لے ڈالی تھی۔ وہ تینوں ہی اچھے تھے لیکن وقت اچھا نہیں تھا۔ آج کل کے دور میں کی گئی معمولی سی نیکی کب جان کا وبال بن جائے کون جانتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ سب ڈرے ہوئے تھے۔ یہاں لانے پر تو اسد کے علاوہ کوئی راضی نہیں تھا۔

اسد قدرتی نرم دل کا واقع ہوا تھا۔ شکل سے پڑھا لکھا اور سلجھی طبیعت کا نظر آنے والا ارسل اپنے پہناوے سے بھی کسی عام گھر کا نہیں لگتا تھا۔ جانے کیا حالات تھے جو اس نے راضی و برضا دربدری قبول کی تھی۔ اسد ہر صورت اس کی مدد کرنا چاہتا تھا۔

ہسپتال میں اس سے مل کر، بات کر کے رافع کچھ کچھ اس کا ہم نوا ہوا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ آج ارسل ان کے ساتھ تھا۔ فرخ کسی صورت اس پر اعتبار کرنے کا قائل نہیں تھا۔ مال و متاع تو ان کے پاس تھا نہیں البتہ وہ ارسل کی وجہ سے کسی مصیبت میں گرفتار ہونا نہیں چاہتے تھے۔

وہ نہیں جانتے تھے کہ چپ چاپ ان سب کے چہرے تکنے والا دہشت گرد ہے یا کوئی نشہ فروش یا پھر کسی اور جرم میں ملوث جرائم عادی مجرم۔

سو ایک طرح سے اسد اس کی پہریداری کے لیے گھر رکا تھا۔ صرف اسی دن نہیں آنے والے کئی دن اسد اور رافع بدل بدل کر اس کی رکھوالی کرتے رہے تھے یہاں تک کہ ایک ماہ سے بھی زیادہ گزر جانے پر مطمئن ہو کر وہ ایک بار پھر اپنے روز مرہ کے کاموں میں مشغول ہو گئے تھے۔

اس کی بے ضرر طبیعت کو دیکھتے ہوئے فرخ بھی اب اس کے ساتھ نارمل برتاؤ کرنے لگا تھا۔ البتہ اب بھی کبھی کسی وجہ سے دل بھرا ہوتا تو وہ ارسل کو بے نقط سنانے سے بھی نہیں چوکتا تھا۔ ہر شے اپنی جگہ لیکن اسے اس پر کیا جانے والا خرچ بہت کھلتا تھا۔ ارسل سارا دن کمرے میں ایک قیدی کی طرح بیٹھا رہتا۔ ڈس اون کیے جانے کا دکھ آج بھی جان پر کسی عذاب سے کم نہیں تھا۔ وہ ہمیشہ بھائی بہنوں کے پیار کے لیے ترسا تھا۔ ہمیشہ وہ ابا سے پوچھتا۔

''ابا میرے بہن بھائی کیوں نہیں ہیں؟'' اور ابا اس کا ماتھا چوم لیتے اور کہتے۔

''تو میرا شیر ببر بیٹا ہے اور شیر جنگل کا راجا ہوتا ہے۔ راجا ہمیشہ اکیلا ہی ہوتا ہے۔''

زینب کے ماں ہونے پر اسے کبھی شک نہیں ہوا لیکن دل کہتا تھا جیسے باقی بچوں کی مائیں لپٹا لپٹا کر پیار کرتی ہیں۔ زینب کیوں نہیں کرتی بلکہ پیار ہی کیا جیسے وہ ڈانٹتی مارتی ہیں، زینب بالکل بھی ویسے نہیں کرتی تھی۔

وہ لاکھ گندے کپڑے کر لیتا زینب نے کبھی اف تک نہیں کیا تھا۔ پتا نہیں تھا کہ وہ پتھر کی مورت کیوں ہے؟ اس کے جذبات میں ہلچل کیوں نہیں ہے؟ وہ ممتا کے نور سے بے روح عورت تھی۔ کیسے اس کے دل کی دھڑکن بنتا وہ؟ اسی لیے وہ ان سب سے دور ہو گا تھا۔

اس نے خود کو نوکر بنا لیا تھا۔ وہ ان کے سب کام کرتا تھا۔ وہ تینوں چلے جاتے تو کمرے کا پھیلاوا سمیٹتا رہتا۔ ان کے چھوٹے موٹے کام کر دیتا جس کی وجہ سے اب وہ سب صبح کی بھاگ دوڑ سے تھوڑا پرسکون ہو گئے تھے۔ ارسل سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایک دن وہ کسی کے اترے کپڑے پہنے گا۔ باہر کی دنیا سے خوف زدہ ہو کر ناتا توڑ بیٹھے گا۔ اس نے تو سوچا تھا کہ زندگی درخت کی شاخ سے بندھے جھولے کی طرح مست و خرام جھومتی گزر جائے گی۔ لیکن زندگی کی یہی تو خاصیت ہے کہ اس کا کوئی رنگ مستقل نہیں رہتا یہ ہمیشہ تغیر پذیر رہتی ہے۔

اب بھی یہی ہوا تھا۔ زندگی نے ایک بار پھر رنگ بدلا تھا۔ اسد مرزا کے والد جو کافی وقت سے بیمار تھے رات کے وقت بیت الخلا جانے کے لیے اٹھتے ہوئے گر پڑے۔ خبر ملتے ہی اسد سب کام چھوڑ چھاڑ کر واپس چلا گیا۔ کچھ بڑھتی عمر کا تقاضا تھا اور کچھ سر اور ٹانگ پر چوٹ بھی ایسی بری آئی تھی کہ ان کے پیروں پر کھڑے ہونے کی امید بھی نہیں کی جا سکتی تھی۔

ایسی حالت میں انہوں نے اسد کے کندھوں پر اپنی خواش کا بوجھ ڈال دیا تھا۔ یہ بار اٹھائے سب کی توقع کے خلاف وہ تیسرے دن واپس آ گیا۔ گھر والوں کو بہت ہمت سے حوصلہ دے کر ان کے پاس آ کر وہ بہت ٹوٹ کر رویا تھا۔

''ابو اپنی زندگی میں اپنی دونوں بیٹیوں کو اپنے گھر کا کرنا چاہتے ہیں۔ ان کا علاج، گھر کے اخراجات، میری پڑھائی اور اب..... میں کیسے کروں سب۔''

اپنی اپنی جگہ وہ سب بہت مجبور تھے۔ اس کے

باوجود ایک چیز تھی جو وہ اسے دے سکتے تھے اور وہ تھا دلاسا۔

اس رات ارسل نے اپنی ذات سے نکل کر ان سب کے بارے میں سوچا تھا۔ پیسے اور پیسے کی اہمیت کا صحیح اندازہ اسے آج ہو رہا تھا۔ بہن بھائیوں کی خواہشیں پیسوں سے خرید کر خوش ہونے والا آج اپنے محسنوں کی ضرورت پوری کر کے سکون حاصل کرنے سے بھی محروم تھا۔ کتنا آسان ہوتا اگر وہ اپنے گھر میں ہوتا۔ اس گھر میں ہوتا تو اسے کسی اور کے دکھ سے سروکار ہی کیا ہوتا۔

اسد اس کا محسن تھا اور اب اس پر فرض تھا کہ وہ اس کا احسان لوٹاتا۔ لیکن کیسے؟

بستر میں چھپے مٹر کے دانے کی طرح اس سوال نے وقت کے شہزادے کو ساری رات بے چین رکھا تھا۔

☆☆☆

''اسد! میں اس کمرے میں رہتے بیزار آ گیا ہوں۔ میں باہر نکلنا چاہتا ہوں۔ مجھے بھی اپنے ساتھ اکیڈمی لے چلو میں بھی پڑھانا چاہتا ہوں۔''

ہزار سوچنے پر بھی اسے مناسب الفاظ نہیں مل رہے تھے اس لیے چارپائی کے نیچے کپڑے رکھتے جو منہ میں آیا اس نے بول دیا۔ دو دن لگا کر اس نے آخر ایک لائحہ عمل ترتیب دے ہی لیا تھا۔ جس کے پہلے مرحلے میں وہ اسد کے سامنے کھڑا تھا۔ اسد نے پہلے تو حیرت سے اس کا منہ دیکھا۔ یہ پہلی بار تھا جب اس نے کہیں باہر نکلنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔

''میں تو ہوم ٹیوشن پڑھاتا ہوں اور تم کتنا پڑھے ہوئے ہو؟''

پہلی بات تو ارسل جانتا تھا اور دوسری بات اس نے سرے سے نظر انداز کر دی تھی۔ کچھ کہنے کے لیے اس نے منہ کھولا ہی تھا کہ وہ پھر بول اٹھا۔

''میں تمہیں پروفیسر تنویر صاحب کے پاس بھیج دیتا ہوں جن کے توسط سے مجھے یہ ہوم ٹیوشن ملی تھی۔ تم ان سے جا کر مل لو۔''

اسے جواب دے کر اسے فوراً ہی اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا۔

اگر وہ بھی نوکری کرتا تو کم از کم ان کے اخراجات ہی قابو میں آ جاتے اور شاید وہ بھی کچھ زیادہ جمع کرنے کے قابل ہو جاتا۔ اسے پتا دینے کے بجائے وہ خود ہی اسے پروفیسر صاحب کے پاس لے گیا تھا۔

''تم اندر جا کر بات کرو، میں پھر اندر آتا ہوں۔'' شیشے کے دروازے کو اندر کی طرف ہلکا سا دھکیل کر وہ سامنے لگی کرسیوں کی قطار کی طرف بڑھ گیا۔ یہاں سے اندر کا منظر بالکل واضح نظر آ رہا تھا۔

''نہیں..... میں ایسے نہیں جاؤں گا۔'' وہ بے خیالی میں بڑبڑایا۔

دروازہ کھول کر اسد نے اسے اندر بلایا تو وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

''السلام علیکم۔''

وعلیکم السلام۔ بیٹھیں۔'' اسد نے جانے ان سے کیا کہا تھا کہ ان کا لہجہ کافی نرم تھا یا پھر ہو سکتا ہے یہ نرمی ان کی ذات کا حصہ ہو۔ وہ ٹھیک سے اندازہ نہیں کر پا رہا تھا۔

سوچے ہوئے فقرے ذہن میں گڈمڈ ہونے لگے تھے۔ وہ مرعوب نہیں تھا بلکہ پریشان تھا۔ اگر یہاں بھی بات نہ بنی تو پھر مزید وہ کیا کر سکتا تھا۔ ایک لمحہ لگا تھا اسے اپنے حواسوں میں لوٹنے میں۔ وہ اسد کے برابر کرسی پر بیٹھ گیا۔ پروفیسر صاحب کو کمپیوٹر اسکرین کی طرف متوجہ دیکھ کر اس نے اسد کی طرف جھک کر سرگوشی کی۔

''تم ذرا باہر جاؤ گے؟''

''آپ بات کریں، میں بس ابھی آیا۔'' جیب سے فون نکال کر مصروف سا تاثر دے کر وہ باہر نکل گیا۔ اتنے میں وہ بھی اس کی طرف متوجہ ہو چکے تھے۔

''جی تو کیا کوالیفکیشن ہے آپ کی؟'' پہلا سوال حسب توقع ہی آیا تھا۔

''آپ کے قیمتی وقت کا شکریہ اور اس کے ضیاع کے لیے پیشگی معذرت۔'' اسے نہیں یاد تھا کبھی لفظوں کے چناؤ میں اس نے اتنی احتیاط سے کام لیا ہو۔

عیر رسمی جواب سن کر انہوں نے فوراً اسکرین سے نظر ہٹا کر اس کی طرف دیکھا۔

''ایم بی اے۔ بدقسمتی سے کاغذی ثبوت کے طور پر میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔''

''تو ایسے آپ کو ہائیر کون کرے گا؟'' کچھ سوچتا ہوا سا انداز تھا۔

''ایک بی اے، ایم اے کیا ہوا شخص کامرس نہیں پڑھا سکتا لیکن میں پڑھا سکتا ہوں اور وہ بھی ایم بی اے لیول پر۔ آپ میرا ٹیسٹ لے لیں۔ میں آپ کو زبانی کلامی مخصوص ٹرمز بتا سکتا ہوں اور جو آپ اپنی تسلی کے لیے چاہیں پوچھ لیں۔ سر! مجھے جاب کی اشد ضرورت ہے۔ پلیز ایک بار موقع تو دے کر دیکھیں۔''

اس کی بات پر ریوالونگ چیئر پر بیٹھے سفیدی مائل گرے بالوں والے شخص کی پیشانی پر چند لکیریں ابھر کر معدوم ہوئیں۔

''مجھے خوشی ہوگی اگر میں کوئی مدد کر سکا۔ جیسے ہی کوئی جگہ نکلی میں اسد کو بتا دوں گا۔'' وہ پھر کمپیوٹر کی طرف متوجہ ہو چکے تھے جو اس بات کا اشارہ تھا کہ اب وہ جا سکتا ہے۔

''مجھے ذاتی طور پر یقین ہے کہ آپ جھوٹ نہیں بول رہے اور یہ میرا وعدہ ہے ہم جلد ہی پھر ملیں گے۔''

دروازے کے بیچ کھڑے ہو کر اس نے مڑ کر ان کی طرف دیکھا۔ ہونٹوں پر موجود مسکراہٹ اسے رسمی ہی لگی تھی۔ نظر لوٹنے سے پہلے ان کے کمپیوٹر پر پڑی اور جیسے اس کے بدن میں بجلی سی بھر گئی۔ وہ تیزی سے ان کے پاس جا کر کمپیوٹر پر جھک گیا۔

''کیا میں آپ کا کمپیوٹر استعمال کر سکتا ہوں؟ صرف پانچ منٹ۔''

''شیور''

وہ گھوم کر ان کی طرف آ کھڑا ہوا۔ اس کی انگلیاں کھڑے کھڑے کی بورڈ پر تیزی سے چل رہی تھیں۔ کچھ دیر بعد متعلقہ ای میل اس کے سامنے کھلی پڑی تھی۔ گہرا سانس بھر کر وہ کمپیوٹر کے سامنے سے ہٹ گیا۔ افق آفس اور ایکسل سیکھ رہا تھا جب ایک دن فون کر کے اس نے ارسل کے کاغذات کی کاپی مانگی۔ وہ اس کی سی وی بنانا چاہتا تھا۔ اس نے بھی تمام کاغذات کی تصویریں بنا کر بھیج دی تھیں۔ اب سامنے وہی میل کھلی تھی۔ اس کا رول نمبر واضح نظر آ رہا تھا جسے نیٹ سے بآسانی ٹیلی کیا جا سکتا تھا۔

''امپریسو۔'' ایک کے بعد ایک تصویر کھولتے انہوں نے ستائشی لہجے میں کہا۔ ''کب سے جوائن کرنا چاہو گے؟''

''ابھی سے۔''

''کل اسی وقت آ جانا۔'' اس کی بے تابی پر وہ مسکرائے۔

اس رات باقی سب کے لیے یہ خبر غیر متوقع لیکن خوش کن تھی۔ اگلے روز سے وہ بھی ان سب کے ساتھ روزگار کی دوڑ میں شامل ہوا تھا۔ پروفیسر تنویر نے اسے ہوم ٹیوشن دلوانے کے بجائے اپنے نئے بنائے ادارے کے لیے رکھ لیا تھا۔ صبح سے شام تک کام کرتے اس نے خود کو مشین بنا لیا تھا۔ نہ وہ کچھ سوچنا چاہتا تھا نہ یاد کرنا۔ دوپہر کو فراغت کے دو ڈھائی گھنٹے بھی وہ وہیں گزارتا تھا۔

مہینے بعد تنخواہ کے ملنے والے پیسے اس نے لا کر اسد کی گود میں ڈال دیے تھے۔ وہ حیران پریشان اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔

''والدین کی خواہش پوری کرنے میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔'' نرمی سے کندھا تھپتھپا کر وہ بستر پر چلا گیا۔ پہلے آنکھیں نم ہوئیں پھر دھند چھائی اور پھر آنکھوں کی آغوش سے نمکین پانی بے گھر ہوا۔ اسد اس کے پیسے دینے پر تو حیران ہوا ہی تھا لیکن جتنے پیسے اس نے دیے تھے اتنے تو اسے دو تین گھروں میں پڑھانے پر بھی نہیں ملتے تھے۔ اس رات وہ چاروں اسے کمرے میں چھوڑ کے کہیں باہر نکلے تھے۔

اس کے بارے میں اس کے سامنے وہ کیسے بات کرتے؟ ٹیچنگ کے شعبے میں اتنے پیسے کسی معمولی پڑھے لکھے شخص کو نہیں مل سکتے تھے۔

وہ کتنا پڑھا ہوا تھا؟ اور اب ایسے دربدر کیوں

پھر رہا تھا؟

اس کا گھر بار کہاں تھا؟

گھر والے کون تھے۔ وہ سارے سوال جو اس کے آنے پر بھی اس شدت سے نہیں اٹھے تھے، اب دوبارہ پہلے سے زیادہ قد آور ہوئے کھڑے تھے۔ اب ان سے نظر چرانا ممکن نہیں تھا۔ انہوں نے فرض کرلیا تھا، کسی لڑکی کے لیے اس نے گھر چھوڑا ہوگا۔ ڈھائی تین ماہ میں انہوں نے اسے ایک بار بھی باہر جاتے نہیں دیکھا۔ اس نے کبھی کسی کا فون نہیں مانگا تو پھر کیسی محبت ہوئی کہ جس کے لیے گھر چھوڑا۔ گھر چھوڑ کے اس کو بھی چھوڑ دیا۔ لاوارث اور کسی رشتہ دار کے گھر پرورش پانے والا مفروضہ قائم ہونے سے پہلے ہی ختم ہو جاتا کہ جب وہ انہیں ملا تھا اس کا لباس اس کی صحت اور پھر ہسپتال میں اس کا پراعتماد رویہ۔

جتنا قانع وہ تھا اس کی صرف دو وجوہات ہو سکتی تھیں یا تو زندگی کی حقیقت پا کر زندگی کی بے ثباتی کو مان لیا ہو یا نیت اتنی بھر چکی ہو کہ کسی بات کی خواہش نہ رہی ہو۔ اسد کو اس کا پروفیسر تنویر کے ادارے میں داخل ہونے کے بعد غیر مرعوب رویہ بھی یاد تھا۔ وہ کوئی مجبور محتاج نہیں تھا۔ پھر کیا تھا جو وہ اپنے اصل سے منہ موڑے بیٹھا تھا۔

☆☆☆

دن رات کے پھیر میں سات ماہ مزید گزر گئے۔ اپنا آپ بھلا کر اس نے خود کو اس طرح مصروف کیا ہوا تھا کہ پچھلی فراغت محض ایک خواب ہو کر رہ گئی تھی۔ تاریک ذہن کے پردے پر دو آنکھیں اب بھی جگنو بن کر چمکتی تھیں لیکن یہ تو ازل سے طے تھا کہ ارسل عباس کو ان کے تعاقب میں انجانی راہوں کا مسافر نہیں بننا تھا۔

حالات کی سرد قبر میں کپکپا دینے والی ٹھنڈی راتوں میں اس نے بے ایمانی کے کسی جذبے سے خود کو گرمائش نہیں بخشی تھی۔ تند حالات میں بھی اس کا دل کم از کم اس اطمینان میں تھا کہ وہ اس نے بے ایمانی نہیں کی۔ دل کو وہ محبت سے روک نہیں سکا تھا لیکن خواہش سے روک لیا تھا۔

یہ بہار کی ایک روشن صبح تھی۔ کیاریوں میں لگے پودوں پر بہار کی اوس نور بن کر کلیوں کو رنگ بخش رہی تھی۔ وہ اپنے مخصوص وقت پر ادارے کے دفتر میں بیٹھا اپنے روز مرہ کے کام میں مصروف تھا جب پروفیسر صاحب اندر آئے۔ کافی دن بعد ایسا ہوا تھا کہ وہ علی الصبح دفتر آئے تھے۔ ورنہ پچھلے کچھ ماہ سے وہ دیر سے آ رہے تھے۔ کلاسز شروع ہونے میں ابھی وقت تھا۔ ارسل انہیں مختلف تفصیلات سے آگاہ کرنے لگا تھا۔

"تم نے جہاں میرے بہت سے اندازے صحیح ثابت کیے ہیں، وہیں ایک اندازہ غلط بھی ثابت کیا ہے۔" سسٹم شٹ ڈاؤن کر کے وہ اس کی طرف متوجہ ہوئے۔

"وہ کون سا سر۔"

"میرا اندازہ تھا کہ تم دو تین ماہ سے زیادہ ٹک نہیں پاؤ گے۔"

وہ جواباً مسکرا کر رہ گیا۔ ان کی اگلی بات پر اس کے ہونٹ بھنچ گئے۔

"جلد یا بدیر انسان کو اپنے اصل کی طرف لوٹنا ہوتا ہے اور مجھے یقین کی حد تک گمان تھا کہ جلد یا بدیر تم بھی اصل کی طرف لوٹ جاؤ گے۔ اسد میرا بہت ہونہار طالب علم رہا ہے۔

بحیثیت ایک استاد میرا رابطہ ٹین ایج کے بچوں سے لے کر میچور عمر کے لوگوں تک عام لوگوں سے زیادہ رہا ہے اور تقریباً ہر شخص کو عمر کے کسی نہ کسی حصے میں غیر معمولی حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ تو ان سب باتوں کے پسِ منظر میں یہ بات کوئی زیادہ غیر معمولی بھی نہیں تھی۔ اس وقت تک جب تک میں اس لڑکے سے مل نہیں لیا۔ داخلی دروازے سے آفس کے اندر آنے تک میں یہ بات دعوے سے کہہ سکتا تھا کہ وہ لڑکا حالات کا مارا یا عام لڑکا نہیں۔ جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں ہر شخص جلد یا بدیر اپنے اصل کی طرف لوٹتا ہے تو اس کی عمر سے میرا اندازہ یہی تھا کہ دو سے تین ماہ اور زیادہ سے زیادہ ایک ماہ مزید۔ اس

کے بعد یہ بھی لوٹ جائے گا۔

ٹیچر وہ کیسا ہوگا میں نہیں جانتا تھا لیکن وہ ایک اچھا منتظم ہوگا یہ بات میں جان گیا تھا۔ اس لیے بیٹی کی شادی تک انتظام وانصرام اس کے حوالے کر کے میں اطمینان سے اپنے فرض سے سبک دوش ہوا اور مجھے یہ ماننے میں کوئی عار نہیں کہ اس بار تم نے مجھے بے حد حیران کیا۔ آٹھ ماہ میں اپنے بارے میں ایک لفظ نہیں کہا۔ کسی بات میں رشتے ناتے کا حوالہ نہیں دیا۔ ارسل عباس مجھے ایسا نہیں لگا تھا۔

ان کے بات ختم کرنے پر بھی اس نے جھکا سر نہیں اٹھایا۔ چپ کے قفل اتنے بھاری تھے کہ چند فقروں کا مزید بوجھ اٹھانے کے متحمل نہیں ہو سکے اور زمین بوس ہو گئے۔ اپنی کہانی کے بارے میں کبھی کوئی شخص غیر جانب دار نہیں ہو سکتا اس کے باوجود بڑی حد تک اس نے غیر جانب داری سے سارا معاملہ کھول دیا۔

''میں نے بتایا نا میرا واسطہ روزمرہ کی بنیادوں پر بہت سے غیر معمولی حالات وواقعات سے پڑتا رہتا ہے تو ان میں بہت سے واقعات ہیں جن میں ماں باپ جذبات میں آ کر کسی بہن بھائی کی گود میں اپنی اولاد ڈال دیتے ہیں اور اس کے بعد ایک سے ایک نئی کہانی جنم لیتی ہے۔ کبھی فوسٹر پیرنٹس کے گزر جانے کے بعد اس اولاد کو ان کے اصل والدین کی طرف لوٹایا گیا اور انہوں نے یہ کہہ کر رخ پھیر لیا کہ جو دے دیا سو دے دیا۔ کبھی اصل والدین کے پاس وراثت میں حصہ لینے بھیج دیا گیا وغیرہ وغیرہ۔ تمہارا معاملہ اپنی نوعیت کا منفرد معاملہ ہے جس میں دو جوڑے ایک اولاد کو اپنی اپنی جگہ سگا سمجھتے ہیں، محبت لٹاتے ہیں۔ ہر شخص کا محبت کرنے کا انداز مختلف ہوتا ہے۔ ایسے ہی ماں باپ بھی اپنی اپنی جگہ مختلف انداز سے پیار جتاتے ہیں۔ کچھ اپنی محرومیوں کے مدنظر بچوں کو سہولیات میں تول دیتے ہیں اور کچھ کم سہولیات اور زیادہ وقت دے کر پیار کا اظہار کرتے ہیں۔''

اس کی نظر میں زینب اور عباس گھوم گئے تھے۔

ساتھ ہی اپنا شاہانہ بیڈروم بھی جس میں اس کا قیام محض رات کا ہوتا تھا۔

''تو ثابت ہوا، سب ماں باپ اپنی اولاد سے پیار کرتے ہیں۔ اب تم یہ سوچو کہ تمہارے ساتھ غلط کیا ہوا؟ تمھیں دوہرا پیار ملا اور آسائش کے ساتھ آسانیاں بھی۔ اپنے بہن بھائیوں کی طرف دیکھو تو تمہیں اندازہ ہوگا کہ تمہارے پاس بہت کچھ ایسا ہوگا جو ان لوگوں کے پاس نہیں ہوگا۔''

جس طرح ہر ماہ وہ فون بدلتا تھا، اس پر اس نے افق کو رشک سے پاگل ہوتے دیکھا تھا اور جس طرح علی عباس کا کاروبار تھا۔ اس نے کئی مرتبہ زارون کو حسرت وحسد جیسی کیفیت میں مبتلا دیکھا تھا۔

''تم تو ہر صورت ون پوزیشن میں ہو۔ پھر خود ساختہ ناراضی کیسی؟ ٹھیک ہے، انہوں نے اپنی مرضی سے قسمت لکھنے کی کوشش کی لیکن یہ بھی تو سوچو جب تک اوپر والا نہ چاہے کیا ہو سکتا ہے؟ لکھنے والے نے سب ایسے ہی لکھا تھا اور اس میں تمہارا کوئی نقصان بھی نہیں۔''

سہ پہر ڈھل رہی تھی۔ شام کی کلاسز کے طالب علم آنا شروع ہو چکے تھے۔

''اگر آپ خود غرض نہ سمجھیں تو میں اب جانا چاہوں گا۔'' باہر پڑے گملوں میں ہوا سے لہراتے پتوں پر نظر جماتے اس نے کہا۔

''اگر اب مجھے بھی نہیں جاؤ گے تو مجھے پتھر دل لگو گے اور ویسے بھی جس جگہ نہ تم سے پہلے کوئی آیا تھا اور نہ تمہارے جانے کے بعد کوئی آئے گا اس جگہ کے لیے ایسی جگہ کی فکر کرنا جہاں تم سے پہلے کوئی تھا اور تمہارے بعد کوئی اور ہوگا، نری حماقت ہے۔'' انہوں نے اس کی مشکل مزید آسان کی تھی۔

''جاتے جاتے اپنا حساب بے باق کر جانا۔''

''وہ آپ اسد کے ساتھ کر لیجیے گا۔ ان شاء اللہ بہت جلد آ کر ملوں گا۔''

''کہاں جاؤ گے اب؟''

''اپنے گھر۔''

وہ جانتا تھا اسے کہاں جانا ہے۔ مزید تاخیر کی گنجائش نہیں تھی، پہلے ہی وہ بہت دیر کر چکا تھا اس لیے فوراً وہاں سے نکل آیا تھا۔ واپسی کا امکان مکمل طور پر نظر انداز کر کے بھی وہ یہ جانتا تھا کہ لکھنے والے نے اس کے قدموں تلے فقط ایک راستہ لکھا ہے اور اب اسے اسی راستے پر چلنا تھا۔

شام کے ملگجے اجالے پر اندھیرا غلبہ پا رہا تھا۔ پرندے گھروں کو لوٹ رہے تھے۔ ان میں ایک صبح کا بھولا بھی تھا جو اس شام لوٹ آیا تھا۔ کھلے دروازے سے اندر داخل ہوتے چاروں طرف استقبال کو اجالے تھے لیکن وہ روشنی نہیں تھی جس کی ضو نے اس کے اندر اندھیرا نہیں ہونے دیا تھا۔ باورچی خانے میں برتنوں کی آواز سن کر وہ بے آواز اندر چلا آیا۔

آج بہت دن بعد زینب کا دل چاہا تھا دلیہ بنانے کو۔ ارسل کو دال سبزی نہیں پسند تھی۔ ہر کھانے میں اسے گوشت ہی چاہیے ہوتا تھا۔ گوشت کے علاوہ ایک دلیہ ہی تو وہ شوق سے کھاتا تھا اور جس دن سے وہ گیا تھا اس نے ایک بار بھی دلیہ نہیں بنایا تھا۔ آج بھی جانے کیسے دل کر گیا اور وہ اٹھ کر باورچی خانے میں چلی گئی۔ چولھے پر رکھے دلیے کو دیکھ کر ایک بار پھر اسے ارسل کی یاد نے آن گھیرا تھا۔ آنکھوں سے بے اختیار پانی بہنے لگا تھا۔ اس پانی کے پیچھے اک نقش ابھرا اور پھر وہ نقش اس کے من پسند سانچے میں ڈھل گیا۔ ارسل عباس۔

اس نے کئی بار اس کی واپسی کا خواب بنا تھا لیکن ایسا سچا خواب۔ ہاتھوں کی مٹھیاں بنا کر اس نے آنکھیں رگڑ ڈالیں۔ اب کی بار تصویر کے رنگ بکھرے نہیں۔ وہ وہیں کھڑا تھا۔ وہ واپس آ گیا تھا۔

"میرا بچہ..... میرا شہزادہ..... میرا ارسل۔"

اسے سینے میں چھپا کر وہ اس کا منہ سر چومتی روتی جا رہی تھی۔ خود اس کی بھی آنکھیں اشک بار تھیں۔ صحرا سے جیسے کسی نخلستان میں آ گیا تھا۔ دلیہ ابل ابل کر چولھا خراب کر گیا لیکن دھیان کسے تھا۔ ایک چور نگاہ اس نے عقب میں ڈالی تھی۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ نہ عاصمہ نہ عباس۔ نہ ہی کوئی اور۔ وہ اکیلا آیا تھا۔ وہ جہاں کہیں بھی تھا وہاں سے زینب کے پاس آیا تھا۔ ارسل عباس اپنی مرضی سے اسے ملا تھا۔ ایک پیاسی ممتا کا دل خوشی سے بھر گیا تھا۔

زینب کی ممتا پر سے شک تو پہلے ہی ختم ہو چکا تھا لیکن اب ایسا والہانہ استقبال، اس پر اس کی ایسی حالت۔ وہ اتنی کمزور ہو گئی تھی کہ ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ ہی لگ رہی تھی۔ ارسل کو خود پر افسوس ہوا تھا۔

"اوہو۔ میرا بچہ اتنے دن بعد گھر آیا ہے اور میں رونا مچا کر بیٹھ گئی ہوں۔ کتنا کمزور ہو گیا ہے۔ کھانا ٹھیک سے نہیں کھاتا رہا نا۔"

"نہ بنا کر دینے والی اماں تھی نہ کھلانے والا ابا۔" ایک بار پھر زینب نے اسے خود سے لگا لیا۔

"میں بنا کر لاتی ہوں۔ اپنے ہاتھوں سے کھلاؤں گی۔ بتا میرا پتر کیا کھائے گا؟"

"اماں! آج کچھ نہیں۔ بس جو بنا ہوا ہے وہی کھاؤں گا۔ آج بہت ساری باتیں کرتے ہیں۔" کندھوں سے پکڑ کر اس نے زینب کا رخ باہر کی طرف موڑا۔

"اچھا اچھا، چولھا تو بند کر آؤں۔" وہ کوکنگ رینج کی طرف مڑی تو ارسل باہر نکل آیا۔ کتنے دن بعد دیکھا تھا ان در و دیوار پر ٹھہری رات کا منظر۔ بے خیالی میں وہ اپنے کمرے کے دروازے کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

زینب چولھا بند کر کے باہر آئی تو اپنے دھیان میں آتے عباس علی پر نظر پڑی۔ فرطِ جوش میں وہ اسے آواز دے بیٹھی۔

"ارسل کے ابا!"

عباس علی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آواز میں خوشی کی چہک اور جوش کی وہ لرزش تھی کہ وہ نظر انداز نہیں کر سکے۔ لفظوں پر تو انہوں نے دھیان ہی نہیں دیا تھا۔ جس دن سے ارسل گیا تھا اس نے کبھی ارسل کے ابا کہہ کر نہیں پکارا تھا۔

عباس علی کو سوچ میں گم دیکھ کر وہ آگے بڑھی اور

ہاتھ سے پکڑ کر اندر کھینچا۔ اتنی دیر میں اس کی آواز سن کر ارسل بھی باہر آ گیا تھا۔ سامنے کھڑے عباس علی کو دیکھ کر ایک بار پھر اس کے دل کو افسوس نے آن گھیرا تھا۔ ان کا سہارا بن کر اس نے انہیں بے سہارا کر دیا تھا اور اب اپنے وجود کا بار بھی انہوں نے کیسے اٹھا رکھا تھا۔

''ابا۔'' بھاگ کر وہ ان کے قدموں میں جا بیٹھا۔ ''معاف کر دیں ابا! غلطی ہو گئی۔ اب کبھی کوئی غلطی نہیں کروں گا۔'' وہ رو رہا تھا۔

''جا کر غلطی کی تھی تو آ کر سدھار بھی لی۔ اب معافی کس بات کی۔'' اسے اٹھا کر انہوں نے گلے سے لگا لیا۔

''عاصمہ سے ملے؟'' اس سے الگ ہوتے انہوں نے پوچھا۔

''نہیں۔ پہلے گھر آیا ہوں۔ اپنی اماں اور اپنے ابا کے پاس۔''

عباس علی جو اس کے جانے سے پریشان ہوئے تھے، ٹوٹے بھی تھے مگر روئے نہیں تھے۔ آج اس کے آنے پر بھی نہیں روئے تھے لیکن اس کی اس بات پر رو پڑے تھے۔ کون کہتا ہے وہ بے اولاد تھے۔ اپنی تمام تر طاقت سے انہوں نے ارسل کو بھینچ لیا تھا۔

ارسل تو عاصمہ کو اپنے آنے کی اطلاع بھی نہیں دینا چاہتا تھا کہ کہیں وہ اسی وقت اس سے ملنے نہ پہنچ جائے۔ آج رات وہ صرف ان دونوں کے ساتھ گزارنا چاہتا تھا۔ عباس علی کو بہن کی قربانی کی قدر تھی اسی لیے تو بہانے سے اٹھ کر چپکے سے اسے فون کر آئے تھے۔

اس رات پہلی بار زینب نے اس کے ساتھ اتنی باتیں کی تھیں۔ اپنا دل کھولا تھا۔ وہ دل جس میں ارسل کے لیے چھپے محبت کے خزانوں سے وہ خود بھی لاعلم تھی۔ ارسل کے بچپن۔ اس کی پیدائش سے پہلے کی۔ اس کے گھر چھوڑ کر جانے سے واپس لوٹ آنے تک انہوں نے بے شمار باتیں کی تھیں۔ ارسل کا ارادہ تو پوری رات جاگنے کا تھا۔ یہ تو چہرے پر زمانوں کی تھکن لیے زینب کا منہ دیکھ کر عباس علی نے اسے سونے بھیج دیا تھا۔ آج اتنے سالوں بعد بنا کسی خوف کے زینب نے پرسکون نیند سونا تھا۔ اس سے پہلے اسے شکرانے کے نوافل بھی ادا کرنے تھے۔ نوافل تو ارسل نے بھی ادا کرنے تھے کہ اللہ کی ذات نے اسے دیر سے ہی سہی پر صحیح فیصلہ کرنے کی توفیق بخشی تھی۔

کمرے میں شناسا سا منظر قید تھے۔ وہی بستر۔ وہی پردے۔ وہی کھڑکی کے پاس پڑی کرسی اور میز۔ ہاں مگر اس میز پر پڑا گلدان نیا تھا۔ بتی جلاتے ہی ہر منظر روشن ہو گیا تھا۔

چلتے ہوئے وہ اس میز تک آیا۔ چینی کا سفید گلدان۔ جس میں یقیناً سرخ گلاب رہے ہوں گے۔ گلدان وہیں چھوڑ کر وہ بیڈ کی طرف چلا گیا۔ یہاں ایک شرٹ تھی۔ جواب نہیں تھی۔ ایک ایک کر کے اس نے ساری درازیں چھان ماری تھیں لیکن وہ شرٹ اسے کہیں نہیں ملی۔ پہلی اور آخری سوغات تھی وہ اس کی خاموش محبت کی۔ وہ شرٹ جو عزہ فاروق نے کچھ گھنٹوں کے لیے اپنے وجود پر چڑھائی تھی۔ وہ کہیں نہیں تھی۔ ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک کر وہ بستر پر چلا گیا۔ اماں نے اگر دھودی ہوتی تو کم از کم یہیں کہیں مل تو جاتی۔ کہیں زارون۔ سر جھٹک کر اس نے در آنے والی سوچ کو جھٹکا۔ اسے اب سب بھلا دینا تھا۔ عزہ فاروق اور اس کی محبت کو بھی۔ آج رات اسے سوچ کر زندگی کا پزل مکمل کرنا تھا۔ رشتے اور رشتے داروں کو ان کے صحیح خانوں میں فٹ کرنا تھا۔

☆☆☆

رات دیر تک جاگنے کی وجہ سے صبح اس کی آنکھ بہت دیر سے کھلی۔ یا شاید اتنے وقت کے بعد گھر کا سکون ملا تو بہت پیاری نیند آئی تھی۔ گھڑی کی سوئیاں گیارہ کے آس پاس گھوم رہی تھیں۔ تر و تازہ ہو کر باہر نکلا تو پہلی نظر عاصمہ پر پڑی۔ وہ بھی اسی کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

''جب تک کزن تھے بھائی بنے رہے اور جب بھائی بنے تو پھر غیر ہی ہو گئے۔ میرا بھائی ہونا اتنا برا تھا کہ گھر چھوڑ کر چلے گئے۔'' افق اس کی پشت

سے نکل کر اس کے سامنے کھڑا تھا۔
''بھائی تھا اور بھائی ہی رہوں گا۔خبردار اب اگر مزید بکواس کی۔'' بے اختیار ہی ارسل نے اسے سینے سے لگالیا تھا۔
''امی! آپ سے کیسے معافی مانگوں؟ آپ کا بیٹا زندگی کی جماعت میں بڑا پیچھے ہے۔ ہر بات دیر سے سمجھتا ہے۔آپ سب کی محبت سمجھنے میں بھی بہت دیر ہوگئی مجھ سے۔''
رات جب عباس علی نے اس کے آنے کی اطلاع دی تھی تو اس کے خیر سے لوٹ آنے پر وہ خوش ضرور ہوئی تھیں لیکن دل میں ایک کانٹا سا چبھ گیا تھا۔ارسل ان کا بیٹا تھا اور جانتا بھی تھا۔ پھر بھی وہ ان کے پاس نہیں آیا۔ انہیں فون نہیں کیا۔اس نے آج سچ میں غیر ہو کر دکھایا تھا۔ان کی ممتا پر یہ بات چابک کی طرح لگی تھی جس کے درد سے وہ ساری رات عباس سے بھی منہ چھپا کر روتی رہی تھیں۔ ایک بات انہوں نے گزری رات میں سیکھی تھی کہ اب انہیں اپنے بیٹے سے فاصلہ رکھ کر ملنا ہوگا۔اور اب اس کے ''امی'' پکارنے پر وہ ایک بار پھر سے ٹوٹی تھیں۔ اپنے بیٹے کو اس نے کتنا غلط سمجھ لیا تھا۔ سالوں پہلے ان کے کیے فیصلے کو مان کر وہ گویا ان کا مان بڑھا رہا تھا۔ بری طرح روتے وہ اس کو خود سے لپٹائے کھڑی تھیں جب باورچی خانے سے اپنے لیے روٹی لے کر نکلتی انعم کی اس پر نظر پڑی۔ بھاگتی ہوئی وہ اس تک آئی تھی۔
''بہت برے بھائی ہو بھئی۔ جانتے بھی ہو، میرا بھائی بس ایک ہی ہے۔ پھر بھی چھوڑ کر چلے گئے۔ کہنے کو تین بھائیوں کی اکلوتی بہن ہوں لیکن اہمیت ایک ٹین ڈبے جتنی بھی نہیں۔''
اس کے پہلو سے لگی گلے شکوے کرتی وہ ارسل کو اتنی پیاری لگ رہی تھی کہ اس پیارے رشتے پر قربان ہونے کو دل چاہا تھا۔انسان پیدائش سے ہی نا شکرا رہا ہے۔اسے ہمیشہ بہن بھائیوں کی خواہش رہی تھی کہ کسی قیمت پر اس کے بھی ایسے پیارے رشتے ہوں اور جب دینے والے نے اسے نوازا تو وہ ناشکری کرتا گھر سے ہی چلا گیا۔
''میری بہن ہو کر بھی اہمیت نہ ہونے کا گلہ؟ اچھا بتاؤ، آئس کریم کھلاؤں یا اچھا سا کھانا؟ مجھے معافی کس طرح ملے گی؟''
''اتنے سستے میں جان نہیں چھوٹے گی اب۔ آپ کی شادی کی ساری خریداری آپ کی جیب سے۔''
''مارے گئے۔'' افق چیخا۔
ہم م م.....ٹھیک ہے۔ابھی تو اماں لڑکے کی ماں بن کر گھر گھر لڑکی دیکھنے جائیں گی، پھر کوئی ایک فائنل ہوگی۔ پھر وہ لوگ لڑکی کے بہتر مستقبل کے لیے تھوڑا سوچ بچار کریں گے۔ پھر اگر میں انہیں پسند آیا تو بات آگے بڑھے گی۔ منگنی ہوگی جو سال چھ ماہ بعد شادی تک جائے گی۔ بہت وقت پڑا ہے کہیں کمیٹی ڈال لیتا ہوں۔'' سنجیدہ لہجے میں کہتے وہ عباس اور عاصمہ کے ساتھ بیٹھ گیا۔
''جی نہیں اب ایسا بھی نہیں، پھپھو نے تو کب کی لڑکی پسند کی لی۔''
''واقعی۔'' خوش گوار سی حیرت نے اسے آن گھیرا۔
''اور کیا۔اتنی پیاری لڑکی ہے۔آپ اس سے مل بھی چکے ہیں۔'' انعم کی بات پر وہ حیران ہوا تھا۔ قریب بیٹھے سب ہی ان کی نوک جھونک سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔
''وہ کون ہے؟''
''کیوں بتاؤں۔خود اندازہ لگائیں۔''
''نہ بتاؤ، شادی تو میری ہی ہے، ابھی سوچنے سمجھنے کا وقت نہ دیا تو عین وقت پر مکر جاؤں گا، گھر چھوڑ جاؤں گا۔ پھر واپس بھی نہیں آؤں گا۔'' اس کی دھمکی کا انعم پر کچھ اثر ہوا تھا کہ نہیں زینب تڑپ کر رہ گئی تھی۔
''نہ میرا بیٹا، کیوں جائے گا۔لڑکی نہ پسند آئی تو میں خود انکار کر دوں گی۔ مگر وہ ایسی ہے کہ انکار کرنے کی نوبت نہیں آئے گی۔لوگ چاند سورج کی جوڑی کہیں گے۔ ہے ناں بھابھی؟'' اماں کی بات پر وہ

کی کمی کو ہماری قارئین نے بھی محسوس کیا اور ہم نے بھی..... آپ کے مشوروں والے خط تو ہمیں ملے ہی نہیں۔دوماہ پہلے ایک خط ملا تھا لیکن اتنی تاخیر سے ملا کر ہم شامل نہ کر سکے۔ ہمیں بے حد افسوس ہے کہ آپ کے جذبات کو ٹھیس پہنچی۔اب آئندہ خط شامل نہ ہو تو یقین کرلیں کہ ہماری محبتوں میں کمی نہیں بلکہ محکمہ ڈاک کی کوتاہی ہے۔

خنساء طاہر ڈیرہ اسماعیل خان سے لکھتی ہیں

تمام قارئین کو میرا محبتوں بھرا سلام۔شعاع کے سارے سلسلے ہی بہت اچھے ہیں لیکن مجھے سب سے زیادہ پیارے نبی کی باتیں اور تاریخ کے جھروکے پسند ہے۔ سلسلے وار ناول سب اچھے ہیں۔فرح بخاری !ابھی تو بن پاکھی، کا ہیرو رافع ہی نہیں بھولا اور اب ''وہ نازنین'' کا عبدالواسع، راشدہ رفعت اور فریدہ سیفی کے ناول بھی اچھے تھے۔پلیز عفت سحر طاہر کی ازمیر بٹ سیریز اور ثمرہ بخاری کی شبلی جوادسیریز دوبارہ لائیں۔

☆ پیاری خنساء! ہماری اور ہماری پیاری قارئین کی طرف سے خلوص بھرا وعلیکم السلام۔

عفت سحر طاہر سے ہم آپ کی فرمائش سے پہلے ہی کہہ چکے ہیں۔انہوں نے کہا ہے کہ وہ جلد لکھیں گی۔ثمرہ بخاری نے بھی وعدہ کیا ہے کہ جیسے ہی انہیں فرصت ملی، وہ قارئین کے لیے شبلی اور جوادی سیریز ضرور لکھیں گی۔

شعاع کی پسندیدہ کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔

کوثر خالد جڑانوالہ سے شریک محفل میں لکھا ہے

ساس صاحبہ اصلی گھر تشریف لے گئیں، اب خوابوں میں آتی ہیں۔ہمیں جھولا جھلاتی ہیں۔

لاہور والا بیٹا ثمر بیوی بچوں سمیت نوکری جانے کے باعث ادھر آگیا ہے۔ہماری ذمہ داری بدل گئی ہے۔ ساس ہمیں بیٹی سے بڑا درجہ دے گئی ہیں اور اب بہو کو بیٹی بنانا ہے۔

آج جاگ نہیں آئی تو صبح ناشتہ بنا کر نماز قرآن پڑھنے سے پہلے آپ کو احوال کے ساتھ نعت بھیج رہی ہوں۔جو بہو سے منتخب کروائی۔بہو نے مشین لگالی ہے ساتھ بچے نہلا رہی ہے۔ایک کو جھولے میں ڈال دیا ہے۔ میں جھولے دے رہی ہوں۔بہو ہر کام میں ماہر ہے ،سلائی کر رہی ہے لوگوں کی اور بیٹا سبزی منڈی جارہا ہے۔پوتوں کو میں پڑھا رہی ہوں۔کتنے ہی حرفوں کی پہچان ہوگئی ہے بڑا ربیع تو نقطوں پر اے لکھنے لگا ہے۔ علی دوسال کا ہے۔شعاع دکھا کر پوچھا۔علی کس سے بنتا ہے تو ع پر ہاتھ رکھ دیا ماشاءاللہ۔مستقل سلسلے تو پڑھ کر دل میں اتار لیے۔مگر کہانیاں پڑھنا شاید ممکن نہ ہو۔کیونکہ قرآن لکھنے کا وقت نہیں ملتا۔ہمسایہ میں بچی فضا کی شادی ہے بہو بیٹا جائیں گے۔میں قرآن پڑھ کر تحفے میں دوں گی بس۔تاکہ شادی کامیاب ہو۔بہو بیٹی بن کر رہے اور ساس ماں بن کر۔آج اتنا ہی کافی ہے۔

پیاری کوثر.....آپ نے اپنی ساس کی اتنی خدمت کی۔انہیں ماں سمجھا۔اسی لیے آپ کی ساس آپ کو خوابوں میں آکر جھولا جھلاتی ہیں اور آپ کو ہنر مند اور خدمت گزار بہو ملی ہے۔

آج ہی اخبار میں پڑھا تبدیلی آنے کے بعد اب تک بارہ لاکھ لوگ بے روزگار ہو چکے ہیں۔ہمیں افسوس ہے کہ آپ کے ربیع بھی اس کی زد میں آگئے۔ہم ان کے لیے دل سے دعا گو ہیں۔اللہ تعالیٰ ان کو برسر روزگار کرے۔آمین۔

گوجرہ سے فرحانہ مہناز نے لکھا ہے

بہت ہی دل افروز اور خوب صورت پیارے نبیؐ کی پیاری باتوں سے ابتدا کی۔اس کے بعد میجر عمر فاروق کا احوال پڑھا، ماشاءاللہ سے اتنی ڈگریاں پڑھ کر اچھا لگا۔(میری دعا ہے کہ میرا بیٹا بھی Nust میں پڑھے آمین) سلسلے وار کہانیاں بجائے دلچسپ ہونے کے بور ہوگئی ہیں۔''وہ نازنین'' بھی اس کا بار خانہ پری ہی تھی کسی بھی چیز کو بے جا طول دینے سے سمٹ جانا ہی بہتر ہے باقی نظیر فاطمہ کا بامراد زیادہ پسند آیا ہے ''ماہی بے آب'' بھی اچھا لگا۔''یار دل دار'' افشاں جی بجائے ہنسانے کے رلا دیا۔دوستوں کی دلداریاں بہت اچھی لگیں۔

اب بات ہوجائے ''خط آپ کے'' سلسلہ کی تو جناب زینب نور جی قانتہ آپی نے آپ کے بارے میں ہی کہا تھا کیونکہ ان کا میکہ جہانیاں میں ہے اور آپ کے بھائی نے آپ سے مذاق کیا۔پڑھ کر لبوں پر مسکراہٹ بکھر

جانے کیا ہوگا اور سب سے اہم بات جانے وہ اس رشتے کے لیے راضی کیسے ہوئی ہوں گی۔اسے ایک بار ان سب غلط فہمیوں کو دور کرنا تھا لیکن زینب بھی اتنی محبت سے اپنا فیصلہ سنا کر جا چکی تھی کہ اسے اپنے ہاتھ پشت سے بندھے محسوس ہو رہے تھے۔جو بھی تھا وہ عزہ کو اس کی مرضی کے بغیر کسی دباؤ کے تحت اپنا نہیں سکتا تھا۔اسے کچھ کرنا تھا۔کیا کرنا تھا یہ ابھی اس نے طے کرنا تھا۔

☆☆☆

''یہ کیا ہے؟'' وہ فیکٹری کے دفتر میں بیٹھا تھا جب عباس علی نے کچھ کارڈز لا کر اس کے سامنے رکھے۔

''تمہاری شادی کے کارڈ ہیں اور کیا ہے؟''

''میری شادی؟ کب۔کیا؟'' وہ حیرانی سے اپنے سامنے میز پر پڑے کارڈ دیکھ رہا تھا۔

''کیا تمہیں نہیں پتا؟ مجھے تو زینب نے کہا تھا تم سے بات ہوگئی ہے۔'' جواباً عباس علی اس کی حیرانی پر حیران ہوئے تھے۔

''میری بات ہوئی تو تھی لیکن اتنی جلدی شادی؟'' اس نے جلدی سے بات سنبھالی۔وہ پہلے ہی ان سب کو اتنا پریشان کر چکا تھا کہ اب مزید پریشان کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

''تمہارے لیے جلدی ہے نا۔ یہاں تو سب پہلے سے ہی فائنل تھا کہ جب تم آؤ گے، اس کے ایک ماہ کے اندر اندر تمہارے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دینی ہیں۔'' کچھ غیر مطمئن سے وہ اسے بغور دیکھ رہے تھے۔

''ٹھیک ہے پھر آپ دیکھ لیں، کوئی بھی کارڈ جو آپ کو پسند ہو۔میں ذرا کام سے جا رہا ہوں۔'' کارڈ ان کے آگے سرکا کر چابیاں اٹھاتا وہ اٹھ کر باہر نکل گیا۔

☆☆☆

اس کی خاموشی کو رضامندی سمجھ کر گھر میں زور و شور سے شادی کی تیاریاں شروع ہو چکی تھیں۔وہ خاموش تماشائی بنا ہوا ان کو ادھر سے ادھر بھاگتا دیکھ رہا تھا۔گھر کے افراد اگرچہ وہی تھے لیکن چونکہ عاصمہ بھی ہر دو تین دن بعد آ جاتی تھیں اور ان کے ساتھ کبھی زارون ہوتا، کبھی افق اور انعم تو لازمی ساتھ ہوتی تھی۔اس لیے گھر میں رونق سی لگی ہوئی تھی۔

جہیز کے لیے علی عباس نے سختی سے منع کر دیا تھا اس لیے بری کے ساتھ ساتھ گھریلو استعمال کا سامان، فرنیچر وغیرہ۔ ہر شے زینب اور عاصمہ خوب چاؤ سے لے رہی تھیں۔بازاروں کے چکر پر چکر لگ رہے تھے اور وہ ان کو خاموشی سے دیکھنے کے علاوہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔دل کی مراد پوری ہونے پر اسے تو جھوم اٹھنا چاہیے تھا لیکن اس سے تو خوش بھی نہیں ہوا جا رہا تھا۔ابھی بھی اسے اسی کی فکر تھی۔وہ خوش نہ ہوئی تو فائدہ اس سب کا۔

جانے سے پہلے اس نے اپنا فون اس قوت سے پھینکا تھا کہ ریزہ ریزہ ہو گیا تھا۔اسی فون میں عزہ کا نمبر تھا۔وہ اسے فون بھی نہیں کر سکتا تھا۔بلکہ اگر نمبر ہوتا بھی تو شاید وہ فون نہ کرتا۔ایسی باتیں فون پر کرنے والی کہاں ہوتی ہیں۔پر وہ اس سے ملتا بھی تو کیسے؟ اس نے تو لاہور کا نام بھی زبان پر نہ لانے کی قسم کھا رکھی تھی کجا وہاں جا کر اس سے ملنا۔

اترتی دھوپ کھڑکی کے شیشے پر دستک دیے بنا کمرے میں ڈیرے ڈالے بیٹھی تھی۔جوتوں سمیت وہ بستر پر اس طرح دراز تھا کہ گھٹنوں سے نیچے اس کی ٹانگیں زمین پر تھیں۔کھڑکی کے پاس میز پر شادی کے کارڈ دھرے تھے۔ان پر پانچ دن بعد کی تاریخ درج تھی۔یہ کافی دن پہلے زینب دے کر گئی تھیں کہ اگر اپنے کسی دوست کو بلانا ہو تو بلا لے۔اس کا دوست تھا ہی کون؟

''شٹ۔''

دوست کے خیال پر وہ اچھل کر بستر سے کھڑا ہوا تھا۔اسد، رافع، راشد اور فرخ کے ساتھ ساتھ پروفیسر تنویر کیا سوچتے ہوں گے اس کے بارے میں۔وہ تو آتے ہوئے کسی سے مل کر بھی نہیں آیا تھا۔اس نے تو سوچا تھا، دو چار دن بعد آ کر مل لے گا لیکن یہاں حالات ہی ایسے بن گئے تھے کہ وہ سب بھول بھال گیا تھا۔فون اٹھا کر اس نے ابا کا نمبر ملایا

اور مختصر طور پر انہیں ان سب کے بارے میں بتایا۔
''میں اکیلا اپنی شادی کا کارڈ لے کر جاؤں اچھا نہیں لگے گا۔ آپ میرے ساتھ چلیں گے؟''
''اوہ یار! ان لوگوں کا تو مقروض ہوں میں۔ بتاؤ کب چلنا ہے؟''
''ابھی۔'' گھڑی پر نظر ڈالتے اس نے جواب دیا۔
''چلو ٹھیک۔ میں فیکٹری سے نکل رہا ہوں یہیں آجاؤ۔''
کچھ دیر بعد ہی وہ دونوں لاہور جانے والے راستے پر تھے۔
''تم خوش ہو اس شادی سے؟'' جو سوال انہیں پہلے پوچھنا چاہیے تھا آج پوچھ رہے تھے۔
اصل میں زارون نے انہیں اس طرح سے یقین دلایا تھا کہ وہ اس کی ناپسندیدگی کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے اس کے باوجود انہیں ارسل خوش نہیں لگا تھا۔ ارسل کے پاس آج گھما پھرا کر کرنے کے لیے کوئی بات نہیں تھی۔ ایک لمحے میں اس نے لائحہ عمل سوچ لیا تھا۔
''ابا! میں..... میں شادی سے پہلے ایک بار عزہ سے ملنا چاہتا ہوں۔'' اس سے زیادہ مناسب جواب اتنے کم وقت میں وہ نہیں سوچ سکتا تھا۔
عباس علی نے کچھ سوچتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔

☆☆☆

پروفیسر تنویر اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئے تھے۔ اپنے اندازے کی درستی اور اس کے لوٹ جانے کے فیصلے پر انہیں خوشی تھی۔ ایک گرم جوش ملاقات کے بعد وہ انہیں کارڈ دے کر اسد کی طرف چلے گئے۔
وہ دروازے پر دستک دینے کے لیے آگے بڑھا تو عباس علی فون نکال کر ایک طرف چلے گئے۔
اسد ابھی باہر سے آیا تھا۔ کپڑے تبدیل کر کے اس نے کمرے میں قدم رکھا ہی تھا کہ دروازے پر دستک سنائی دی۔ آگے بڑھ کر اس نے دروازہ کھولا۔ سامنے اسے دیکھ کر وہ ہکا بکا رہ گیا تھا۔ ایک لمحہ لگا تھا اسے ارسل کو پہچاننے میں۔ ٹوٹے بکھرے اور افسردہ آنکھوں والے ارسل اور اس خوش پوش ارسل میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ پہچان لینے کے بعد بھی وہ اس کی طرف قدم نہیں بڑھا سکا۔ وجہ اس کی شخصیت اور اس کے پیچھے کھڑی اس کی امارت کا پتا دیتی گاڑی تھی۔ اپنے ٹراؤزر بنیان پر نظر پڑتے وہ غیر محسوس طریقے سے دروازے کے پیچھے ہوا تھا۔ اس کی جھجک محسوس کر کے آگے بڑھ کر ارسل نے خود اسے گلے سے لگا لیا۔
''کیا یار! بھول گئے ہو مجھے؟'' اس کے گرم جوشی سے ملنے پر اسد کی آنکھیں جانے کیوں نم ہونے لگی تھیں۔ دروازے کے آگے سے ہٹ کر اس نے ارسل کو اندر آنے کا راستہ دیا۔ عباس علی فون پر بات کر رہے تھے۔ ایک نظر ان پر ڈال کر ارسل اندر آ گیا۔ اسد کی طرح فرخ بھی ٹراؤزر بنیان پہنے لیٹا ہوا تھا۔ وہ بے یقینی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ کیا یہ ٹرانسفارمیشن چیلنج والی کوئی ویڈیو تھی؟
''کیسے ہو فرخ؟'' اسی گرم جوشی سے وہ فرخ کی طرف لپکا۔ بادل ناخواستہ فرخ اٹھ کر اس سے بغلگیر ہوا۔ اسے ارسل سے کم از کم اس گرم جوشی کی توقع اپنے لیے نہیں تھی۔
''میں نے سوچا، تم لوگ بھی کہتے ہو گے کس قدر احسان فراموش نکلا کہ پلٹ کر خبر نہیں لی۔ لیکن میں بھی کیا کرتا، اپنی قید سے نکلا تو ایک نئی قید کے آرڈر ہو گئے۔ شادی کر رہا ہوں۔''
ہنستے ہوئے شادی کے کارڈ نکال کر اس نے ایک ایک ان دونوں کی طرف بڑھایا۔ جسے ان دونوں نے خاموشی سے تھام لیا۔
''یہ راشد اور رافع کے کارڈ ہیں، یاد سے انہیں دے دینا۔'' دو کارڈ الگ سے نکال کر اس نے اسد کے ہاتھ میں دیے۔
''اصل میں گھر والوں کو ڈر تھا کہیں پھر نہ بھاگ جاؤں۔'' وہ یوں ایسے مطمئن انداز میں خوش باش بات

کر رہا تھا جیسے اس شادی سے وہ بہت خوش ہو۔اسی وقت عباس علی بھی کمرے میں داخل ہوئے۔

اس کمرے میں ان کے لاڈلے بیٹے نے ان سے دور رہ کر وقت گزارا تھا۔کمرہ کیا تھا، مرغیوں کا ڈربہ تھا۔اس شہزادے کے شایانِ شان یہاں کچھ تھا ہی نہیں۔نہ کوئی سہولت نظر آ رہی تھی اور نہ ہی کوئی سکون۔اس کے باوجود یہ خستہ حال کمرہ ان کے بیٹے کی جائے پناہ رہا تھا۔ایک گہری سانس بھر کر وہ ان کے قریب آ گئے۔

''یہ میرے ابا جی ہیں اور ابا جی! یہ اسد ہے، یہ فرخ۔'' باری باری دونوں نے عباس علی سے مصافحہ کیا۔اپنی اپنی جگہ دونوں اپنے حلیے پر شرمندہ تھے۔

''اللہ نے تم لوگوں کو وسیلہ بنا کر میرے جینے کی وجہ سلامت رکھی ہے، اللہ تم لوگوں کو بھی سلامت رکھے۔'' انہوں نے صدق دل سے دعا دی۔

فرخ دل ہی دل میں خود کو ملامت کر رہا تھا۔ اپنے گزشتہ رویے پر، وہ تو ارسل کے چلے جانے سے پہلے سے ہی شرمندہ تھا اور اب یہ شرمندگی ان کے حسنِ سلوک سے دوچند ہو رہی تھی۔

''اس کی شادی پر آپ سب نے آنا ہے۔ اپنے اپنے گھر والوں کے ساتھ۔جو نیکی تم لوگوں نے کی ہے، اس کا بدلہ میں کبھی نہیں دے۔تم لوگوں کو دیکھ کر یہ احساس ہوتا رہے گا کہ انسانیت ابھی زندہ ہے۔'' بات کے دوران ایک بار پھر ان کا فون بجنے لگا۔زارون کا نمبر دیکھ کر معذرت کرتے وہ الوداعی مصافحہ کرتے باہر نکل آئے۔

''ملتان سے نوکری کرنے لاہور آ سکتے ہو تو کیا گوجرانوالہ نہیں آ سکو گے؟'' وہ اسد کے سامنے کھڑا پوچھ رہا تھا۔

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ اگر تم لوگ گوجرانوالہ آ جاؤ تو میرے ابا کی فیکٹری میں تمہیں تمہاری قابلیت کے مطابق کام بھی ملے گا اور تنخواہ بھی۔ جو یقیناً یہاں کے مقابلے میں بہت بہتر ہوگی۔یہ مت سمجھنا، میں تم پر احسان کر رہا ہوں۔اصل میں دنیا میں اچھے لوگ قسمت سے ملتے ہیں اور میں خوش نصیب ہوں جو مجھے تم لوگ ملے۔میں تم لوگوں کو کھونا نہیں چاہتا۔''

گاڑی میں بیٹھ کر بھی اسے ان دونوں کی آنکھوں میں چمکتی نمی نظر آ رہی تھی۔

''عاصمہ کی طرف چلنا ہے۔زارون سے کہا تھا کہ عزہ سے ملوا دے تمہیں۔تمہاری ماں بھی کوئی مایوں شایوں کے لیے آئی ہوئی ہے۔میں اندر چلا جاؤں گا تم اوپر چلے جانا۔وہیں عزہ سے مل لینا۔'' زارون کے ساتھ بنایا سارا پروگرام انہوں نے اس کے سامنے رکھا تھا۔وہ خاموشی سے ڈرائیو کرنے لگا۔

ان کے پہنچنے پر زارون نے خاموشی سے اسے سیڑھیوں پر چڑھنے کا اشارہ کر دیا تھا جب کہ عباس علی اندر چلے گئے تھے۔

دھیمی رفتار سے سیڑھیاں چڑھتے وہ ذہن میں جملے بنتا چلا جا رہا تھا۔اپنا اور افق کا کمرہ عبور کر کے اس نے اوپر والی سیڑھیوں پر قدم رکھ دیے۔ چڑھتی تاریخوں کا چاند اپنے جوبن کا گواہ بنا مدھم سی روشنی فراخ دلی سے نچھاور کر رہا تھا۔گہری سانس بھرتے اس نے چھت پر نظر دوڑائی۔اوپر تاحال کوئی نہیں تھا۔

☆☆☆

مایوں کا زرد جوڑا پہنے کلائیوں میں گجرے چڑھاتی عزہ کا دل ڈوب ڈوب کر ابھر رہا تھا۔یہ جوڑا ارسل کے گھر سے آیا تھا۔ابھی کچھ دیر پہلے ہی تو زارون اس جوڑے کے ساتھ ارسل کی ملاقات کی خواہش لایا تھا۔جس دن سے ارسل کے واپس آنے کا پتا چلا تھا، اس دن سے وہ اس لمحے کے انتظار میں تھی جب وہ اس سے کلام کرے۔

زارون کی باتوں پر اعتبار کرنے کے باوجود دل میں ایک خوف سا تھا اور یہ خوف ہر گزرتے دن کے ساتھ بڑھتا چلا جا رہا تھا۔پہلے تو اسے رشتوں کا لحاظ، عزت کا پاس روکتا ہوگا لیکن اب جب وہ اس کے نام سے منسوب تھی تو اب کیوں وہ اس کے ہاتھ میں کوئی خوب صورت جگنو نہیں تھما رہا تھا۔کیا اسے

نہیں پتا تھا کہ یہ وقت کتنا جان لیوا تھا۔ کیا اسے نہیں پتا تھا اظہار، اقرار، اعتراف صرف لفظ نہیں ہیں۔ کیا اسے کچھ نہیں پتا تھا؟ اگر واقعی نہیں پتا تھا تو ارسل عباس نے اس سے محبت کر کیسے لی؟ محبت کی بھی یا صرف ایک بھرم تھا جسے زارون نے بنایا تھا؟

اب اس کا پیغام آیا تھا اور عزہ کے لیے وقت رک گیا تھا۔ کیا وہ اس سے یہ کہے گا کہ زارون نے جو بھی کہا، وہ سب جھوٹ تھا، وہم تھا اور یہ کہ وہ ایسا خیال دل سے نکال دے۔ اگر ایسا کہا تو وہ کیا کرے گی؟ عزتِ نفس، دل کی خوشی تو ایک طرف گھر والے، رشتے دار..... وہ کیا کرے گی؟

ایک کے بعد ایک آنے والی سوچ اس قدر جان لیوا تھی کہ اس کا دل مٹھی میں آیا ہوا تھا۔ زارون کی کال پر وہ کسی کی نظر میں آئے بنا پہلی منزل پر بنے اپنے کمرے سے نکل کر چھت پر چلی گئی۔ حبہ کو وہ احتیاطاً کمرے میں چھوڑ آئی تھی۔ شکر ہے اس میں اتنی سمجھ بوجھ تو تھی کہ اس نے کچھ پوچھا نہیں تھا۔

چھوٹی سی مشترکہ دیوار میں بنا راستہ پار کرتے اس نے ارسل کو مخالف سمت میں جاتے دیکھ لیا تھا۔ دل دھڑکنے کی رفتار اتنی سست تھی کہ اسے اندازہ نہیں ہو رہا تھا دل ہے بھی یا دور جاتے ہوئے اس شخص کے پاس ہے۔

دبے قدموں کی آہٹ نے دھڑکنوں سے آہنگ بنا لیا تھا۔ اضطرابی حالت میں ادھر سے ادھر چکر کاٹتا ارسل جیسے ہی مڑا، پتھر کا ہو کر رہ گیا۔ پھولوں کے کنگن والی کلائیوں کے ہاتھ ایک دوسرے میں باہم پیوست تھے جنہیں وہ بے خیالی میں دبا رہی تھی۔ پلکیں جڑی ہوئی تھیں اور ماتھے پر موتیا کی لڑی میں پرویا گلاب۔ وہ یہ سب پہننے کے موڈ میں نہیں تھی لیکن انعم نے بہت اصرار کیا تھا اور پھر زارون نے سختی سے کہا تھا ارسل کے آنے تک وہ یہ جوڑا پہن کر پھولوں کے ساتھ تیار ہو جائے۔ اب اسے ان دونوں کی بات مان لینے پر خود پہ غصہ آ رہا تھا۔

ارسل عباس کے پاؤں گویا زمین نے جکڑ رکھے تھے۔ ایک نظر میں اس پر ہزار راز کھلے تھے۔ وہ کب اس سے کچھ پوچھنے آیا تھا؟ وہ تو یہ دیکھنے آیا تھا کہ مہتاب سی درخشاں خواہش سامنے ہو اور اپنی ہو تو کیسا لگتا ہے۔

ہوا کے نرم جھونکے نے خوشبو سے ساز باز کی اور اس کی سانسیں مہکا گیا۔ ایک گہری سانس بھرتا وہ اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ وہ درخت سے جھڑ جانے کے خوف سے لرزتے پیلے پتے کی طرح کانپ رہی تھی۔ اسے کچھ نہیں پوچھنا تھا۔ اس کی جھجک۔ شرمایا گھبرایا روپ اتنا دل نشین تھا کہ سارے اندیشے ہوا ہو گئے تھے۔ اب تو صرف وہ تھا ارسل۔ جو سراپا سوال تھا اور وہ تھی عزہ۔ جو سراپا جواب تھی۔ بڑی جان لیوا خاموشی تھی۔

"کچھ پوچھنے آیا تھا لیکن جو دیکھا ہے، اس کے بعد کسی سوال کی گنجائش ہی نہیں رہی۔ بتانے کو اتنا کچھ ہے لیکن اتنا وقت نہیں کہ سب یہاں کھڑے کھڑے بتا سکوں اور کہنے کو ہے تو تین لفظوں کا اسمِ اعظم..... جو دو دلوں کو خوشی کی معراج پر پہنچا دے اور....." تھوڑا جھک کر اس نے کمر سے نیچے جاتا دوپٹہ تھام لیا۔ "جو اس زرد پھول کو میرا گلاب بنا دے لیکن میں نہیں چاہتا کہ بہار موسموں کی شروعات پر میں خالی ہاتھ شہر دل کے دروازے کھولوں۔"

اس کا بھاری لو دیتا لہجہ اور ایسی باتیں۔ عزہ کی آنکھیں بے اختیار اٹھیں اور ان خمار آلود نظروں میں شوق دیکھ کر فوراً جھک گئیں۔

"تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں؟" وہ نظروں سے اس کے چہرے پر بکھرے قوس قزح کے رنگ چوم رہا تھا۔

"اپنی میز پر پڑے گلدان میں گلاب لگا دیے تھے۔" رکی رکی سانسوں نے جواب آیا تھا۔

"وہ تم رکھ کر آئی تھیں۔ کیا میں اسے پہلا تحفہ سمجھوں؟"

"پہلا تو نہیں....."

"پہلا تحفہ پھر کیا تھا؟" وہ دلچسپی سے اس کے

چہرے پر لکھی تحریر سطر سطر، لفظ لفظ پڑھ رہا تھا۔
''وہ شرٹ۔ جو میں واپس لے آئی ہوں۔'' وہ ہنسی تھی اور چاروں جانب جیسے خوشی کے طبل بجا دیے گئے تھے۔
''چھوڑو سارے حساب کتاب، شرٹ والا تمہارا اور پہننے والی میری۔ رہی بات گلدان کی تو وعدہ رہا کبھی پھولوں سے خالی نہیں ہونے دوں گا۔ اسے بھی ایسے ہی مہکتا رکھوں گا جیسے تمہارا وجود خوشیوں سے۔'' ذرا سی پیش قدمی سے فاصلے سمٹ گئے تھے۔ موجیے اور گلاب کی خوشبو میں ایک خوشبو ارسل کے کلون کی بھی مل گئی تھی۔ عزہ کے لیے خوشبوؤں میں امتیاز ناممکن ہو گیا تھا۔ کوئی لمحہ جاتا تھا کہ خوشبو کا حجاب بھی اٹھ جاتا۔ ارسل کے فون پر ہونے والی بیل نے ارتکاز توڑا تھا لیکن ماحول کا سارا فسوں ویسا ہی تھا۔ بے تال رقص کرتی دھڑکنیں سنبھالتی عزہ واپس چلی گئی۔
وہ بھی سیڑھیاں اتر کر نیچے چلا گیا۔
نیچے زارون پہریداری کر رہا تھا۔ سب عزہ کے گھر کے لیے نکلے تو اس نے ارسل کو فون کر دیا تھا۔
''یاررررر..... یہ احسان ہمیشہ یاد رکھوں گا۔''
''بھائی نہ سمجھ تو جو مرضی کر۔'' اس کے الفاظ میں اس نے اسی کی بات لوٹائی اور اس کے بعد دونوں ہی ہنس دیے۔
باہر ایک نظر ڈال کر وہ چپکے سے جا کر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ گہرے سانس لے کر روشنیوں سے خوشیاں جذب کرتے اس نے ہاتھ میں پکڑے فون پر انعم کا نمبر ڈائل کیا۔ عجلت بھری آواز سنائی دی۔
''اپنے بھائی کی مایوں پر آئی ہوں نہ خود بات کر سکتی ہوں اور نہ دلہن سے کروا سکتی ہوں۔ سوری۔'' شرارت کا عنصر واضح تھا۔ وہ مسکرایا۔
''اپنی بہن کو اپنی شادی کی شاپنگ کروانی تھی۔ سوری آپ کا وقت ضائع کیا۔''
''بھائی۔'' حسب توقع وہ چلائی۔
''باہر گاڑی میں بیٹھا ہوں۔''
''پانچ منٹ میں آئی۔'' اس نے تیزی سے بات کاٹی۔
''دو منٹ۔ دو منٹ میں آؤ۔'' وہ جانتا تھا پہلے میسر آنے والے شخص کو بتا کر وہ بھاگتی ہوئی آئے گی اور ہوا بھی یہی۔ اس کے آنے تک وہ دو فون اور بھی کر چکا تھا۔
پھولی سانس کے ساتھ وہ اس کے ساتھ آ بیٹھی۔ سیکنڈوں کے فرق سے افق اور زارون بھی آ گئے تھے۔
''تھوڑا پہلے نہیں بتا سکتے تھے؟'' افق پوچھ رہا تھا۔ فون پر تو اس نے کچھ سنا ہی نہیں تھا۔
''میرا اپنا ذہن ابھی ابھی بنا ہے۔'' گاڑی موڑتے ہوئے اس نے بیک ویو مرر سے افق کو دیکھتے آنکھ دبائی۔
''تو کیا جادو کے زور سے ایک لمحے میں یہاں حاضر ہوئے ہو؟''
''تو تم اب بھی نہیں چاہتے، میں اپنی شادی کی شاپنگ کروں؟''
''مجھے تو لگا تھا بارات کی صبح تمہارا کوئی ایسا فون آئے گا کہ میں نے تو کچھ بنوایا ہی نہیں، کون سے کپڑے پہن کر آؤں۔'' افق کی بات پر وہ سب ہی ہنسنے لگے تھے۔
''ابھی تو بیٹا! تم لوگوں سے بہت سے کام لینے ہیں۔ ارسل عباس کی شادی ہے۔ اسے ایسا ہونا ہے کہ دنیا مدتوں یاد رکھے۔''
وہ جانتا تھا تیاریوں میں کوئی کمی نہیں چھوڑی گئی ہوگی۔ اس کے باوجود اسے بہت کچھ نئے سرے سے ارینج کروانا تھا جو ان دونوں کی مدد کے بغیر اتنے کم وقت میں ممکن نہیں تھا۔
''غلط..... یہ ارسل عباس کی لو میرج ہے اور اسے ایسا ہونا ہے کہ عزہ فاروق ہمیشہ یاد رکھے۔'' زارون کی بات پر وہ جھینپ گیا تو سب ہنس پڑے تھے۔
خوشیوں کی ڈگر پر زندگی کی گاڑی ایک اسپیڈ بریکر کے بعد پھر سے رواں دواں ہو گئی تھی اور اب کی بار اس سفر میں چاند اس کا ہمسفر تھا۔

☆